8

نجم الثّاقب

یہاں سے آگے

ناول

نجم الثاقب

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

891.4393 Najm us Saqib
Yahaan Say A'gay/ Najm us Saqib.-
Lahore : Sang-e-Meel Publications,
2011.
256pp.
1. Urdu Literature - Novel.
I. Title.

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ سنگ میل پبلی کیشنز/ مصنف سے با قاعدہ
تحریری اجازت کے بغیر کہیں بھی شائع نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اس قسم کی
کوئی بھی صورتحال ظہور پذیر ہوتی ہے تو قانونی کارروائی کا حق محفوظ ہے۔

2011
نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN-10: 969-35-2402-0
ISBN-13: 978-969-35-2402-4

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 92-423-722-0100 / 92-423-722-8143 Fax: 92-423-724-5101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ ''کتب خانہ'' میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

وسیم بٹ وسیم

کے نام

CamScanner

اُس نے آنکھیں کیا بند کیں۔

ایسے لگا سارا گاؤں چل بسا۔!

اس عمر میں ہزاروں لوگ مرے ہوں گے۔ یہاں تو دوائی اور دودھ نہ ہونے کے باعث۔ بچے لڑکپن نہیں دیکھ سکتے۔ اور پھر۔ نوعمری میں کئی نوجوان مر جاتے ہیں۔ کبھی حادثہ۔ کبھی لڑائی۔ کبھی کوئی انجانی بیماری۔ کبھی خودکشی۔ اور لوگ اللہ کی رضا سمجھ کر صبر شکر کر لیتے ہیں۔ لیکن گاؤں میں یہ موت انوکھی تھی۔ لگ بھگ پچاس سال کی عمر۔ اور اچانک موت۔ دل کی حرکت بند۔ آنکھیں کھلی۔ کھلے آسمان کی طرف دیکھتی۔ کچھ تلاش کرتیں۔! اُس کی زندگی کی طرح۔ اُسکی موت پر بھی کئی آراء تھیں۔ دو باتوں پر بہر حال سب کا اتفاق تھا۔ پہلی یہ کہ اُسکے جنازے پر جتنے لوگ قبرستان گئے۔ گاؤں کی تاریخ میں اتنے لوگ۔ اتنی بڑی تعداد میں۔ کسی بھی واقعہ پر۔ ایک جگہ۔ اکٹھے نہ ہوئے تھے۔ دوسری بات یہ کہ اُس کا اِس گاؤں سے پیدائش کی وجہ سے یا بزرگوں کے سبب۔ کوئی رشتہ نہ تھا۔ وہ ایک دن بقول ماسی حاجراں کے 'لوڑے ویلے' گاؤں کے ٹیوب ویل پر۔ اپنے 'بغچے' کے ساتھ بیٹھا۔ نظر آیا تھا۔ اور پھر اُس نے فضل قینچی والے کا کمرہ 'منہ مانگی رقم' دے کر خرید لیا تھا۔

'ریسرچ ہونی چاہیئے'۔ سلمان۔ جو اُس گاؤں میں۔ واحد بی۔ اے پاس تھا۔ افسوس اور اعتماد کی ملی جلی کیفیت لئے بولا۔

'کیا ہونی چاہیئے'؟ بابے مشتاق کو کچھ سمجھ نہ آیا تھا۔

'پتہ لگانا چاہیئے'۔ بابا۔ کہ باؤ کی موت کیسے واقع ہوئی۔ وہ کون تھا۔ کہاں سے آ کر۔ یہاں رہنے لگا۔ اتنے سال۔ اور گاؤں والے کچھ نہیں جانتے اُس کا باپ۔ کوئی ماں۔ بھائی

بہن۔اتہ پتہ۔رشتہ دار۔دشمن داریاں وغیرہ۔سلمان نے چنوں والے چاول کی دیگ پر کھڑے شامے تیلی کو اپنی طرف اشارے سے بلاتے ہوئے کہا۔

'مگر باؤ سلمان۔یہ سرچ کرے گا کون۔؟ کیسے کوئی سرا ملے گا۔یہاں تو کوئی اُس کے بارے کچھ بھی نہیں جانتا۔اتنے سال اُس سے نہ کوئی ملنے آیا۔اور نہ وہ کسی سے ملنے گیا۔وہ اتنا گھل مل گیا تھا کہ کسی نے اُس سے کبھی اُسکا نام بھی نہ پوچھا۔صرف۔باؤ۔ہی کہتے رہتے۔ویسے جو کچھ بھی تم نے کرنا ہے۔تیسرے کے بعد شروع کرنا۔قُل تو ہو نے دو اس فرشتے کے'۔حاجی تصدق حسین نے جیب سے بہت سارے نوٹ نکال کر سامنے پھیلے خاکی رنگ کے کپڑے پر آہستگی سے رکھتے ہوئے کہا۔

شام کے سائے گہرے ہونے شروع ہو گئے تھے۔فضا میں ایک عجیب سا سوگ تھا۔یہ باؤ کی موت تھی یا موسم ہی ایسا تھا۔درختوں پر ہوا جیسے رک سی گئی تھی۔

'اجازت ہووے تو کھانا کھول دیا جائے چوہدری صاحب' لگ بھگ سو مردوں کی اُس بیٹھک میں یہ آواز سُو بے نائی کی تھی۔

چوہدری مراد بخش نے دونوں ہاتھ اوپر کر کے اپنی بڑی سی پگڑی اتاری۔صافے سے اپنا منہ صاف کیا۔سامنے بیٹھے اپنے ملازم کو ہاتھ دھلوانے کا اشارہ کیا۔ایک لمبا سا سانس لے کر۔اپنی آواز میں دکھ کی ہلکی سی آمیزش پیدا کی۔ایک مخصوص جنبش کے ساتھ۔کُھسے میں پھنسے اپنے پاؤں نکالے اور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا' ہاہ۔آہ۔باؤ۔وے۔کھول دو کھانا بھئی۔کھول دو۔میرے اندر تو یہ کھانا نہ جا سکے گا'۔

شفیقے قصائی کو دورہ پڑ گیا تھا۔تھوڑی تھوڑی دیر بعد ذرا سا ہوش آتا اور پھر ایک نئے انداز کی دلدوز چیخ مار کر زمین پر لیٹ جاتا۔سب جانتے تھے کہ باؤ کی شفیقے کے ساتھ بڑی دوستی تھی۔ بقول شفیقے کے۔"باؤ نے مجھے جانور ٹھیک طرح سے ذبح کرنا سکھایا۔پُٹھ اور ران کی بوٹیاں کیسے بنائی جاتی ہیں۔گردن کا گوشت دوسری بوٹیوں میں مکس نہیں کرنا چاہیئے۔ٹوکے کی ہر چوٹ سے پہلے اپنی موت کو یاد کر لینا چاہیئے۔پہلا ٹوکا یا پہلی چھری سے پہلے جانور کو پیٹ بھر کے کھانا اور پیٹ بھر کے پانی پلانا ضروری ہے۔درد کم ہوتا ہے"۔یہ سب باتیں اُسے باؤ نے سکھائی تھیں۔

شکھاں رنگ والی دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔'وے بچہ۔سارے رنگ ہی پھیکے کر

گئے ہوں۔ اُسے وہ سات گز کا لٹھہ یاد آیا جو اُس نے اپنے کفن کے لئے سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ وہی لٹھہ۔ جس میں اُسکا 'بیٹوں جیسا' باؤ لپٹا ہوا تھا۔ وہی باؤ جس نے اُسکی دو بیٹیوں کے 'جن نکالے' تھے۔ اور وہ بھی سب کے سامنے۔ ورنہ شکور سائیں اِلّاں والے کا تو اصرار ہی یہ تھا کہ جن نکال دوں گا لیکن لڑکی کو کچھ دیر میرے ساتھ کمرے میں اکیلے چھوڑ دیا جائے۔ جن بپھرا ہوا ہے۔ ناراض ہو گیا تو گاؤں کی ہر لڑکی پر چڑھ جائے گا!

ماسٹر پیراں وسائے کو الگ چُپ سی لگی تھی۔ اُسے باؤ کیسے بھول سکتا تھا۔ اُس نے تو ماسٹر کو اسلامیات اور اسلام میں فرق بتایا تھا۔ ورنہ پورا گاؤں اسلام کا مطلب۔ اسلامیات کی کتاب میں ہی ڈھونڈتا تھا۔ 'اردو۔ عربی زبان کا لفظ نہیں ہے' 'بارات نہیں۔ صحیح لفظ برات ہے'۔ 'آذان نہیں۔ اذان' پانچ نمازوں کا پنجاب یا پنجاب کے پانچ دریاؤں سے کوئی تعلق نہیں' 'انگریزی میں بھی قرآن پاک پڑھا جا سکتا ہے۔' حکومت اور ریاست دو علیحدہ علیحدہ تصورات ہیں۔ ریاست۔ حکومت سے ہمیشہ افضل اور اہم ہونی چاہیئے۔' اخبار میں چھپ جانے کا یہ مطلب نہیں کہ خبر سچی ہے'۔ یہ اور اِس طرح کی بہت سی' کام کی باتیں' ماسٹر نے باؤ سے ہی سیکھی تھیں۔

چھ سال سے شادی نہ کرنے کی رٹ لگانے والی تسکین اپنا دوپٹہ منہ میں 'گرولا' سا بنا کر اپنے کمرے میں۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے۔ دیوار پر چسپاں وہ غزل دیکھ رہی تھی۔ جو اُس نے اخبار سے کاٹ کر۔ باؤ کو اپنے دل کا حال سنانے کے لیئے چند دن قبل ہی چپکائی تھی۔ برسوں۔ مہینوں۔ سنتا رہا۔ وہ پوچھتی ہی رہی۔ اور اکثر کوئی بھی سیدھا جواب نہ پا کر کسی خاموشی کو ان کہی 'ہاں' سمجھتی رہی۔ مرنے سے چار دن پہلے بھی اُس نے پوچھا 'کم از کم یہ تو بتا دو باؤ۔ تمہاری شادی ہوئی کہ نہیں۔ اور باؤ نے ہمیشہ کی طرح۔ رشید اچھا لڑکا ہے۔ اُس سے شادی کی ہاں کر دو۔ کہہ کر ٹال دیا تھا۔

گاؤں کے واحد دودھ پتی والے چائے کے کھوکھے پر مختلف عمروں کے لوگ۔ موڑھوں اور چار پائی پر بیٹھے تھے۔ باؤ۔ جمعرات کی مغرب پڑھ کر یا اتوار کو دوپہر کے وقت۔ لیکن اب وہ یہاں کبھی نہ آئے گا۔

'یہ ہو کیا گیا ہے'۔ اُن میں سے ایک نے اپنے سامنے پڑی چائے کی پیالی بیزاری سے

CS CamScanner

ہٹاتے ہوئے کہا۔

'مجھے تو یوں لگ رہا ہے۔ اس گاؤں پر اب کوئی عذاب اترنے والا ہے۔ خدا کی پناہ۔ پرسوں اتوار کو۔ یہیں بیٹھ کر باؤ نے حضرت بایزید بسطامی کا رمضان والا قصہ سنایا تھا۔ اور میں خواہ مخواہ بحث میں پڑ گیا۔ کہ یہ ممکن نہیں ہے۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ لیکن۔ یہ بھی تو نہیں سوچا تھا' دوسرے نے تاسف بھرے لہجے میں آہ بھری۔

'سفارش نہ کرتا تو میری نظم بھلا اخبار میں چھپنی تھی۔؟ کیا انسان تھا۔ اُس نے خط ہی ایسا لکھ کر دیا تھا۔ اخبار والا کہتا تھا۔ نظم تو خیر ٹھیک ہے۔ کہو تو یہ خط چھاپ دوں' تیسرا بولا۔ چوتھی اور پانچویں کُرسی پر بیٹھے ہوئے دونو جوان۔ بالکل چپ تھے۔ وہ شائد بیان نہیں کر سکتے تھے کہ باؤ کی اچانک موت کا آگے چل کر مستقبل میں اُنکی زندگیوں پر کیا اثر پڑے گا۔' اسی چارپائی پر باؤ بیٹھتا تھا۔ اُسکی چائے میں دو چمچے چینی۔ مَیں ہی ڈالتا تھا۔ اتنا میٹھا آدمی۔ اور اتنی چینی پیتا تھا۔ مَیں اب گاؤں نہیں رہتا۔ میں تو شہر جاؤں گا۔ اس گاؤں میں ویسے بھی۔ پوری بجلی جب سے آئی ہے۔ ایک عجیب بے چینی آ گئی ہے۔'' یہ آواز چھٹے کی تھی۔

گاؤں کی پتلی پتلی گلیوں میں بُورا فقیر فلک شگاف قہقہے لگاتا پھر رہا تھا' مار دیا۔ مارتے نہیں تو اور کیا کرتے۔ مَیں تو باؤ سوہنے کو کہتا تھا۔ جگر جانی۔ تو جہاں سے آیا ہے۔ واپس چلا جا۔ یہ پنڈ والے ایک دن تمہیں جانوں مار دیں گے۔ اوئے ظالما۔ تیری کوئی ایک برائی بھی تو ہونی چاہیئے تھی۔ مَیں نے باری باری کہا۔ نیکی اور سچائی سب ٹھیک ہے۔ لیکن کوئی شخص جب لوگوں کی پکڑائی میں نہیں آتا۔ تو پنڈ ال پریشان ہو جاتا ہے۔ فیر پریشانی ہلکان کر دیتی ہے تو سازش ہوتی ہے۔ اوئے سوہنیا۔ تیئوں نظر نئیں۔ نظراں لگ گیاں'۔

اپنی بھینس کو چارہ ڈالتے ہوئے بالے گجر کو ایک عرصے کے بعد کوئی پریشانی لاحق ہوئی تھی۔ گاؤں میں باؤ کی موت اور اتنے بڑے جنازے کی خبر سُن کر اُسے افسوس ہو رہا تھا کہ وہ باؤ سے ہر وقت کیوں لڑتا رہتا تھا۔ ٹھیک ہے رشید اُسکا دوست تھا۔ جو تسکین سے شادی کرنا چاہتا تھا اور باؤ۔ بالے کی نظر میں۔ واحد روڑا تھا۔ لیکن باؤ نے بالے کے ساتھ کبھی اونچی آواز میں بات بھی نہ کی تھی۔ بالے کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اُس نے چپکے سے اپنی بالوں بھری مضبوط کلائی سے آنسو اِدھر اُدھر کئے اور سامنے پڑی پرالی میں نجانے کیا تلاش کرنے لگا۔

CS CamScanner

رشید خوش تھا۔ اِس پورے گاؤں میں ۔ باؤ کی موت پر کوئی خوش بھی تھا۔ دل ہی دل میں تسکین کی ہاں سن کر اپنی ماں کے سر پر تیل کی مالش کر رہا تھا۔ جنازے میں بہر حال وہ گیا تھا۔ 'لوگ کیا کہیں گے'۔ 'تسکین کیا سوچے گی'۔ باؤ سے رشید کو ایک ان کہا گلہ تھا۔ اتنے برسوں سے۔ تسکین کی 'نہ' کی رشید کے پاس۔ کوئی اور وجہ نہ تھی۔ اُس نے ماں کو اونگھتے ہوئے دیکھا تو موقع مناسب سمجھتے ہوئے بولا 'ماں۔ تسکین اب مان جائے گی ناں'

اونگھتی ہوئی ماں نے اچانک اپنی آنکھیں چوپٹ کھولیں اور غصّے سے کہا 'دشمن مرے تے خوشی نہ کریئے۔ سجناں وی مرجاناں'۔ اور رشید کی مالش میں گرمجوشی اچانک کمزور پڑ گئی۔

شفیق دھوبی کے گھر کے آگے رسی پر سُکھائے جانے والے کپڑے ہوا نہ ہونے کے باعث منہ لٹکائے پانی ٹپکا رہے تھے۔ کوڈو اپنی شطرنج کی بساط بچھائے دونوں طرف سے خود ہی چالیں چل رہا تھا۔ آج مات خود کو ہی ہونی تھی۔ ویسے باؤ کوڈو کو کبھی کبھی جیتنے بھی دیتا تھا۔ اُس کا کہنا تھا کہ کھیل میں جیتنا اہم ہے۔ لیکن دوسرے کی ہمت بندھی رہے یہ بھی ضروری ہے۔ جیدے نائی کو آج یاد نہ رہا کہ چھ شیویں کرنے کے بعد اُسے بلیڈ بدلنا ہوتا ہے۔ اُسے حمام کے اندر سے 'صاف تولیہ' مانگتی آواز بھی کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔

اور گلی میں کوکلا چھپاکی کھیلتی ۔ چھوٹی عمر کی لڑکیاں ۔ نہیں جانتی تھیں کہ جوانی آنے پر۔ اُن کے ماں باپ سے۔ بغیر پیسے لئے۔ سب کے سامنے۔ اُن کا جن نکالنے والا۔ اب اِس دنیا میں نہیں رہا تھا۔!

'بتی نہ کھولنا'۔ اندھیرے میں یہ آواز سلمان کی تھی۔ جس نے معلوم نہیں کیسے باؤ کے کمرے کا تالا کھول لیا تھا۔

'اور اگر کسی نے ہمیں اِس طرح دیکھ لیا تو'۔ یہ تسکین تھی۔

کھنک کی ایک ہلکی سی آواز کے ساتھ کمرہ جگمگا اٹھا۔ سامنے رکھے ایک بڑے سے آئینے میں ۔ سلمان اور تسکین ۔ دونوں نے اپنی اپنی حیرانی ۔ پشیمانی ۔ چھپانے کی کوشش کی ۔ لیکن ماحول کی اجنبیت ۔ کمرے کا سکوت ۔ رات کا وقت ۔ ایک ابھی ابھی مرے ہوئے شخص کی چیزیں ۔ اور پھر دونوں کا چوروں کی طرح اِس کمرے میں 'اکیلے' ہونا۔ یہ سب کچھ ایک طرف تھا۔ اور دوسری طرف ۔ باؤ کے بارے میں معلومات حاصل کر لینے کی خواہش اور ایک انجانے احساس نے

CS CamScanner

دونوں کو کچھ دیر کے لئے آئینے کے سامنے عکس کر دیا۔ دونوں آئینے اور آئینے کے باہر بکھرے ماحول کو نیم خوابیدہ آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

کونے میں پڑا۔ درمیانے سائز کا ایک سوٹ کیس۔ ایک طرف ایک میز اور کرسی۔ میز پر بہت سے کاغذ۔ پنسلیں۔ قلم۔ دوسرے کونے میں بے ترتیب پڑے کچھ مردانہ کپڑے۔ دو ایک پالش کئے ہوئے جوتوں کے جوڑے۔ کرسی پر پھیلایا گیا سفید رنگ کا ایک بڑے سائز کا تولیہ۔ ایک تپائی پر رکھا چھوٹا ٹی وی۔ تپائی کے نیچے رکھی ایک شیشے کی بڑی ایش ٹرے۔ جس میں بے شمار سگریٹ بجھائے گئے تھے۔ کمرے میں اس کے علاوہ چاروں طرف پھیلی۔ ہر سائز کی۔ جلد کے ساتھ اور جلد کے بغیر۔ کتابیں تھیں۔ بے شمار کتابیں۔ ڈھیریوں کی شکل میں اُدھ کھلی۔ الٹی سیدھی پڑی۔ کتابیں۔! سلمان نے اپنے کالج کی لائبریری کے علاوہ اتنی زیادہ کتابیں۔ ایک ساتھ۔ زندگی میں اور کہیں نہیں دیکھی تھیں۔ میز پر پڑا لیپ ٹاپ نہائت صفائی سے بند کیا گیا تھا۔!

'یہ کیتلی اُسے مَیں نے دی تھی'۔ تسکین نے چائے کی کیتلی کا ہینڈل اپنے دوپٹے سے صاف کرتے ہوئے کہا۔

'تم یہاں کیتلی صاف کرنے آئی ہو'۔ سلمان نے کمرے کے واحد سوٹ کیس کے پاس کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا۔

سوٹ کیس تو جیسے عمرو عیار کی زنبیل تھا۔ رسالے۔ ایک پرانا رومال۔ ناکے سے ٹوٹی ایک بانسری۔ ہرے رنگ کی ایک پرانی شال۔ دیَن گوگ کی سوانح عمری۔ سلواڈور دالی کی پینٹنگز۔ کیمرے سے کھینچی تصویروں میں۔ نہج البلاغہ۔ کچھ آڈیو کیسٹس۔ شیشے کی قید میں ایک بہت رنگین۔ بڑی سی تتلی۔ ایک لفافے میں پاسپورٹ۔ باؤ کے بہت سے کریڈٹ کارڈز۔ ایک لاکٹ جس کے اندر کسی بزرگ خاتون کی تصویر لگی تھی۔ قرآن پاک۔ جس میں سورۃ الحجرات کے صفحے پر چپکا سفید کاغذ کا ایک ٹکڑا۔ ایک چھوٹے سائز کی پینٹنگ۔ جس میں کچھ پرندے۔ ایک پنجرہ۔ اور پینٹنگ کے نیچے 'S' کے ساتھ شائد 'W' لکھا ہوا تھا۔

'یہ مائی۔ لان۔ کن۔ ڈیرا کیسا نام ہے'۔ تسکین نے کتابوں کے بیچ سے نکالی ایک کتاب کے ٹائیٹل پر نظریں جمائے پوچھا۔

میلان کنڈیرا۔ یہ چیکوسلواکیہ کا ایک لکھاری تھا۔ سلمان نے سوٹ کیس میں پڑے

CamScanner

خطوط کے ایک بنڈل اور ایک موٹی سی ڈائری اٹھاتے ہوئے تسکین سے کہا۔

'چلو۔ اب چلتے ہیں'۔

باہر نکل کے دونوں نے کمرے کے دونوں پٹ احتیاط سے بند کئے۔ تالے کو۔ ٹوٹی ہوئی حالت میں ہی چٹخنی کے ساتھ لٹکا کر وہ دونوں گہرے ہوتے اندھیرے میں واپس اپنے اپنے گھروں کی طرف چل پڑے۔

ஐஐஐ

◎

شیشے کے فریم میں سُرخ رنگ سے لکھا "Live for others" دالان سے آئی ہوا کے ایک تیز جھونکے سے زمین پر بکھر گیا۔ شیشے کے چھوٹے بڑے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں میں کچھ دیر کے لئے "Live"اور "for others" الگ الگ نظر آئے۔ بالکل ایسے ہی جیسے بیٹھک میں شرف الدین صدیقی اور اُن کی بیوی مریم علی راجپوت۔ دو الگ الگ چار پائیوں پر سوتے تھے۔ سدرہ نے شیشہ ٹوٹنے کی آواز سُنی تو دوڑتے ہوئے اپنے کمرے سے باہر آئی۔ کرچیوں کو اپنے ہاتھوں سے چُنتے ہوئے اُسے ماں کا خیال آیا۔'ابھی واپس آئیں گی تو اپنے ہاتھ سے لگائے اس فریم کو ٹوٹا دیکھ کر کتنی آزردہ ہوں گی'۔ اور پھر'اُن کے اِس عزیز فریم کے ٹوٹنے کی وجہ کیا بتاؤں گی' ایک نقطہ برابر خون کا قطرہ سدرہ کے دائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی پر ابھرا۔

سدرہ طلحہ سے ایک سال بڑی تھی۔ طلحہ سے چھوٹا حمزہ۔ ہندوستان میں جنگ آزادی کے پورے ایک سو سال بعد پیدا ہوا تھا۔ شرف الدین صدیقی۔ سرکاری افسر تھے۔ دہلی سے 1947 کے فسادات کے دوران مسافروں سے لدی ایک ریل گاڑی میں اپنی کتابوں کے ساتھ سیالکوٹ آئے۔ ایم اے ریاضی انہوں نے پاکستان آکر مکمل کیا۔ بعد میں معاشیات میں پی ایچ ڈی کی۔ گھر میں دیانتداری کے چولہے پر'سچائی' کی ہنڈیا بنتی تھی۔ مشکل سے گذارا ہوتا تھا۔

چار کمروں کے اُس کرائے کے مکان میں خوشحالی اور بھوک۔ دونوں نہیں تھے۔ لفظوں اور اُن کے معانی پر گفتگو ہوتی۔ بڑے بڑے تاریخ دان۔ شاعر۔ ادیب۔ فلسفی اور سائنسدان دوران گفتگو کھانے کی میز پر موجود ہوتے۔ ماں اِس گفتگو میں زیادہ دیر شامل نہ رہ سکتی۔ اُسے گھر کی صفائی' کھانا پکانے' وقت بے وقت چائے بنانے۔ کام کرنے والی ماسی کو کپڑے صاف کرنے کی ترکیبات بتانے اور پھر بچوں کو پڑھائی میں مدد دینے سے فرصت کم ہی ملتی تھی۔ وراثت علی راجپوت۔ پی ایچ ڈی کی بیٹی۔ مریم علی راجپوت جس نے انگریزی ایم اے میں پہلی پوزیشن لی

تھی۔ اُن دنوں بھنڈی گوشت اور آلو قیمہ بنانے کے ساتھ ساتھ۔ تین بچوں کو سکول کا سارا کام کرواتیں۔ یہ سیالکوٹ کا ایک نہایت علمی گھرانا تھا۔ جہاں غلط لفظ استعمال کرنے یا تلفظ کی ذراسی غلطی پر سنجیدگی سے سرزنش کی جاتی۔ جہاں بیت بازی تفریح کا سامان مہیا کرنے والا کوئی کھلونا سمجھا جاتا۔ کس نے کونسی کتاب پڑھی۔ رات کے کھانے پر فنی محاسن کے جلو میں تفصیلی جائزہ پیش کیا جاتا۔ سچائی۔ دیانت داری۔ آپس میں محبت۔ دوسروں کے لئے جنو۔ اور اسی طرح کے اقوال زریں سارے میں گردش کرتے۔ ارفع خیالات کے انبوہ میں سُست روی سے آگے بڑھتا ہوا یہ گھرانا کسی قسم کی علت، جھوٹ اور مکاری سے عاری تھا۔ زندگی گذارنے کے معیار سخت تھے۔ اور بتائے گئے اصولوں پر سختی سے عمل درآمد کرایا جاتا تھا۔

ابا جی امتحان کا نتیجہ سُنتے ہوئے پاس اور فیل ہونے کا کبھی نہ پوچھتے تھے۔ پاس تو خیر ہونا ہی ہوتا تھا۔ ہمیشہ پوچھتے 'پوزیشن کیا آئی ہے'۔ ابا جی اور ماں۔ اعلیٰ تعلیم سے مزین۔ تعلیم یافتہ گھرانوں سے تعلق۔ سیالکوٹ میں اتنا پڑھا لکھا parenthood وہاں رہنے والوں کے لئے بذاتِ خود ایک عجوبہ تھا۔ اور کیوں نہ ہوتا؟ ہمسائے میں ایک درزی تھا۔ پانچ جماعتیں پاس۔ جس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش اُس دن پوری ہوگئی جب دوبئی جانے کا ویزا اُس کے گھر آیا۔ دائیں طرف ہمسائے میں سکینہ ماسی اپنے چار بچوں اور بوڑھی ماں کے ساتھ رہتی تھی۔ خاوند کے اچانک مرنے کے بعد سکینہ نے ایک سکول میں نوکرانی بن کر اپنے چاروں بچوں کو خراد یا۔ بڑھئی۔ نائی اور دودھ والا بنایا۔ محلے میں کوئی کمہار تھا۔ تو کوئی نان بائی۔ کسی کی کریانے کی دکان تھی اور کوئی دہاڑی پر مزدور۔! محلے کی سب سے بڑی 'حویلی' البتہ ایک ڈاکٹر کی تھی۔ جو مرنے سے پہلے اپنے سارے سرمائے سے دس کمروں کی اُس حویلی کو بنوا کر۔ ایک بیوہ اور دو بیٹے چھوڑ گیا تھا۔

'یہ تمہاری انگلی پر پٹی کیسی۔؟ کیا ہوا بیٹا' ماں نے گھر میں داخل ہو کر جلدی جلدی برقع اتارتے ہوئے سدرہ سے پوچھا۔

'ماں۔ وہ۔' سدرہ نے صحن میں پیلی سفیدی والی دیوار پر اُس خالی جگہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جہاں دوسروں کے لئے زندہ رہنے والے اب نظر نہیں آ رہے تھے۔!

'ٹوٹ گیا' ماں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

'ہوا سے ماں۔ خود بخود۔!' سدرہ کو اچھی طرح خبر تھی کہ ماں کو وہ فریم بہت عزیز تھا۔

CamScanner

'کوئی بات نہیں بیٹا۔ ہم نیا فریم بنالیں گے۔ خیری سلا۔ چلو آؤ مرے ساتھ۔ سبزی کاٹ دو۔ ماں نے باورچی خانے کی طرف جاتے ہوئے سدرہ کا ہاتھ پکڑلیا۔

'مگر ماں۔ وہ نقصان۔۔۔۔۔' سدرہ کو ماں کا فریم ٹوٹنے پر ردِعمل سمجھ نہ آیا۔

'نقصان وہ ہوتا ہے جو پورا نہ کیا جاسکے'۔ ماں نے گھر میں چاروں طرف گردش کرتے ہوئے اقوالِ زریں میں ایک اور اضافہ کیا اور رات کے کھانے پر اباجی کیا کھانا پسند کریں گے۔ سوچتی ہوئی۔ چولہا جلانے لگی۔

'طلحہ۔ تم ابھی تک سوئے نہیں۔ اور یہ ڈائریاں لکھنا ذرا کم کرو۔ اِس سال تمہارا دسویں جماعت کا امتحان ہے۔ سدرہ سے زیادہ نمبر لینے ہیں تم نے۔۔۔۔۔' ماں نے سوئے ہوئے حمزہ پر چادر ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

'اچھا ماں' ۔ اور طلحہ نے ڈائری پر اُس دن کی تاریخ لکھی۔ اپنے کالے فونٹین پن کو ایک طرف رکھا۔ اور بتی بجھا کر سونے کی تیاری شروع کی۔ ہمسائے میں دوبئی سے ہیر ڈرائر آچکا تھا۔ اور شرف الدین صدیقی کے گھر میں بال پوائنٹ استعمال کرنے پر ممانعت تھی۔ ذہن میں ابھرتے ہوئے چند 'مشکل سوال' اِس سے پہلے کہ طلحہ کی نیند میں حائل ہوتے۔ اُس نے تکیے میں اپنا سر دبکایا اور آنکھیں بند کرلیں۔!

ﷲﷲﷲ

◎
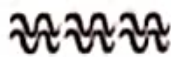
محلہ دوگلیوں کے شمال اور جنوب میں جا کر۔ مین روڈ سے ملتا تھا۔ شمال کی طرف سے گھر سے نکلیں تو سڑک شروع ہوتے ہی سامنے سنہری مسجد تھی۔ جس کے ساتھ ایک راستہ اوپر شوالے کو جاتا تھا۔ شوالے کے ساتھ کھلے میدان میں گلی کے لڑکے کرکٹ کھیلتے تھے۔ جنوب کی طرف سڑک کے شروع میں ایک مٹھائی والے کی دکان تھی جس سے کچھ دکانیں چھوڑ کر سیدھے ہاتھ ایک سڑک مڑتی تھی۔ جہاں بے نام کے دو سکول تھے۔ ایک 'لوہے والا' اور دوسرا 'لکڑ والا'۔ حمزہ اور طلحہ لکڑ والے سکول میں پانچویں جماعت تک پڑھے۔ جہاں سے دونوں نے گورنمنٹ پائلٹ سیکنڈری سکول۔ جو کالے پارک کے ساتھ۔ مرے کالج کی بغل میں تھا۔ داخلہ لیا تھا۔

محلے کے دوسرے گھروں کی طرح اس گھر میں ہنگامہ ہوا نہ کبھی لڑائی جھگڑا اور تو اور اونچی آواز میں گفتگو کرنے پر بھی پابندی تھی۔ سب گھر والے ایک خاص مکینکی انداز کی زندگی گذار رہے تھے۔ اباجی فجر کی نماز پڑھنے کے بعد سوئے ہوئے بچوں کے پاس سے گذرتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں کھانستے۔ زبردستی نہ اٹھاتے کہ نماز پڑھو۔ لیکن اُن کی خواہش ہوتی کہ بچے فجر کی نماز کے ساتھ دن کا آغاز کریں۔ دوسری طرف ماں سلام پھیر کر بچوں پر پڑی رضائیاں درست طریقے سے رکھتیں کہ پاؤں کے ذریعے سردی نہ لگ جائے۔ پھر بچوں کے کپڑے استری کرتیں اباجی کو ناشتے سے پہلے دو کپ چائے پلانے کے بعد۔ ایک ایک بچے کو پیار سے اٹھاتیں۔ چائے۔ پراٹھے اور سالن کا ناشتہ کراتے ہوئے۔ ماں کو ہر بچے کا خیال رہتا۔ امتحان پر جاتے ہوئے خاص ہدایات دینا۔ تسلی دینا۔ دعائیں پڑھتے ہوئے رخصت کرتے ہوئے کہنا 'اللہ مالک ہے۔ تم نے تیاری کی ہے۔ فکر نہ کرنا۔ میں تمہارے لئے دعا کروں گی"۔ کمرۂ امتحان میں پہلے سوال کا جواب لکھتے ہوئے جب بچوں کو یہ خیال آتا کہ اسی لمحے۔ جائے نماز پر بیٹھی ماں۔ دعا گو ہے تو ایک خاص قسم کا اطمینان کہیں سے ملتا۔ سوال آسان ہو جاتے۔ جواب آسان ہو جاتے۔

CS CamScanner

انگلیوں میں خون بچوں کا لیکن روح ماں کی ہوتی۔

محبت کا یہ عالم تھا کہ تینوں یہی سمجھتے تھے کہ ماں کو صرف اُسی سے زیادہ محبت ہے۔ ہر بچے کو وہ احساس دلاتیں کہ اُسی سے اُن کو زیادہ محبت ہے۔ کھانا کھلاتے ہوئے 'تم کھاؤ۔ میرے کام آئے گا' اُن کا ایک خاص جملہ تھا۔

ابا جی علمی بحث اور لفظوں کی صحت پر زیادہ توجہ دیتے۔ تربیت کے سب مراحل میں بچوں کو اُن کا ذہنی ساتھ حاصل تھا۔ اتفاق میں برکت ہے۔ اُن کا موٹو تھا۔ محلے میں بزرگوں سے کیسے بات کرنی ہے۔ استاد کی عزت۔ ماں باپ کی عزت۔ دوسروں کا خیال کرنا لیکن اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ خصوصی برتاؤ کرنا۔ ابا جی کا فلسفہ تھا کہ ایک بھائی کی کسی سے لڑائی ہو تو دوسرے بھائی کو۔ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ کون غلطی پر ہے۔ اپنے بھائی کا خیال کرتے ہوئے اُس کا ساتھ دینا چاہیئے۔ اور اگر لڑائی آپ پر ٹھونس دی جائے تو نتیجہ کی پروا کئے بغیر۔ پوری قوت سے جواب دینا چاہیئے۔

سدرہ 'چھوٹی ماں' تھی۔ ماں کے ادھورے چھوڑے ہوئے سارے کام اُسے پورے کرنے ہوتے۔ ماں باپ کی تابعدار۔ اِس امر سے لاشعوری طور پر بے خبر۔ کہ کب سولہواں سال اُس کے دل کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ وہ 'بڑی بہن' تھی۔ اُسے بڑوں کی طرح برتاؤ کرنا تھا۔ اُسکی اپنی خواہشات۔ گھرداری اور اپنی پڑھائی کے بیچ کہیں کونے میں چھپی رہتیں۔ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے سے پہلے اور جوانی کے آنکھوں میں خواب بن کر اترنے کے بعد۔ سدرہ کی سوچ طاق پر رکھے قرآن پاک کی طرح تھی۔ جو ہمیشہ ایک ملائم اور خوبصورت غلاف میں لپٹا ہوتا تھا۔ ایک دن اچانک اُسے ایک لڑکے کے خط نے چونکا دیا۔ ماں کو خط دکھاتے ہوئے سدرہ گھبرانے کی بجائے خوش تھی۔ ایسے موقعوں پر دل میں اگر چور نہ ہو تو گھبراہٹ نہیں ہوتی۔ ماں نے خط پڑھا۔ اور اُسکے پرزے پرزے کرتے ہوئے کہا 'میری بیٹی کی تربیت مَیں نے کی ہے۔ اِس طرح کی فضولیات کے لئے اُس کے پاس وقت ہی نہیں ہے'۔ اُدھر سدرہ کا جواب بھی خوب تھا 'ماں۔ ایسے لڑکے کے خط کا کیا جواب کیا دینا۔ جو اردو کے چند فقرے بھی درست نہیں لکھ سکتا'۔

محلے میں 'بہار' کے دو واضح معنی تھے۔ ایک تو موسم بہار والی بہار۔ اور دوسری اُس کھیل

CamScanner

کی 'آمد' کا اعلان جو کچھ عرصہ کے لئے گلی میں کھیلا جائے گا۔ بنٹے اور اخروٹ کھیلنے کی بہار۔ جب محلے کے بچے بہت سارے بنٹے اور بہت سارے اخروٹ جمع کرنا چاہتے۔ مختلف طریقے سے کھیل کر۔ بنٹے اور اخروٹ ہارے اور جیتے جاتے۔ اور بہار ختم ہونے پر گھر کی کوٹھڑی میں کسی چھوٹی سی صندوقچی میں اگلی بہار تک کے لئے رکھ دیئے جاتے۔ لٹوؤں کی بہار۔ طرح طرح کے لٹو محلے میں نظر آتے۔ لمبوترے۔ گول۔ رنگین۔ لتی کی گرہ لٹو کے کیل سے شروع ہو کر اوپر تک رول کی جاتی۔ دو تین گز لمبی لتی کی ڈوری کو زمین پر پھینک کر زور سے کھینچا جاتا۔ اور وہ لٹو جیتتا جو زیادہ دیر تک گھومتا رہتا۔ سگریٹوں کے خالی پیکٹ بھری دوپہروں میں سڑکوں اور گلیوں میں گھوم کر بچے اکٹھے کرتے۔ یہ کھوکھوں کی بہار تھی۔ پاسنگ شو، کیونڈر، تار، لوہار، دوڈبائین، کے ٹو، ایمبیسی۔ ہر طرح کے سگریٹ پینے والے آخری سگریٹ پینے کے بعد۔ جہاں کھڑے یا بیٹھے ہوتے۔ وہیں ذرا فاصلے پر "کھوکھا" پھینک دیتے۔ تیسری دنیا میں ابھی بھی غیر متعلقہ اشیا کو گاربج کرنے کا رواج نہیں ہے۔

گلی ڈنڈے کی بہار آتی تو آس پاس کے چند محلوں میں لڑکے طرح طرح کے گلی ڈنڈے کھیلتے نظر آتے۔ اُس زمانے میں سیالکوٹ شہر میں ابھی ٹی وی نہیں آیا تھا۔ ویڈیو گیمز بھی بہت بعد میں آئیں۔ لہٰذا وہ بچے جو سکول نہیں جاتے تھے اور اپنے اپنے "کاریگر" والد یا بھائی کا دکان پر ہاتھ بٹاتے تھے۔ سہ پہر سے لے کر شام گئے تک محلوں میں بہار مناتے۔ جنوری فروری میں لاہور سے بسنت کی تیاریوں کی خبر۔ تقریباً اسی میل دور سیالکوٹ پہنچتی تو پتنگوں کی بہار آجاتی۔ گڈی کاغذ مہنگا ہو جاتا۔ بانس کے باریک تیلوں سے۔ کئی طرح کی لئی سے۔ رنگ برنگے گڈی کاغذوں سے۔ گڈیاں بنانے والوں کی دکانیں بھر جاتیں۔ رنگ برنگے پتنے دکانوں کے باہر لٹکتے نظر آتے۔ لیکن یہ سب بچے جانتے تھے کہ خود مانجا تیار کر کے بنائی گئی ڈور زیادہ قابل اعتبار ہوتی ہے۔ اِسی لئے کئی گھروں کے کوٹھے۔ اور محلّے کی لمبی گلی میں کوار گندل۔ شیشے۔ اور سریش کو ابال کر۔ اُس میں اپنی پسند کا رنگ ڈال کر۔ 555 کے دھاگے کی ریل بھگو کر دھوپ میں مانجا لگایا جاتا۔ مائیں مریم علی راجپوت جیسی ایم اے پاس ہوں یا رحمان دودھ والے کی ان پڑھ بیوی۔ خالہ زینب۔ سب اپنے بچوں کو کٹی ہوئی پتنگوں کے پیچھے بھاگنے۔ گھر کی ممٹیوں پر بیٹھ کر گاٹیاں ڈالنے۔ اور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے ڈور لوٹنے یا کٹی پتنگ کو پکڑنے کے لئے سرپٹ

CS CamScanner

دوڑنے سے منع کرتیں۔ تیز ڈور سے اُنگلیاں کٹتیں۔ جو جائز سمجھا جاتا تھا۔ لیکن پتنگوں کی ہر بہار میں ساتھ والے کسی محلے سے کسی بچے کا سر پھٹنے۔ بازو یا ٹانگ ٹوٹنے۔ پتنگوں کے پیچھے بھاگتے ہوئے ہمیشہ کیلئے اپاہج ہو جانے کی خبریں ملتی رہتیں۔ جاپان۔ امریکہ۔ کینیڈا۔ ہالینڈ۔ فرانس۔ اور دنیا کے دوسرے ملکوں میں۔ سکولوں کے بچے فارغ وقت میں جن دنوں بلاکس کے ساتھ کھیلتے۔ سکول کی صاف شفاف گراؤنڈ میں فٹ بال، والی بال یا ہاکی کی تربیت لیتے۔ یا کیمونٹی سنٹرز میں بنیادی نشو ونما حاصل کرنے والی ڈاکیومینٹریز دیکھ کر۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اورنج جوس یا اوول ٹین ملا دودھ کا گلاس پیتے۔ محلے میں پتنگوں کی بہار ختم ہونے پر کسی ماں باپ سے۔ بڑھاپے کا سہارا۔ اکلوتا بیٹا۔ یا تو چھن جاتا۔ یا اپاہج ہو کر ملکی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنتا۔

لڑکیاں اکثر گھروں کے اندر یا محلے کے کسی کونے میں۔ جہاں آنے جانے والے کم ہوتے۔ کوکلا چھپا کی۔ ٹاہنیں۔ سٹاپو کھیلتیں یا رسی پھلانگتیں۔ اُن کے "سال" میں "بہاریں" نہ بدلتیں۔ وہی سٹاپو۔ وہی ٹاہنیں۔ اور وہی کوکلا چھپا کی! اُنیس بیس کی عمر میں لڑکی کو پتہ ہوتا کہ اب اُسکا رشتہ آئے گا۔ یا ڈھونڈا جائے گا۔ اور وہ اپنے ہونے والے شوہر کو پہلی بار۔ سہاگ رات ہی کو دیکھے گی۔ اِس لئے کہ ماں باپ نے طے کر دیا۔ تو ٹھیک ہی کیا ہوگا۔ لڑکیوں کی زندگی میں بہار کے کچھ اور ہی معنی تھے۔ ماں باپ کا کھیلا ہوا جوا۔ اندھیرے میں چلایا ہوا تیر۔ یعنی لڑکی کا ہونے والا شوہر۔ اگر صحیح انسان نکل آتا۔ کما کر کھلاتا۔ لڑکی کا خیال رکھتا۔ تو وہ بھاگوں والی کہلاتی ورنہ دو بچوں کی ماں بن جاتی۔ خاوند کی مار کھاتی۔ اور تفننِ طبع کے لئے۔ کبھی کبھار۔ مائیکے کے دن یاد کر لیتی۔ جہاں وہی کوکلا چھپا کی۔ وہی ٹاہنیں۔ اور وہی سٹاپو کھیلتی لڑکی ہوتی۔ جس نے کچھ عرصہ بعد اپنی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ ماں باپ سے کروا کے گھر بسانے چلے جانا ہوتا ہے۔ اپنے پیچھے سکھ کا سانس لیتے ہوئے ماں باپ اور بھائی بہن چھوڑ کر۔ جنہوں نے کسی اور لڑکی کی شادی کا سامان جلد ہی کرنا ہوتا ہے۔ سپین۔ سویڈن۔ ڈنمارک۔ امریکہ۔ کینیڈا۔ اور دنیا کے دوسرے ترقی یافتہ ممالک میں جن دنوں تیرہ چودہ سال کی لڑکیاں puberty پر سکول میں لیکچر لے کر سپاٹ نٹ کی تیاری کرتیں۔ AIDS سے بچاؤ۔ اور safe sex پر فرینک گفتگو اپنے استاد یا ٹی وی پر سُن کر۔ اپنی راہیں متعین کر رہی ہوتیں۔ اُن دنوں۔ تیسری دنیا کے بہت سارے ملکوں کی طرح۔ پاکستان کی لڑکیاں۔ تیرہ چودہ سال کی عمر میں گھبرائی گھبرائی اپنی ماں کی طرف دیکھتیں۔ جو لڑکی

کے "جوان" ہونے پر پانی اچھی طرح جذب کرنے والے کپڑے کا صحیح استعمال نہائت رازداری میں اپنی بیٹیوں کو بتاتیں۔ "غیرت کی چادر" ہو یا" چادر اور چاردیواری" کا تصور۔ "چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاتا ہو" یا" ماں کے دوپٹے کی قسم کھاتا" کپڑا کہیں سے آجاتا۔اور رسی پھلانگتیں لڑکیاں۔ "ہرا سمندر۔ سونا مندر۔ بول میری مچھلی کتنا پانی" بار بار گاتیں۔ یہ جانے بغیر کہ اس شعر کا کوئی مطلب بھی ہے کہ نہیں۔؟

CamScanner

◎
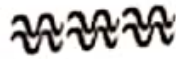
1965 میں پاکستان اور ہندوستان کی جنگ شروع ہوتے ہی سیالکوٹ خالی ہونا شروع ہو گیا۔ لوگوں نے محفوظ مقامات پر جانا شروع کر دیا۔ کرفیو لگتا۔ بلیک آؤٹ ہوتا۔ جہازوں کی گڑگڑاہٹوں سے آسمان چنگھاڑتا ہوا محسوس ہوتا۔ ریڈیو میں خبریں سننے والے۔ ٹینکوں کو میدانِ جنگ میں نہیں۔ اپنے سینوں پر چلتے ہوئے محسوس کرتے۔ نور جہاں وطن کے سجیلے نوجوانوں کے لئے نغمے گاتی۔ اور قومی ترانوں کا تو ایک ریلا سا آ گیا۔ شاعروں نے ملی نغمے لکھ لکھ کر۔ فوجی بھائیوں کے ساتھ ساتھ۔ ریڈیو سننے والوں۔ عام انسانوں کو بھی جنگ میں شامل کر لیا۔ " کرش انڈیا" کا نعرہ۔ صوفی تبسم کے "ایہہ پتر ہٹاں تے نہیں وکدے" میں ملا اور پوری قوم کچھ دیر کے لئے جنگ کی تباہ کاریوں کو بھول سی گئی۔

سدرہ۔ حمزہ اور طلحہ کو۔ یہ تو سمجھ نہ تھی کہ آخر ایک ہی زبان بولنے والے ایک لمبی مدت سے ایک ساتھ رہنے والے۔ ہمسایہ ممالک۔ جنگ کر کے معصوم شہریوں کا خون کیوں بہاتے ہیں۔ لیکن مشکل وقت میں جان بچانے کا فن سیکھنے کا موقع انہیں 1965 کی جنگ نے فراہم کیا۔!

گھر کے سب سے مضبوط کمرے کے وسط میں ڈائننگ ٹیبل رکھا گیا۔ سائرن بجنے پر سب اس ٹیبل کے نیچے سمٹ آتے۔ کہ اگر گھر کے اوپر ہندوستانی جہاز نے بم گرایا۔ تو چھت پھاڑ کر وہ بم ٹیبل سے ہوتا ہوا ان تک پہنچے۔ گھر میں بہت سارا راشن اکٹھا کیا گیا۔ کیا ہوگا اگر بہت دنوں تک سائرنوں کے درمیان۔ گھر سے باہر نکلا ہی نہ جا سکے۔ کم از کم بھوکے تو نہ مریں۔ تین ہاکیاں۔ چار ڈنڈے۔ دو چاقو۔ سب کی رسائی میں تھے۔ اور اگر ایسا وقت آیا کہ دشمن گھر کے اندر گھس آیا تو سامانِ جنگ ہمارے پاس بھی تو ہونا چاہیئے۔ کرائسس مینجمنٹ کا اُن کے لئے یہ ایک تربیتی کورس بھی تھا۔ ابا جی۔ ریڈیو سے کان لگائے رہتے۔ ماں دعائیں مانگتیں۔ سدرہ اور طلحہ بھاگ دوڑ میں لگے رہتے۔ اور حمزہ سکول سے اتنی ساری چھٹیاں ہونے پر خوش تھا۔ اُس کا بس چلتا

CS CamScanner

تو یہ جنگ ہمیشہ لگی رہتی۔ سکول ہمیشہ بند رہتا۔ اور اُسے صبح کے وقت کبھی جاگنا نہ پڑتا۔!

ہار جیت سے اُن کو فرق پڑتا ہے جو جنگ لڑتے ہیں۔ یہ جنگ پورے پاکستان نے لڑی تھی۔ لہٰذا "بظاہر" جیت سے بھی ساری قوم خوش تھی۔ محاذ سے لوٹنے والے فاتح سپاہیوں میں سدرہ کے ماموں شاکر علی راجپوت بھی تھے۔ جنہیں گھر میں سب "فوجی ماموں" کہتے تھے۔ وہ وردی میں جنگ سے لوٹے تو لیفٹیننٹ کی بجائے پورے جرنیل لگ رہے تھے۔ خاص طور پر اُس وقت جب ابا جی کو انہوں نے دشمن پر حملے کا ایک واقعہ سناتے ہوئے ایک ہندوستانی فوجی کا ذکر کرتے ہوئے کہا "اُسے گولی میری بندوق سے لگی۔ گردن میں۔۔۔۔۔"!

ابا جی اور فوجی ماموں پہروں پاک فوج اور اُسکے جوانوں کی تعریف کرتے رہتے جو "جرأتوں کے پرستار" تھے اور سرفروشی اُن کا ایمان تھا۔ "رن آف کچھ" "آپریشن جبرالٹر" "آپریشن گرینڈ سلیم" "اکھنور اور جموں" اور اِس طرح کے گھمبیر الفاظ گھر میں سرسراتے رہتے۔ فوجی ماموں بول رہے تھے۔ سب سُن رہے تھے "9 ستمبر کو ہندوستانی فرسٹ آرمڈ ڈیوژن نے سیالکوٹ پر حملے کا پروگرام بنایا۔ پاک فوج نے یہ حملہ ناکام بنا دیا۔ جواباً ہم نے کھیم کرن کی طرف سے امرتسر پر حملہ کرنے کا سوچا۔ ابا جی نے کہا "سیالکوٹ پر قبضہ ہندوستانی کر سکے اور نہ پاکستان امرتسر فتح کر سکا۔ لیکن F-86 سیبر جہاز تو بہت اڑے۔ تین چار ہزار فوجی بھی جان سے گئے۔ فائدہ کیا ہوا" "عزت اور مادر وطن کی حُرمت کا سوال تھا بھائی جان۔ حملہ انہوں نے کیا تھا۔ منہ توڑ جواب ہم نے دیا"۔ فوجی ماموں کا سینہ تنا ہوا تھا۔ طلحہ کو یہ نہ سمجھ آنے والی گفتگو کیسے سمجھ میں آتی۔ اُسے تو یہ پتہ تھا کہ جہازوں کی گڑگڑاہٹ۔ جوان بھائی کے محاذ پر ہونے۔ اور انجانے خدشات نے ماں سے کانوں کے ذریعے بدلہ لیا۔ ماں کو کانوں میں درد رہنے لگا تھا۔ "سنسناہٹیں ختم نہیں ہوتیں"۔ ماں اکثر بڑبڑاتیں دوسری طرف ابا جی کو اونچا سننے کی عادت تھی۔ گھر میں "آواز آہستہ رکھو" اور "ذرا اونچا بولو" بیک وقت گونجتے تھے۔ اُس گھرانے پر 1965 کی جنگ کے دو واضح اثرات مرتب ہوئے۔ ماں کو کان میں درد رہنے لگا۔ اور حمزہ۔ جو بڑا ہو کے "بڑا آدمی" بننے کی باتیں کیا کرتا تھا۔ فوجی ماموں کے قصے سُن کر مصر تھا کہ وہ فوج میں جائے گا۔!

ﷲﷲﷲ

CamScanner

◎

"بچے اتنے بڑے ہو گئے ہیں۔ اِس عمر میں ماں بننا۔ کچھ عجیب سا لگتا ہے" مریم علی راجپوت نے اپنے میاں کی طرف منہ کئے بغیر کہا۔

"پگلی ہو گئی ہو۔ اللہ دے رہا ہے تو لے لو۔ نئی نئی شکلیں دیکھنی چاہییں۔ رونق لگی رہتی ہے" شرف الدین صدیقی نے شطرنج پر مہرے سجاتے ہوئے جواب دیا۔

"پینتالیس۔ چھیالیس سال کی ماں۔؟ مجھے تو شرم آ رہی ہے۔ محلے والے تو دور کی بات ہے۔ سدرہ کیا سوچے گی"۔

"کیا سوچے گی۔ یہی کہ بہن ملے گی یا ایک اور بھائی۔ تم تو خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو۔ ڈاکٹر نے کونسا دن بتایا ہے؟"

"اگلے مہینے کے وسط میں کہیں۔"

"دیکھو نا۔ ابھی چوتھا بچہ آیا نہیں اور سرکار نے بونس ابھی سے دے دیا"

"جیسے بونس دینے والوں کو پتہ ہے کہ صدیقی صاحب اِس عمر میں پھر سے باپ بننے جا رہے ہیں؟"

"تو کیا یہ سب چھپ کر ہو رہا ہے، بھئی لڈو بانٹیں گے۔ خوشی منائیں گے۔ اور نام کیا سوچا ہے"۔

"لڑکی ہوئی تو فاطمہ۔ لڑکا ہوا تو وارث۔"

"چلو۔ دیکھتے ہیں۔ پہلے ہو تو جائے"

"آپ نے خود ہی سوال کیا تھا"

"میرا تو خیال ہے لڑکی ہوئی تو فاطمہ۔ اور لڑکا ہوا تو ولید۔"

"خالد بن ولید؟"

"نہیں صرف ولید۔!"

اور سدرہ، طلحہ اور حمزہ کے چوتھے بھائی کا نام ولید رکھا گیا۔ سدرہ اور طلحہ کافی دیر تک بحث کرتے رہے۔ کہ سب نام ہم قافیہ ہیں۔ یہ ولید قافیئے میں نہیں بیٹھتا۔ لیکن ہم قافیہ نام تجویز کرنے کی ہمت کسی میں نہ تھی۔!

لکڑ والے سکول کے ماسٹر غفور کا کہنا تھا کہ انہوں نے اپنی ساری زندگی میں ولید جیسا ذہین بچہ نہیں دیکھا۔ خوش خطی میں پہلا انعام ولید کو دیتے ہوئے ماسٹر غفور نے اُسے "پروفیسر بچے" کا خطاب دیا۔ اور پیش گوئی کی یہ بچہ بڑا ہو کر کوئی زبردست کارنامہ انجام دے گا۔ پانچ سال کی عمر میں ولید شطرنج کی تمام چالیں جان چکا تھا۔ اُسکے پڑھنے کی رفتار عام بچوں سے کہیں زیادہ تھی۔ سبق ایک مرتبہ سُن کر ہمیشہ کے لئے اُسے یاد ہو جاتا۔ گلی میں دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلنے کی بجائے وہ ماں کے پاس زیادہ تر وقت گذارتا یا پھر کتابیں پڑھتا۔ "بچوں کی دنیا" سے ہوتا ہوا الف لیلیٰ داستانِ امیر حمزہ اور پھر جاسوسی ناول۔! ایک دن ماں نے ناول کی نوعیت دیکھتے ہوئے ولید کو منع کیا کہ اتنی چھوٹی عمر میں ایسے ناول نہیں پڑھنے چاہیں۔ اُدھر ولید بارہ سال کی عمر میں علاقے کی واحد لائبیریری کی ساری کتابیں پڑھ چکا تھا۔ وہ بات کم کرتا۔ لیکن ایک عجیب سی دلیل کے ساتھ۔! اُسکی گفتگو کم ہوتی لیکن کام کی ساری باتیں کر جاتا۔ سکول میں ہر امتحان میں اوّل۔ اپنے تینوں بہن بھائیوں سے ہر مضمون میں زیادہ نمبر۔ اپنے باپ کا چہیتا۔ جس کے دوستوں کو شطرنج میں وہ با آسانی ہرا دیتا تھا۔ سدرہ اور طلحہ اپنے چھوٹے بھائی کی پڑھائی اور تربیت میں بڑھ چڑھ کے حصہ لیتے۔ حمزہ اپنے "چھوٹے" ہونے کا اعزاز کھو جانے کی وجہ سے ولید سے اکثر لڑتا رہتا۔ کسی نہ کسی بات پر دونوں کی نوک جھونک چلتی رہتی۔ ماں ہمیشہ ولید کی طرف داری کرتیں۔ "چھوٹا ہے۔ اور تم بڑے ہو۔" اور حمزہ کو یہ یاد نہ رہتا کہ کچھ برس پہلے طلحہ کے ساتھ اونچ نیچ ہونے پر ماں طلحہ کو یہی دلیل دیا کرتی تھیں۔

گورنمنٹ پائلٹ سیکنڈری سکول میں ریاضی کے استاد ماسٹر کفائت حسین اب اکثر اوقات فارغ گھومتے نظر آتے۔ انکی کلاس کو۔ کلاس کا ہی ایک طالبعلم۔ ریاضی پڑھاتا تھا۔!

ایک دن شرف الدین صدیقی سے بازار میں ملاقات ہوئی تو ماسٹر کفائت نے دل کھول کے ولید کی تعریف کی۔

Mir Zaheer Abass Rustmani

CS CamScanner

"خالی لیاقت ہی نہیں۔ اس بچے میں کچھ اور بھی خوبیاں ہیں"

"بس جی۔ اللہ کا کرم ہے۔ پاس ہوتا رہے۔ باقی خیر ہے"

"پاس؟ ولید Maths میں کچھ نیا کر کے دکھانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ دو گراف کتاب میں ہوتے ہیں۔ تیسرا ولید بنا کر دکھاتا ہے۔ اِسے ملک سے باہر جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنی چاہیئے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ اپنے ملک کا نام پوری دنیا میں روشن کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے"

"ملک کے اندر رہ کے ہی پڑھ لے تو بہت ہے۔ ماسٹر صاحب۔ دیانت داری کی کمائی میں جہاز کی ٹکٹ نہیں خریدی جاتی"

"آپ کی مرضی صدیقی صاحب۔ مَیں تو اتنا جانتا ہوں کہ یہ بچہ کچھ کر کے دکھائے گا۔ آپ ٹکٹ خریدیں یا نہیں۔ یہ اونچا اڑنے والا کبوتر ہے۔ سر کے کچھ بال جھڑ بھی گئے۔ اڑے گا یہ اونچا ہی۔"

اُس رات بڑی مدت کے بعد۔ کھانے کی میز پر۔ شرف الدین صدیقی نے مذہب پر گفتگو کرنے کا سب گھر والوں کو مژدہ سنایا۔ وہ عموماً مذہب پر بحث مناسب نہ سمجھتے تھے۔ ولید کا بھی۔ یہی خیال تھا۔ مذہب سمجھنے اور برتنے کی چیز ہے۔ اور جس تصور میں ترمیم نہ کی جا سکے۔ اُس پر بحث لایعنی ہوتی ہے۔ تردید تو کجا۔ مذہب کے بنیادی اصولوں پر بات کرتے ہوئے صدیقی صاحب کسی قسم کا فضول سوال بھی سننا پسند نہ کرتے تھے۔ اُن کا "مذہب پر گفتگو" کرنے کا اعلان سب کے لئے حیرانی کا باعث تھا۔

"سورۃ ہُود میں ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے کافر بیٹے سے کہا کہ ہمارے ساتھ آ جاؤ۔ بچ جاؤ گے۔ بیٹے نے کہا کہ مَیں پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کے جان بچا لوں گا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچانے والا کوئی نہیں۔ باپ بیٹے کے درمیان ایک موج حائل ہو گئی اور بیٹا باقی اور لوگوں کی طرح غرق ہو گیا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے دعا مانگی تھی کہ اُن کا بیٹا بچ جائے۔ اللہ نے کہا کہ یہ دعا نادانی ہے۔ ایسی نادانی نہ کرنا۔ اور حضرت نوح نے اللہ سے معافی مانگ لی"۔

"اور سورۃ مریم میں۔ دوسری طرف۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ کی مغفرت کی دعا کرتے ہیں۔ جو اللہ کو نہیں مانتا"۔ ماں برتن سمیٹتے ہوئے گفتگو۔ جو ابھی تک صرف ایک

CamScanner

طرف سے ہو رہی تھی سُن رہی تھی اور خاموش تھی۔ سدرہ نے سوال کیا۔

"دونوں انبیاء تھے۔ ایک نے بیٹے کو بچانے کی دعا کی۔ دوسرے نے باپ کو بچانے کی دعا کی۔ کیا دعائیں قبول ہوئیں"

"اسلامی تعلیمات میں ماں باپ کی عزت اور احترام کرنے کی جگہ جگہ تلقین کی گئی ہے....."

"لیکن ابا جی۔ بیٹی کے بارے میں کیا حکم ہے۔ مردوں کی بات ہو رہی ہے۔ کیا اس میں عورتوں کا ذکر بھی ہے" طلحہ نے باپ کی بات بیچ میں روک کر پوچھا۔

جس وقت ابا جی سورۃ الحُجرات کا تفصیلی ذکر کر رہے تھے۔ جہاں اللہ نے کہا ہے کہ "مردوں کو مردوں پر ہنسنا نہیں چاہیئے اور عورتوں کو عورتوں پر ہنسنا نہیں چاہیئے کہ ہم نہیں جانتے بہتر کون ہے" اُس لمحے ولید کھانے کی میز سے۔ بغیر کوئی لفظ کہے۔ چپکے سے نکل آیا۔ اپنے کمرے میں آ کر دیر تک سورۃ الحُجرات اُسکے دل و دماغ میں گھومتی رہی۔

"سراغ مت لگایا کرو۔ غیبت نہ کیا کرو۔ بہت سے گمانوں سے بچا کرو۔ کیونکہ بعضے گمان گناہ ہوتے ہیں"۔ سوالات کے ایک سیلاب نے ولید کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اُن میں سے ایک سوال بھی ایسا نہ تھا جو وہ اپنے باپ سے کر سکتا تھا۔ باپ کی ناراضی لازمی تھی۔ مگر وہ اپنے دل میں طے کر چکا تھا کہ اگلی مرتبہ ماموں حیدر سے ملاقات ہوئی تو کم از کم ایک بات کی وضاحت ضرور مانگے گا۔ بعضے گمان اگر گناہ ہوتے ہیں تو بعضے گمان گناہ نہیں بھی ہوتے ہوں گے۔ وہ کون سے گمان ہیں جو گناہ کے زمرے میں نہیں آتے۔ اور یہ کہ اِس سلسلے میں تحقیق کی کتنی گنجائش اسلام میں جائز ہے۔

"بعضے گمان گناہ ہوتے ہیں"۔ کانوں میں گھنٹیاں سی بجنے لگیں۔ اس سے پہلے کہ اُن گھنٹیوں کی آواز مزید تیز ہوتی۔ اُس نے سوچا کہ عارف سے جا کر ملا جائے۔ یہ خیال آتے ہی ولید نے بے خیالی میں سامنے پڑی ایک کتاب اٹھائی اور سدرہ کو بتاتے ہوئے کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ گھر کے مین دروازے سے باہر نکل آیا۔

✿✿✿✿

CS CamScanner

◎

مرے کالج کے صدر دروازے پر پروفیسر حیدرعلی راجپوت اپنی سائیکل سے اترے۔سائیکل کا ہینڈل دائیں ہاتھ میں تھامے۔انگریزی ڈیپارٹمنٹ کی طرف جاتے ہوئے برقعہ پہنے ہوئے ایک طلبہ نے "ایکسکیوزمی سر" کہاتو پروفیسر نے اپنے بائیں طرف جھکے شانے کوسیدھا کرتے ہوئے لڑکی کی طرف دیکھا۔

"سرآج مَیں کلاس اٹینڈ نہیں کرسکوں گی۔گھر میں کچھ مہمانوں نے آنا ہے۔مَیں نے سوچا آپ سے کالج آکر چھٹی لوں۔Keats پرآج کے نوٹس زبیدہ سے لےلوں گی"۔"ٹھیک ہے"پروفیسر حیدر نے لڑکی کا نام یاد کرنے کی کوشش کرتے ہوئے آہستگی سے کہااور پاس سے گذرتے ہوئے ایک ساتھی کے سلام کا سر ہلا کر جواب دیتے ہوئے ڈیپارٹمنٹ کی طرف جانے کے لئے سائیکل کارخ بائیں طرف موڑلیا۔

پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے انگریزی میں گولڈمیڈل لینے کے بعد حیدرعلی راجپوت نے فلسفے میں ایم اے کیااور یہاں بھی یونیورسٹی بھر میں اول آنے کے بعد اپنے والد پروفیسر وراثت علی راجپوت پی ایچ ڈی کی طرح شہر کے سب سے معیاری کالج میں پڑھانے کے لئے لاہور سے سیالکوٹ آگئے۔صرف شہر میں ہی نہیں صوبے بھر میں یا شائد ملک بھر میں انگریزی پڑھانے والا ایسا استاد نہیں تھا۔لیکچر کے دوران ممکن نہیں تھا کوکسی سٹوڈنٹ کا دھیان یہاں وہاں ہوجائے۔"سمجھ آئے نہ آئے۔لیکچر میں ایک طلسماتی سحر ہوتا ہے""بولتے ہیں توجی چاہتا ہے سنتے ہی چلے جاؤ""علم کا سمندر ہیں پروفیسر صاحب۔موتی پروتے ہیں""پروفیسر راجپوت سے انگریزی پڑھی ہے۔ذرادھیان سے بات کرنا"اس طرح کی بہت سی باتیں پروفیسر راجپوت کے بارے میں ہوتی رہتیں۔علم،عقل اور مشاہدے میں واقعی اُن کا ثانی ڈھونڈنا مشکل تھا۔خود پروفیسر حیدر کتنے اکیلے۔کتنے انوکھے۔اور کتنے خوش فطرت انسان تھے۔شائد دولوگ جانتے تھے۔ڈاکٹر

CS CamScanner

نساء تبسم ۔جس نے پروفیسر حیدر سے اپنی آخری سانسوں تک محبت کی۔ اور مریم علی راجپوت۔ پروفیسر کی بڑی بہن۔ نظریں ہمیشہ نیچی کئے رہتے۔ لہجہ ملائم۔ مریم راجپوت کو اپنے اِس بھائی سے ایک خاص اُنس تھا۔ ان کے بھائی شاکر علی راجپوت جتنے کھلنڈرے۔ لاابالی اور باتونی تھے۔ پروفیسر حیدر اتنے ہی کم گو۔ اور اپنے کام سے کام رکھنے والے۔ تنہائی پسند۔ شرمیلے۔!

اُس محلّہ سے کشمیری محلّہ کا راستہ دس پندرہ منٹ کی واک تھا۔ جہاں حیدر اور تبسم کی محبت آج بھی کہیں فضا میں رچی بسی ہوگی۔ کشمیری محلے کی سب سے بڑی "کوٹھی" پروفیسر وراثت علی راجپوت کی تھی۔ جن کے مرنے کے بعد اُس میں پروفیسر حیدر اپنے دونوں بھائیوں۔ شاکر علی اور حشمت علی کے ساتھ رہتے تھے۔ بیگم وراثت علی۔ اپنے چھوٹے بیٹے حشمت علی کی پیدائش کے فوراً بعد چل بسی تھیں۔ اور مرنے سے پہلے اپنے سارے بچوں کی "ذمہ داری" مریم علی راجپوت کے سپرد کر گئی تھیں۔ جو گھر میں سب سے بڑی ہونے کے ناطے۔ "آپا جی" تھیں اور سب اُن کا کہا مانتے تھے۔

حشمت علی اپنی بنک کی نوکری اور گائیکی کی وجہ سے کشمیری محلے میں مشہور تھے۔ پروفیسروں کے اِس بیٹے کے رنگ نرالے تھے۔ اپنی خوبصورت آواز اور شکل پر ناز ہونے کے ساتھ ساتھ۔ حشمت علی کو اپنے زورِ بازو پر بھی بہت مان تھا۔ "پروفیسروں کا بیٹا" ہوتے ہوئے بھی اُسکی آئے دن محلے میں لڑائیاں ہوتی تھیں۔ جو پروفیسر حیدر کی عزت اور مریم راجپوت کے حسنِ سلوک کی بدولت لوگ درگذر کرتے تھے۔

دور کے رشتہ داروں کی شکیلہ سے حشمت نے شادی کا فیصلہ کیا تو پروفیسر حیدر نے اپنی خاموشی توڑتے ہوئے بھائی سے "دوبارہ سوچ لو" کہتے ہوئے کہا کہ یہ خاندان اچھا نہیں۔! بڑے بھائی کی بات پر غور کرنے کی بجائے چھوٹے بھائی نے "اور ڈاکٹر تبسم کا خاندان آسمان سے اترا ہے" کہہ کر بات ہی ختم کر دی۔ اُدھر جب شکیلہ کی ماں کو اِس بات کا پتہ چلا تو اُس نے حشمت اور شکیلہ کی شادی کی ایک انوکھی شرط رکھ دی۔ کہا کہ شکیلہ کی شادی حشمت سے ہوگی اگر شکیلہ کی بڑی بہن شبنم سے پروفیسر حیدر کا بیاہ ہوگا۔

گھر میں ایک عجیب کھچاؤ کی فضا آ گئی۔ حشمت کو پروفیسر حیدر اور ڈاکٹر تبسم کی محبت کا پتہ تھا۔ اُسے یہ بھی خبر تھی کی کچھ ماہ بعد دونوں شادی کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اپنی محبت میں اندھے

بھائی کو بڑے بھائی کے احساسات کا خیال نہ رہا۔ پروفیسر حیدر۔ فلسفے اور ادب کا ماسٹر تھا۔ لیکن اُسے خاندانی سیاستوں کے الجھاؤ کبھی سمجھ نہ آئے تھے۔ جب حشمت نے " کوٹھی" کی مُمٹی پر چڑھ کر نیچے چھلانگ لگا کے خودکشی کی دھمکی دی تو پروفیسر حیدر اپنی بڑی بہن سے ملنے آئے۔

" آپا جی۔ کیا کروں۔؟" پروفیسر حیدر کا بایاں شانہ کچھ زیادہ ہی جھکا ہوا تھا۔

"حیدر۔ یہ خاندان ٹھیک نہیں ہے۔ دونوں بھائیوں کا تو کیا۔ میں تو اپنے ایک بھائی کی شادی بھی یہاں نہیں کرانا چاہتی" مریم راجپوت کے لہجہ میں اعتماد کی کمی تھی۔

"وہ کہتا ہے خودکشی کرلوں گا۔"

"میں سمجھاتی ہوں اُسے۔ تم فکر نہ کرو۔" مریم راجپوت نے سدرہ کو برقع لانے کا کہا اور بھائی کو گلے لگالیا۔

مریم راجپوت اپنے سب سے چھوٹے بھائی کو عقل کی کوئی بات نہ سمجھا سکی۔ حشمت " آپا جی" سے " تم" پر اتر آیا۔ حیدر کو جھگڑے کا یہ ماحول اپنی برداشت سے باہر نظر آرہا تھا۔ کوٹھی میں کام کرنے والی ماسی اور محلے میں کچھ ہمسائے " پروفیسروں" کے گھر کی لڑائی کان لگا کر سُن رہے تھے۔

"میں واقعی جان دے دوں گا۔ اور لکھ کر جاؤں گا کہ تم نے میری ذرا سی بات نہ مانی۔ کیا برائی ہے شبنم میں۔ بارہ جماعتیں پاس ہے۔ خوبصورت ہے۔ کیا کمی ہے اُس میں۔" حشمت غصے میں بولے چلے جا رہا تھا۔

"بڑے بھائی سے بات کر رہے ہو۔ ادب لحاظ سے بات کرو۔ ایک لڑکی سے ذرا سے تعلق نے تمہیں رشتوں کا تقدس بھلا دیا ہے۔ اور خودکشی حرام ہے۔ مذہب میں اِسکی کوئی اجازت نہیں۔" مریم راجپوت نے کہا" اور پروفیسر کا جورشتہ تبسم کے ساتھ ہے۔ اِسکی اجازت مذہب دیتا ہے۔ پرانے زمانے کی باتیں ہیں یہ۔ اِسے کہو یہ مان جائے۔ ورنہ اِس کوٹھی کے حصے کرواؤں گا اور اِسے یہاں سے جانا پڑے گا" حشمت کے غصے میں اضافہ ہو رہا تھا۔

"اب اپنے ماں باپ کی عزت خاک میں ملانے کے لئے یہی کچھ کرنا باقی رہ گیا ہے۔ disgusting۔!" مریم کچھ اور کہنا چاہتی تھی لیکن پروفیسر حیدر نے ہاتھ فضا میں ہولے سے لہراتے ہوئے اپنی بہن کو روک دیا" ٹھیک ہے۔ آپا جی۔ بس۔ اور نہیں۔ میں اور نہیں سُن سکتا۔

CamScanner

اسے کہیں کہ شکیلہ سے اس کی شادی ضرور ہوگی۔ مجھے منظور ہے۔آپ شبنم کا رشتہ مانگ لیں میرے لئے۔بس کردو حشمت۔اس گھر میں میرے باپ کی روح کہیں موجود ہے،میری ماں نے یہاں عمر گذاری ہے۔بس کردو۔آیئے آپا جی۔مَیں آپ کو گھر چھوڑ دوں"۔ پروفیسر حیدر کا لہجہ سخت نہیں تھا۔لیکن اُن کا سارا بدن غصے سے کانپ رہا تھا۔

ꙮꙮꙮ

◎

"ولید نہیں آیا"۔ پروفیسر حیدر نے برآمدے میں سائیکل کھڑی کرتے ہوئے صحن میں صفائی کرتی ماسی سے پوچھا"اِتھے ای سی۔" ماسی نے پنجابی میں کہا۔ "یہیں کہیں تھا"۔بغیر کسی آواز یا شور کے۔ پروفیسر حیدر نے بغل میں دبائے کاغذوں کے پلندے کو دائیں ہاتھ میں سنبھالا۔اور بائیں جیب میں پڑی۔دو شیشوں کے بیچ۔حنوط۔ایک رنگ برنگی تتلی کو بائیں ہاتھ میں احتیاط سے پکڑتے ہوئے اپنے کمرے کا تالا کھول کر اندر چلے گئے۔ "ولید آئے تو اُسے کمرے میں بھیج دینا" پروفیسر نے کوٹ اتار کر بستر پر رکھتے ہوئے ماسی سے کہا" چنگا"۔ ماسی صفائی کرنے کے بعد اب پانی کی ٹنکی کے پاس کھڑی گندے کپڑوں کو صاف کرنے کا سوچ رہی تھی۔

ولید اپنے حیدر ماموں کا سب سے پیارا بھانجا تھا۔ماموں اپنے کمرے میں کسی بڑے کو نہیں آنے دیتے تھے۔لیکن بچہ ہوتے ہوئے بھی ولید کو اجازت تھی۔

سدرہ۔طلحہ اور حمزہ۔ ماموں حیدر کے کمرے کے قصے ولید سے سنتے ۔ اور حیران ہوتے۔ کہ اُن کے کمرے میں کتنے جہان قید تھے۔سینکڑوں کتابوں کے سمندر میں جزیرہ نما ایک حصہ۔ جہاں چھوٹے چھوٹے شیشوں میں بے شمار تتلیاں قید تھیں۔حنوط۔خاموش۔!

اُس دن ولید کو ماموں نے اپنا اور تتلیوں کا رشتہ سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ شائد اپنے ذہین بھانجے کو اس قابل سمجھتے تھے۔ یا پھر اُسے زندگی گذارنے کا کوئی پر اسرار۔انوکھا۔طریقہ سکھانے کی کوشش تھی۔!

"چھیاسی ڈگری درجہ حرارت ہو تو تتلیاں ہوا میں پرواز کر سکتی ہیں۔ اسی لئے سرد موسم میں سورج نکلے تو اپنے بدن کو گرم کرنے میں انہیں ذرا وقت لگتا ہے۔ پانچ میل فی گھنٹہ سے تیس میل فی گھنٹہ تک تتلیاں اپنی رفتار میں اپنے رنگوں کی طرح مختلف ہوتی ہیں۔ انڈے سے لاروا۔لاروے سے پیوپا اور پھر اڑنے والی تتلی۔یہی اِن کا سائیکل ہوتا ہے۔اتنی خوفناک اور دشمن

زندگی۔اور پھر ہر طرف بھوکے پرندوں کی خوراک بن جانے کا خوف۔تتلیاں ۔دیکھنے۔ سننے۔محسوس کرنے اور سونگھنے کی صلاحیتوں کو استعمال کر کے۔موقع ملے تو۔ایک جگہ سے دوسری جگہ ہجرت کر جاتی ہیں۔زندگی کے مختلف مراحل میں تتلیوں کی قوت نظر۔کئی مرتبہ۔بدلتی اور تیز ہوتی رہتی ہے۔آنکھیں سادہ اور compound ہوتی ہیں اور بہت سے عدسوں یعنی corneas سے بنی ہوتی ہیں جو روشنی کو فوکس کر کے۔اپنے دائرہ حصار میں۔rhabdome یعنی انسانی retina کی طرح استعمال ہوتی ہیں۔ایک optical nerve معلومات دماغ تک پہنچاتی ہے اور یوں سامنے آئے object کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔تتلیوں کا دیکھنا۔انسانوں کے دیکھنے سے قطعی مختلف ہوتا ہے۔یہ الٹراوائلٹ شعاعیں بھی دیکھ سکتی ہیں جو انسانی آنکھ کی بساط سے باہر ہے۔تتلی کے بدن پر sensory بال یعنی setae۔اُسے ماحول سے آگہی دلواتے ہیں اور ہوا کے بارے معلومات فراہم کرتے ہیں۔

تتلیاں ایک مشاق ہواباز ہوتی ہیں۔اُن کے پر وسطی حصے یعنی horax سے جڑے ہوتے ہیں۔شریانیں۔نازک پروں کو خون فراہم کرتی ہیں۔ اِسکے sense receptors سونگھنے میں مدد دیتے ہیں۔تتلی کے پیروں میں محسوس کرنے والے sense organs ہوتے ہیں جو اِسے پھولوں میں nectar اور چینی کا ذائقہ سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔یہی اِسے خبردار کرتے ہیں کہ کھائی جانے والی شے مضر ہے یا نہیں؟ مادہ تتلی۔میزبان پودے کو سونگھنے اور انڈہ دینے کے لئے موضوع جگہ تلاش کرنے میں بھی انہی organs سے مدد لیتی ہے۔

تتلیاں بہت حساس اور کمزور ہوتی ہیں۔اپنے دماغ کو استعمال کرنے کے لئے قدرت نے انہیں کوئی خاص mechanism عطا نہیں کیا۔لیکن قدرت نے تتلیوں کو اپنے دفاع کے لئے ایک فطری صلاحیت دے رکھی ہے۔دشمن کیڑوں اور پرندوں سے بچنے کے لئے camouflage تتلی کے دفاع کا ایک کارگر گر ہے۔شاخ پر بیٹھی تتلی۔شاخ پر کھلے پھولوں اور پتوں میں اِس طرح چھپ جاتی ہے کہ پودے یا درخت کا ایک حصہ لگتی ہے۔کچھ تتلیاں مردہ پتوں کی طرح ہوتی ہیں جیسے Indian leaf تتلی۔! carpenter تتلی بالکل درخت کی چھال کی طرح ہوتی ہے۔!

دفاع کا سب سے مضبوط گُر تتلی کو قدرت نے ایک خاص قسم کا زہر دے کر سکھایا ہے۔

پرندہ اِس زہر کو کھاتے ہی بیمار پڑ جاتا ہے۔ الٹیاں کرتا ہے اور جلد ہی سیکھ لیتا ہے کہ اِس طرح کی کوئی اور تتلی نظر آئی تو حملہ نہیں کرنا۔ یوں ایک تتلی کی قربانی۔ اُس جیسی باقی تتلیوں کی جان بچنے کا سبب بنتی ہے۔ کچھ زہریلی تتلیوں کے بدن پر چند خاص نشان ہوتے ہیں۔ یہ pattern اُن کے لئے اور اُن سے ملتی جلتی دوسری تتلیوں کے لئے سودمند ثابت ہوتا ہے۔ پرندے کو خبر ہوتی ہے کہ اِس سے "ملتی جلتی" تتلی پر حملے میں کیا نقصان ہوا تھا!

زہریلی تتلیوں میں ایک monarch تتلی ہوتی ہے جو milkwead کھا کر زہریلی بن جاتی ہے۔ اِسی طرح small postman اور pipevine swallowtail بھی زہریلی تتلیاں ہوتی ہیں۔ تتلی کا رفتار سے اڑنا۔ اُسکا سب سے بڑا دفاع ہوتا ہے۔ اسی لئے غیر زہریلی تتلیاں۔ زہریلی تتلیوں سے۔ زیادہ تیز اڑتی ہیں۔ peacock تتلی۔ جو یورپ اور ایشیا میں ملتی ہے۔ خوف کی حالت میں ہو تو اپنے پروں کو جوڑ کر ایک خاص hissing sound نکالتی ہے۔ تحقیق کرنے والوں کو آج تک پتہ نہیں لگا کہ تتلی اپنے دماغ کے کس حصے کو استعمال کر کے۔ خوف جیسی "انسانی" خوبی سے ہمکنار ہوتی ہے۔

"اتنی ساری تتلیوں کا آپ کا کیا کرتے ہیں۔ ماموں"۔ ولید نے ماموں کی تتلیوں پر معلومات حرف بہ حرف یاد کرنے اور اندر چھپے پیغامات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے ایک معصوم سا سوال کیا۔

"ضروری نہیں کہ ہر چیز جو آپ کے پاس موجود ہے۔ اُس سے بازار میں جا کر کوئی شے خریدی جا سکے۔ یا وہ کھانا لذیز کرنے میں مدد دے۔ فائدہ اور نقصان سائنس دان سوچتے ہیں۔ بچے اپنے کھلونوں کے ساتھ کیا کرتے ہیں" پروفیسر حیدر نے سوال کیا "کھیلتے ہیں" "اور کھیل کر کیا کرتے ہیں" "اگلی مرتبہ کھیلنے کے لئے رکھ دیتے ہیں"

"یہ تتلیاں بھی رکھی ہوئیں ہیں۔ جیسے یہ دنیا۔ اُس نے۔ بنانے اور کھیلنے کے بعد رکھ چھوڑی ہے۔ بس ایک جگہ پڑی ہے۔ اگلی مرتبہ کھیلنے کے کام آنے کیلئے۔ تم بتاؤ۔ امتحان کی تیاری کیسی ہے۔؟"

"ٹھیک چل رہی ہے ماموں"

"آپا جی کو میرا اسلام دینا۔ اور کہنا کسی دن ملنے آؤں گا" پروفیسر حیدر نے پاس پڑی

شیشے میں حنوط ایک تتلی ولید تک بڑھاتے ہوئے گویا "ملاقات کا وقت ختم ہوا" کا اعلان کیا۔!

"میں اِس تتلی کا کیا کروں گا ماموں"

"جو میں نے کیا۔اور۔یا۔جو میں نہیں کر سکا۔تتلی زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہتی۔لیکن جتنی دیر زندہ ہوتی ہے۔دوسروں کو خوبصورتی اور رنگوں کا تحفہ دیتی ہے۔خوف میں زندہ رہتی ہے۔ لیکن خاموش۔! کبھی تم نے کسی تتلی کو بولتے سنا ہے۔یا شکائت کرتے ہوئے۔؟نہیں نا۔اور پھر تتلی دیکھنے اور محسوس کرنے والوں کو احساس دلاتی ہے کہ مکمل سکون۔اطمینان اور گہری خاموشی حاصل کی جا سکتی ہے۔بہت زیادہ دولت۔آسانی سے حاصل کی جا سکتی ہے۔اصل محنت اطمینان کی حالت۔سکون۔اور خاموشی حاصل کرنے میں صَرف ہوتی ہے۔اور ہاں۔پچھلی مرتبہ تمہیں ایک کتاب دی تھی۔وہ واپس کر دینا"۔

"پروفیسر حیدر کا چین میں ایک "قلمی دوست" تھا۔جس سے وہ ڈاک کے ذریعے نجانے کون کون سی ذات کی تتلیاں لفافوں میں بند کروا کے منگواتے۔یا پھر مہینے میں ایک آدھ مرتبہ۔کسی دوسرے شہر یا گاؤں جا کر دو تین دن رہتے اور واپسی پر تھیلے میں چند تتلیاں ہوتیں۔ایک ماہر شیشہ گر کی طرح وہ تتلیوں کو شیشے میں حنوط کرتے۔

ولید نے ماموں کی تحفتاً دی ہوئی American snout تتلی اٹھائی۔گھر پہنچتے ہی کتابوں میں تلاش کر کے اِس تتلی کے بارے معلومات اکھٹی کیں۔

اُسے پتہ لگا کہ یہ تتلی گروہ کی شکل میں انڈے دیتی ہے۔اِس کا خاندان Libytheana carinenta ہے۔اور یہ hackberry پودے پر ایک مردہ پتے کی طرح پڑی نظر آتی ہے۔ کتاب میں لکھا تھا کہ اِسے معمولی تتلی نہ سمجھا جائے۔یہ ایک خاص تتلی ہے جو لمبی لمبی ہجرتوں پر نکل جاتی ہے۔اُسے اپنی موت کا وقت کسی طرح معلوم ہو جاتا ہے۔اور وہ مرنے سے پہلے۔اُسی درخت۔اُسی پھول۔اُسی باغیچے۔اُسی پارک کی طرف واپس اڑتی ہے۔جہاں اُس نے آنکھ کھولی تھی۔!

ჯჯჯჯ

CS CamScanner

◎

پروفیسر حیدر اور شبنم کی شادی صرف تین دن چلی۔ طلاق لینے کے بعد شبنم گھر واپس چلی گئی اور ساتھ ہی حشمت سے شکیلہ کی شادی بھی کھٹائی میں پڑ گئی۔ پروفیسر حیدر نے اپنا کہا پورا کیا۔ انہیں شادی کرنی تھی۔ سو کر لی۔ اب حشمت کے لاکھ اصرار پر بھی شکیلہ کی ماں شادی پر تیار نہ ہو رہی تھی۔ چند دنوں بعد ایک انوکھا واقعہ پیش آیا۔ شبنم کی ماں نے شبنم کی شادی حشمت سے کرانے کے لئے شکیلہ کو سامنے کیا۔ جس نے اپنی محبت کے واسطے دیتے ہوئے حشمت سے التجا کی کہ وہ اپنی محبت کو قربان کر دے اور اس کی طلاق یافتہ بہن کا گھر بسا دے۔ اس مرتبہ زہر کھا کر مر جانے کی دھمکی شکیلہ نے دی۔ حشمت اپنے ہی بنائے ہوئے جال میں پھنس گیا۔ شبنم اور حشمت کی شادی والے دن پروفیسر حیدر اپنے کمرے میں تالا لگا کر کئی روز گھر سے باہر رہے۔ مریم راجپوت نے اپنے چھوٹے بھائی کی شادی پر آنا مناسب نہ سمجھا۔ بنک کے چند دوستوں اور قاضی صاحب نے یہ انوکھی شادی دیکھی اور نبھائی۔ "پروفیسروں کی اولاد" کیسے تباہ و برباد ہو رہی ہے سب خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔ پھر کشمیری محلے کے لوگوں نے دیکھا کہ پروفیسر حیدر علی راجپوت۔ ایم اے انگریزی (گولڈ میڈل)، ایم اے فلسفہ (گولڈ میڈل) کی مطلقہ شبنم راجپوت پہلے بھائی کے کمرے میں دلہن بننے کے بعد اب دوسرے بھائی کے کمرے میں دلہن بن کر آئی۔ ڈاکٹر تبسم کبھی کبھی مریم راجپوت سے ملنے جاتی تو اپنی اور پروفیسر حیدر کی شادی کی بات کرتی۔ مریم کو اپنے عزیز ترین بھائی کی ذہنی حالت کا اندازہ تھا۔ اور ڈاکٹر تبسم کے سوال "اب تو پروفیسر کا کوئی مسئلہ نہیں۔ میری شادی کرا دیجئے" کے جواب میں "جو اللہ کو منظور" کہہ کر ٹال دیتی۔ اُدھر مرے کالج میں پروفیسر کے شاگرد۔ اپنی اپنی نوٹس بک لے کر گھنٹوں انتظار کرتے رہتے۔ اور آٹھ بجے روزانہ پہنچنے والا استاد۔ آٹھ آٹھ دن کالج نہ آ رہا تھا۔ کچھ تھا جو اندر ہی اندر سے اُسے کھائے جا رہا

تھا۔ کانٹ۔رسل۔ نطشے۔شیکسپئر۔گوئٹے۔شوپن ہائر۔ ٹالسٹائی۔ مولییاں۔ برگساں۔ برجس۔رومی۔اقبال اور فرائڈ کو سمجھنے والا۔ پروفیسر حیدر علی راجپوت۔اپنی بیوی کو اپنی بھابی کے روپ میں دیکھ کر حالات سمجھنے سے قاصر تھا۔

جس دن پروفیسر حیدر کی موت کی خبر شرف الدین صدیقی کے گھر پہنچی تو محلے کے لوگوں نے زندگی میں پہلی مرتبہ مریم علی راجپوت کو برقع پہنے بغیر۔ ننگے پاؤں۔پاگلوں کی طرح چیختے ہوئے۔کشمیری محلے کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھا۔سدرہ اور ولید ماں کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ماں کا برقع سدرہ کے ہاتھ میں۔اور ماموں کو واپس کرنے والی کتاب ولید کے ہاتھ میں۔! مریم اپنے جوان بھائی کی موت پر کم اور اُسکی "بے بسی کی موت" پر زیادہ روتی تھی۔

حیدر راجپوت کی خودکشی یا موت اُسی کمرے میں واقع ہوئی جہاں وہ پیدا ہوا تھا۔ تفصیلات بہت بعد میں سامنے آئیں۔ایک ماہ تک کمرے پر تالا دیکھ کر گھر والے سمجھے کہ پروفیسر کہیں جنگلوں میں تتلیاں جمع کرنے گیا ہوگا۔لیکن جب گوشت سڑنے کی بُو سارے گھر میں پھیلنے لگی تو تالا توڑا گیا۔سامنے فلسفے اور ادب کا پیکر زمین پر لیٹا تھا۔کونے میں بے شمار۔چھوٹے چھوٹے شیشوں میں دنیا جہان کی تتلیاں اپنے رنگوں سمیت قید تھیں۔ پروفیسر کے سرہانے methyl alcohol کی دو شیشے کی خالی بوتلیں پڑی تھیں۔اپنے کمرے میں باہر سے تالا لگا کر وہ بیٹھک کے راستے ایک ملحقہ کمرہ میں گیا ہوگا۔جس کا دروازہ کھول کر وہ واپس اپنے کمرے میں داخل ہوا۔کمرے کو اندر سے چٹخنی لگائی اور دروازے کے سامنے فلسفے، انگریزی ادب،آرٹ اور ادب کی سینکڑوں کتابوں کا ڈھیر ایستادہ کیا۔ جیسے اُسے چٹخنی کی مضبوطی پر شک ہو۔اپنے کمرے میں بکھری ساری تتلیوں کو ایک ترتیب کے ساتھ کونے میں سجا کر۔ڈاکٹر تبسم کی دی ہوئی شال فرش پر بچھا کر۔میتھی لیٹڈ سپرٹ پینے لگا۔کوئی نہیں جانتا وہ کتنی دیر۔کتنے گھنٹے زندہ رہا۔ کسی قسم کا خط۔نوٹ۔نشانی۔کچھ نہیں تھا۔جس سے مرنے والے کے آخری لمحات اور سوچوں کا اندازہ لگایا جا سکتا۔کوئی سراغ نہیں تھا کہ خبر ہو سکے کہ اتنا تعلیم یافتہ۔ذہین شخص۔بھری جوانی میں۔یوں اچانک اتنے سکون۔اتنے اطمینان اور اتنی خاموشی سے کیوں چلا گیا؟ ملحقہ کمرے کا دروازہ۔ تالے والے دروازے کے ساتھ بیک وقت توڑا گیا۔چیخ و پکار۔ بوٹوں کی دھمک۔رونے کی آوازیں۔"پولیس کو بلاؤ"۔"ھائے وے پروفیسرا۔ایہہ کیہہ کتا ای"" کتنی

Mr. Zaheer Abass Rustmani

CS CamScanner

بُو ہے اِس کمرے میں" "بہتا پڑھ پڑھ کے وی بندہ پاگل ہو جاندا اے" "بچوں کو دور رکھیں" کام کرنے والی ماسی پانی کی ٹنکی کے ساتھ ٹکریں مار رہی تھیں۔ ایک عجیب شور تھا۔ "کیا ہوا" "اتنی خاموشی سے کیوں" "حشمت کدھر ہے" "کوئی خط تو چھوڑا ہوگا" "میرے حیدر۔ میرے بھائی۔ میرے خدا۔" یہ آواز مریم راجپوت کی تھی۔! چاروں طرف شور اور گوشت سے اُٹھنے والی بُو میں پروفیسر وراثت علی راجپوت۔ پی ایچ ڈی کی کوٹھی ایک عجیب منظر پیش کر رہی تھی۔ ایک شور ولید کے دل و دماغ میں بھی اُٹھ رہا تھا۔ "چلتے پھرتے پوری سائنیٹ۔ آسان لفظوں میں سمجھانے والا۔ ماموں حیدر۔ اور اِس طرح مرنا۔! اِن تتلیوں اور کتابوں کا کیا ہوگا؟ ماموں نے اِس کا کوئی اشارہ مجھے بھی نہ دیا۔ کتنی خاموشی۔ کتنے سکون۔ اور کتنے اطمینان کے ساتھ۔ یہ کتنا سیاہ دن ہے۔ جولیس سیزر۔senseless death۔"

ولید نے کتاب۔ اپنے ماموں حیدر کے بائیں طرف جھکے شانے کے پاس رکھی۔ اور سوچنے لگا۔ کہ ڈھیر ساری تتلیوں اور بے شمار کتابوں کی موت واقع ہوگئی ہے یا ماموں حیدر لوٹ کے کبھی واپس نہ آنے والی کسی ہجرت پر روانہ ہو گئے ہیں۔

ﷲﷲﷲ

CamScanner

◎

ولید کو طلحہ نے اپنی ڈائری پڑھنے کے لئے دی اور کہا کہ دیکھو۔ کوئی کہانی لکھی جا سکتی ہے کہ نہیں۔ باقی لوگوں کی طرح طلحہ کو بھی اپنے اس بھائی کی لیاقت کا خوب اندازہ تھا۔ جو طبعیات اور ریاضی کے مضامین میں سب سے آگے ہونے کے ساتھ ساتھ ادب اور شاعری میں بھی اپنا ایک خاص مزاج رکھتا تھا۔ ولید شاعری سمجھتا تھا۔ لیکن کہانیوں اور شاعری سے جلدی اکتا جاتا تھا۔ اُس کا خیال تھا کی شاعری انسان کو اپنے بنیادی مقاصد کی تلاش کے راستوں سے دور کر دیتی ہے۔ انسان تھوڑے میں بھی خوش ہو جاتا ہے۔ ولید تکمیل۔ مکمل مات۔ مکمل جیت۔ اور مکمل سکون کی تلاش میں تھا۔ یہ شام اُس نے اپنے بڑے بھائی کے لئے وقف کر دی۔ جو اخبار یا کسی رسالے میں اپنی کوئی کہانی چھپوانا چاہتا تھا۔!

" گرمی آتی تو محلے میں لگے اکلوتے نلکے کے آگے بالٹیوں اور مٹکوں کی ایک قطار لگ جاتی۔ گھروں میں محدود پانی آتا تھا۔ جسے ٹنکیوں میں اگلے دن کے لئے محفوظ کر لیا جاتا تھا۔ پانی کی دھار اتنی باریک ہوتی کہ نلکا گھنٹوں چلتا رہتا اور شام تک صحن کی ٹنکی نہ بھرتی۔ محلے کے نلکے سے بالٹیاں بھرنے کی ڈیوٹی میری اور حمزہ کی تھی۔ ہم دونوں بھائی یہ ڈیوٹی تقریباً روز نبھاتے تھے۔ جتنی دیر میں پانچ بالٹیاں بھرتی ہیں۔ کسی اچھی کتاب کے پانچ باب پڑھے جا سکتے تھے۔ لیکن ڈیوٹی تو ڈیوٹی ہوتی ہے۔ اور پانی بھی شام سے پہلے بھرنا ہوتا تھا۔ کیونکہ قاری صاحب قرآن پڑھانے کے لئے مغرب کے بعد آتے تھے۔ گرمیوں میں ابا جی کے ساتھ۔ حمزہ اور مَیں "" نالہ ایک " پر نہانے اور مچھلیاں پکڑنے جاتے۔ حمزہ دو مرتبہ گیا۔ اور دونوں مرتبہ ٹائیفائڈ ساتھ لایا۔ پانی کا خوف اُسکے دل میں بیٹھ گیا ہے۔ اسی لئے اُس نے ابھی تک تیرنا نہیں سیکھا۔ سردی آتی تو ماں کو کئی فکریں لگ جاتیں۔ گرم کپڑے مہنگے ہوتے اور بچوں کو پچھلی سردیوں کے سوئیٹر اور کوٹ پہننا اچھا نہ لگتا۔ ابا جی۔ جن کے پاس ایک گرم اور ایک سرد سوٹ تھا۔ کئی برس کوئی نیا لباس

CamScanner

نہ خرید سکے۔ لگے بندھے۔ حلال کی کمائی کے پیسے۔ فیسوں۔ دوائیوں اور روزمرہ کی ضروریات میں پورے ہو جاتے۔ ایک پتلے سے سوئیٹر کو پہن کر سکول جاتے۔ کوئی پوچھتا تو ہم کہتے "ہمیں سردی نہیں لگتی" کئی بار تو شدید سردی سے ہاتھ پھٹ جاتے۔ لیکن جہاں کوٹ اور سوئیٹر خریدنے کی استطاعت نہ ہو وہاں دستانے کون خرید کر دیتا۔ باہر سے زیادہ سردی گھر کے اندر ہوتی۔ گیس کے ہیٹر مہنگے تھے۔ گھر میں صرف ایک کیروسین کا چولہا تھا۔ جس کے گرد بیٹھ کر۔ کبھی کبھار۔ ہاتھ سینکنے کا موقع مل جاتا تھا۔ دھوپ نکل آتی تو سب خوش ہوتے۔ اور پھر اباجی کے ساتھ چارپائی پر بیٹھ کر کینو کھانے کا بہت مزہ آتا۔ ماں پکوڑے تلتیں اور پھر چائے کا دور چلتا۔!

سردی شروع ہونے سے پہلے سدرہ اُون کے گولے اکٹھے کرنا شروع کر دیتی۔ اُون سلائیوں سے الٹے سیدھے گھر بناتی۔ اور سردیوں کے وسط تک میرے یا حمزہ کیلئے ایک سوئیٹر بُن لیتی۔ اُس دن اباجی سدرہ کو بہت پیار کرتے۔ "میری سُگھڑ بیٹی۔ دیکھنا ایک دن یہ کسی گھر میں راج کرے گی" اور سدرہ۔ ماں کے سینے سے لگ کر کسی گھر میں راج کرنے کے تصور میں آنکھیں موند کر ماں کے دل میں گھس کر بیٹھ جانا چاہتی۔

ہمارے گھر میں رہنے والے۔ سارے کے سارے۔ عام لوگ تھے۔ سیدھے سادے۔ علم و فکر۔ دانش و بینش اور فلسفہ ہائے زندگی میں ڈوبے۔ سچ کی ڈور تھامے۔ مشکلوں سے نبرد آزما۔ روشن مستقبل کے خواب دلوں میں بسائے۔ باہر کی دنیا کے جھوٹ۔ آزار۔ بے اطمینانی سے لاتعلق۔ اپنی دنیا میں مگن۔! اباجی۔ "حلال کے نوالے" پر بہت زور دیتے۔ اُن کو ایمان کی حد تک یقین تھا کہ نیکی قوت ہوتی ہے۔ اور نیک اور صالح اولاد دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہوتی ہے۔

ماں کو ابھی سے سدرہ کی شادی کی فکر لگ گئی تھی۔ "میری handle with care بیٹی۔ اسکی شادی تو نہائت دیکھ بھال سے کروں گی"۔ اور سدرہ نہائت اطمینان سے جواب دیتی۔ "میَں بڑی ہوں۔ چھوٹوں کی شادی کرا کے شادی کراؤں گی" اُسے ہمارے معاشرے میں لڑکیوں کی شادی ایک مسئلہ ہونا۔ اچھی طرح معلوم تھا۔ اُسے خبر تھی کہ سڑک سے رات کے وقت گذرنے والی دس لڑکیاں بھی "اکیلی" ہوتی ہیں اور ایک اکیلا لڑکا۔ "اکیلا" نہیں ہوتا۔

سدرہ کو کیلنڈر جمع کرنے اور مختلف تاریخوں کو مارک کر کے۔ دو تین الفاظ میں کچھ لکھ

دینے کا شوق تھا۔ اس طرح اُسے یاد رہتا کہ کس دن کیا خاص بات ہوئی تھی۔ اُسے میری طرح ڈائری لکھنے کا شوق نہیں۔ وہ کہتی ہے کوڈائری کوئی بھی۔ کسی بھی وقت پڑھ سکتا ہے۔ اور یوں آپ کا راز۔ راز نہیں رہتا۔ گھر میں کسی کو یاد نہ آرہا ہو کہ کس تاریخ کوکون گھر میں آ کے کیا کہہ کے گیا تھا۔ تو سدرہ اپنے "مشہور و معروف" کیلنڈر نکالتی۔ اور بڑے یقین کے ساتھ اُس دن کا پورا احاطہ کر کے بتا دیتی یوں ان کیلنڈروں میں سدرہ کی ساری یادیں محفوظ تھیں۔ جنہیں وہ نہائت احتیاط اور اہتمام سے اپنی الماری میں رکھتی اور کبھی اداس ہونے پر ان کیلنڈروں کے دروازے آسمان کی طرف کھول دیتی۔ یادوں کی بے شمار رنگین تتلیاں، جگنو، پرندے۔ سدرہ کے چاروں طرف رقص کرنے لگتے۔ اور ساری فضا کئی اقسام کی خوشبوؤں سے معطر ہو جاتی۔ کیلنڈر کی تاریخیں۔ کیمرہ بن جاتیں۔ اور اُن پر لکھی مختصر تحریریں۔ تصویروں کا روپ دھار لیتیں۔! ہر سال کے آغاز میں سدرہ اپنی "تصویروں کی البم" دیکھتی۔ اور یوں سال بھر کی دستاویزی فلم۔ چند لمحوں میں دیکھ کر۔ خوش ہوتی۔ جیسے مہینوں۔ ہفتوں اور دنوں کو قید کر لیا ہے۔ جیسے وقت پر دسترس حاصل ہو گئی ہے۔ جیسے خوشبو کے مرتبانوں میں کچھ سرد گیت انڈیل کر۔ چلچلاتی دھوپ کی چمک۔ ایک کیمیائی عمل سے خود پیدا کی گئی ہے۔ وہ چمک جو آئندہ آنے والی سردیوں میں۔ کچھ لمحوں کے لئے ہی سہی۔ کسی موٹے اون کے گرم سوئیٹر کا لمس مہیا کرے گی۔!!

"چار دن پہلے ابا جی نے غالبؔ کا یہ شعر سنا کہ خوشخبری سنائی کہ کچھ دنوں بعد ہمارے گھر میں ٹیلی ویژن آنے والا ہے:

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
پردہ چھوڑا ہے وہ اُس نے کہ اٹھائے نہ بنے

سدرہ اور حمزہ کے ساتھ مَیں نے گھنٹوں گھر کے مختلف کونے تلاش کئے جہاں ٹی وی رکھا جا سکتا تھا۔ ولید کے چھوٹے سے پلنگنے کو اگر ہٹا دیا جائے۔ تو یہ جگہ مناسب رہے گی۔ ماں نے یہ بات سنی ان سنی کر دی۔ اور ٹی وی بیٹھک میں۔ ریڈیو کے ساتھ نکا دیا گیا۔

ٹی وی کا گھر آنا۔ اور اُن تمام پروگراموں کو گھر بیٹھے دیکھ سکنا۔ جو دوستوں سے سُن رکھے تھے۔ ایک عجیب خوشی۔ حیرت۔ اور anxiety تھی۔ یعنی "Star Trek" - "The" Avengers اور "الف اور نون" "ہم" اپنے گھر میں "دیکھ سکیں گے۔ ماں کو جب یہ معلوم ہوا کہ

نوکری میں ملنے والا نیا بونس۔ ابا جی نے ٹی وی خریدنے پر خرچ کر دیا ہے تو اُسے ہم بچوں کی "حیران کن حیرت" میں کوئی دلچسپی نہ رہی۔ "کوئی کام کی چیز خریدتے سدرہ کے لئے" کے جواب میں ابا جی نے کہا "چھڈو بادشاہو۔ زندگی مانگو۔ زندگی رہی تو سدرہ کی شادی دھوم دھام سے کریں گے۔ ایک ہی تو بیٹی ہے اپنی۔ ٹی وی میں کچھ تعلیمی اور ادبی پروگرام بھی آتے ہیں"۔ ابا جی بہت خوش ہوتے تو "چھڈو بادشاہو" یا "رہن دیو سرکار" جیسے پنجابی expressions اپنی صاف اور شستہ اردو میں ملا کر بات کرتے۔ ماں اور ابا جی۔ دونوں پنجابی گھرانوں سے تھے۔ لیکن گھر میں ہم اردو یا انگریزی بولتے تھے۔ گھر سے باہر محلے میں۔ یا پھر سکول اور سکول سے باہر۔ ہر طرف۔ سیالکوٹ میں پنجابی بولی جاتی تھی۔ یوں ہم بہن بھائیوں کی پنجابی۔ اردو اور انگریزی۔ ایک ساتھ پروان چڑھیں۔

ماں نے ابا جی کو کبھی پروفیسر وراثت علی راجپوت کی کوٹھی یا اُن کی مورس گاڑی نہ جتائی تھی۔ وہی مورس۔ جس میں بیٹھ کے وہ۔ ڈرائیور کے ساتھ۔ کالج جاتی تھیں۔ ابا جی تسلی دیتے "یہ بچے۔ تماری چار کاریں ہیں۔ چار مکان ہیں۔ جو تعلیم و تربیت ہم ان کو دے رہے ہیں۔ دیکھنا ایک دن تمہیں یہ سونے میں تول دیں گے"

اُس دن گھر کی بیٹھک میں ایک سوٹڈ بوٹڈ مہمان کے سامنے۔ ابا جی نے ہم تینوں بھائیوں کو لائین لگا کر کھڑا کر دیا۔ مہمان جس کُرسی پر بیٹھا تھا۔ اسکے ساتھ ہی ایک مناسب سائز کا تھیلہ پڑا تھا۔ جس کا منہ ایک ریشمی تار سے بند کیا گیا تھا۔ سدرہ مہمان کے لئے چائے بنا رہی تھی۔ ابا جی نے ہم تینوں کے نام۔ کس کس جماعت میں پڑھتے ہیں۔ کیا ریزلٹ آتا ہے۔ بتا کر مہماں سے کہا "یہ میرے تین بیٹے۔ میرے تین مکان ہیں۔ اور۔ اب آپ جا سکتے ہیں"۔ مہمان نے خموشی سے اپنی تھیلا اٹھایا اور ولید کے سر پر ہاتھ پھیر کر بیٹھک سے نکل گیا۔

"حمزہ۔ چائے لے جاؤ" لیکن سدرہ کی چائے پینے والا مہمان تو جا چکا تھا۔ رات کے کھانے پر ابا جی نے ماں کو قصہ سنایا تو سمجھ میں آیا کہ وہ تھیلہ اور مہمان کیا معمہ تھے؟ مہمان اپنے ساتھ ایک فائل لایا تھا۔ اور تھیلے میں بھری روپوں کی گڈیوں کو رشوت کے طور پر دے کر۔ ابا جی کے دستخط چاہتا تھا۔ مہمان کے مطابق کرائے کے مکان میں رہنے سے اچھا نہ تھا کہ ہمارے پاس اپنا گھر ہوتا۔ اور یوں۔ جواباً۔ ابا جی نے۔ مہمان کے سامنے گھروں اور مکانوں کی لائن کھڑی

کردی۔ ماں نے واقعہ سُنا اور کھانے کے برتن اٹھاتے ہوئے ہم سب سے کہا" اباجی نے ٹھیک کیا۔ ہمیں حرام کی کمائی سے مکان نہیں بنانا۔ راستہ مشکل ہے۔ لیکن جیت ہمیشہ سچ اور حلال کی ہوتی ہے" اباجی۔ سیٹلمنٹ کے دفتر میں ایک اعلیٰ افسر تھے۔ روز کئی مکان دوسروں کے نام الاٹ کرتے تھے۔ اُن کے نیچے کام کرنے والوں کے پاس کئی کئی مکان تھے۔ لیکن ہم سب ایک کرائے کے گھر میں رہتے تھے۔

"ماں مجھے بچھو نے کاٹ لیا"۔ صحن سے یہ آواز سدرہ کی تھی۔ ماں اپنے دوپٹے کے زمین پر گرنے سے بے خبر دیوانہ وار صحن کی طرف بھاگی۔ جتنی دیر میں حمزہ یا میں وہاں پہنچتے۔ ماں سدرہ کی پنڈلی سے چمٹا بچھو۔ اپنے ہاتھ سے کھینچ کر پرے پھینک چکی تھی۔ تھوڑی دیر بعد سدرہ کا دوپٹہ اُسکی ٹانگ پر کس کے باندھا جا چکا تھا۔ اور وہ بے چارہ بچھو۔ حمزہ کے جوتوں کے تابڑتوڑ حملوں سے صحن کے فرش سے چپک کر اپنی شکل وصورت اور ہیت۔ سب کھو چکا تھا۔

"بچوں کی بہادر ماں"۔ اباجی بہت خوش تھے۔

"تمہیں ڈر نہیں لگا" اباجی نے سدرہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ماں سے پوچھا۔

"مجھے کچھ ہوش ہی نہیں تھا" ماں نے اپنا ماں ہونا ثابت کردیا

"کیا سوچا تم نے"؟

"یہی۔ کہ میری بچی کی ٹانگ پر بچھو چمٹا ہے۔ اور۔۔۔۔۔" ماں کو واقعی نہیں خبر تھی کہ اُس "بے مثال بہادری" کے اصل محرکات کیا تھے؟ اباجی اور ماں کی سوچوں میں یہ بھی ایک بنیادی فرق تھا۔ اباجی سوچتے تھے' ماں محسوس کرتی تھی۔ "سوچنا" اور "محسوس کرنا" ریل کی پٹڑی کی طرح ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کے آس پاس لیکن جدا جدا راستے۔ مقصد دونوں کا۔ ریل کا بوجھ ڈھونا۔ یعنی زندگی کرنا ہی ہوتا ہے۔ اباجی جاننا چاہتے تھے کہ زہریلے بچھو کو ہاتھ میں دبوچ کر پھینکنے کے عمل سے گذرتے ہوئے ماں نے کیا سوچا؟ اور ماں۔! ماں تو اپنی بچی کو مصیبت میں دیکھ کر دنیا و مافیہا بھول چکی تھی۔ اُسے اِس آفاقی محبت کے عمل سے گذرتے ہوئے سوچنے اور سمجھنے کی فرصت ہی کہاں تھی۔؟"

ڈائری ایک طرف رکھ کے ولید نے بڑے بھائی کو آواز دی۔

"کہانی کا موحول بن سکتا ہے۔ لیکن اِن صفحات سے ناموں کو جدا کرنا پڑے گا۔ اور

CamScanner

تھوڑا سا جھوٹ کہیں سے شامل کرنا پڑے گا" ولید نے مختصراً اپنی رائے دی" کیسے؟ جھوٹ کیسے شامل کیا جائے" طلحہ نے حیرانی سے پوچھا۔ گھر میں سچائی کی اتنی مضبوط فضا تھی۔ کہ طلحہ۔ کہانی کی حد تک بھی۔ جھوٹ شامل کرنے سے قاصر نظر آ رہا تھا۔

" کہانی لکھنے والا۔ اپنے ماحول کی عکاسی کرتا ہے۔ لیکن وہی عکاسی اگر ویسے ہی لکھ دے گا تو کہانی۔ سچی کہانی لگے گی۔ سچی کہانیاں بھی کہیں کہیں سے جھوٹ سے ملی ہوتی ہیں"

"تو سچی کہانیاں ہی لکھ لیتے ہیں"

"ہاں۔ کوئی حرج نہیں۔ لیکن۔ میرے خیال میں سچی کہانیاں بھی لکھنے کے لئے۔ ڈائری سے جان چھڑانی پڑے گی۔ ہٹ کے سوچنا پڑے گا۔ اور میں تو یوں بول رہا ہوں۔ جیسے بہت بڑا لکھاری یا نقاد ہوں۔ میرا خیال ہے عارف کو بھی دکھا دو۔ آج کل ادب و شاعری کا اُس نے خوب مطالعہ شروع کر رکھا ہے"

کتابوں۔ ماموں حیدر اور ماں کے علاوہ۔ ولید کا ایک دوست تھا۔ عارف۔ اُس سے عمر میں دو ایک سال بڑا۔ ساتھ والے محلے میں۔ ستار قصائی کا اکلوتا بیٹا۔! عارف کا باپ ولید کو اپنا "دوسرا بیٹا" کہا کرتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ دو جماعتیں آگے ہونے کے باوجود۔ عارف انگریزی اور ریاضی۔ ولید سے ہی پڑھتا تھا۔ اور پھر ولید کے علمی گھرانے کی اُس علاقے میں بہت عزت تھی۔ ولید کبھی ستار قصائی کی دکان پر عارف کے ساتھ چلا جاتا تو دودھ جلیبیوں سے دونوں کی خاطر ہوتی۔ کئی بار عارف کے باپ نے ولید کو "جانور" ذبح کرنے سے لے کر "بوٹیاں" بنانے تک کا عمل بتایا۔ ہر مرتبہ وہ یہ "سبق" سنا کر ہنستا "تم نے اور عارف نے یہ سب نہیں کرنا۔ پھر بھی تم دونوں کہ یہ بتاتا ہوں مجھے اِس کے علاوہ کچھ اور آتا ہی نہیں"۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ کبھی کبھی بے دھیانی میں وہ کوئی ایسی بات کر جاتا تھا جو ولید کو ابا جی اور ماں کے اقوال زریں جیسی لگتی تھیں۔ "پُتر۔ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ کوئی کام کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ پھر بھی کرنا پڑتا ہے۔ جیسے چھری چلاتے ہوئے اکثر مجھے بکرے کی آنکھوں میں خوف دیکھ کر خیال آتا ہے۔ جاندار ہے۔ زندہ ہے۔ مر جائے گا۔ لیکن روزی روٹی کا خیال آ جاتا ہے اور اللہ رسول کا نام لے کر چھری پھیر دیتا ہوں"۔!

عارف اور ولید کی شامیں اکثر ساتھ گذرتیں۔ کبھی ایک گھر میں وہ اکٹھے ٹی وی دیکھتے۔

CamScanner

یہاں سے آگے

اور دوسرے گھر میں کتابوں اور مستقبل کی باتیں ہوتیں۔ عارف۔ ولید کے بہن بھائیوں۔ ابا جی۔ ماں اور اِس گھرانے کا علم اور لیاقت دیکھتا تو اپنے گھر سے موازنہ ضرور کرتا۔ ولید سے کبھی کبھی یہ بھی کہہ دیتا "ایسا بھی ہو سکتا تھا کہ تم اور میں۔ ماں کو ماں کہتے۔ اور ابا جی کو ابا جی۔ سدرہ باجی ہم دونوں کی حقیقی بہن ہوتی۔ اور ہم اصل میں بھائی بھائی ہوتے"۔ پھر جلد ہی حقیقت میں لوٹ آتا تو چہرے پر ایک گہری سنجیدگی لا کر کہتا "میں اپنے بچوں کو ایک تعلیم یافتہ باپ اور ایک تعلیم یافتہ ماں دوں گا۔ بالکل خالہ مریم جیسی "ولید۔ کچھ مزید سنجیدگی سے کہتا "بُرا وقت آئے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ اچھا وقت آنے والا ہے۔ وقت ایک سا کبھی نہیں رہتا"۔

◎

گرمیوں کی شاموں سے راتوں تک بہت فاصلہ ہوتا ہے۔ کالج پارک کی بڑی سی گراؤنڈ پر ولید اور عارف۔ شاموں کو راتوں میں بدلتے دیکھنے کے لئے چلے جاتے۔ پڑھائی سے ساتھ والے محلے کی لڑکیوں۔ کتابوں سے مستقبل کے خوابوں تک۔ وہ کئی کئی گھنٹے خالی سیڑھیوں پر بیٹھے باتیں کرتے رہتے۔ سیاست، کاروبار، فلسفہ، آرٹ، شاعری، sputnik، امریکہ، چین، چے گیوارا، احمد بن بیلا اور نجانے کن کن موضوعات پر دونوں دوست گفتگو کرتے۔ عارف نے نئی نئی شاعری شروع کی تھی۔ وہ ولید کو عروض' غزل' نظم' راشد' غالب' یگانہ' مجاز یا پھر اپنی نئی غزل یا نظم پر تفصیل سے بتاتا۔ ولید میں سخن فہمی زیادہ تھی۔ لیکن شاعری کے بارے میں اُس کے خیالات ذرا مختلف تھے۔ اُسے شاعری میں مبالغہ نظر آتا تھا۔ جو اُسے اباجی کی دیانت داری اور ماں کی بے پناہ محبت میں بھی نظر آتا تھا۔ ولید کے خیال میں حد سے آگے کی سوچ فکری نہج سے زیادہ حقیقی راستے پر چلنی چاہیئے۔ حقیقت کے پتھر بھاری ہوتے ہیں۔ اِسی لئے ضرب بھی کاری لگتی ہے۔ یہ پتھر تیقن کے ساتھ اٹھانے کی راہ میں شاعری رکاوٹ بن سکتی ہے۔ لیکن ولید نے عارف کی شاعری پر کبھی اعتراض نہیں کیا تھا۔ اُسے دوست زیادہ عزیز تھا۔ وہ دوست کو غالب کی طرح "ناصح" کی شکل میں نہیں۔ بلکہ "چارہ ساز" اور "غمگسار" کی شکل میں دیکھتا تھا۔

"کیا خیال ہے۔ سی ایس ایس کا امتحان نہ دیا جائے۔ اِدھر تم نے بی اے کیا اور اُدھر تم نے امتحان دیا۔ سیدھے ڈپٹی کمشنر بنو گے"۔ عارف نے شاعری پر بات کرتے کرتے اچانک سوال کیا "ڈی سی۔ مَیں کیا کروں گا ڈپٹی کمشنر بن کے۔ مجھے تو ڈی سی جانا ہے۔ واشنگٹن ڈی سی۔" ولید نے آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "مَیں تو ضرور یہ امتحان دوں گا۔ ڈی سی شہر کا بادشاہ ہوتا ہے۔ راج کروں گا۔ اور اپنے باپ کے سارے خواب پورے کروں گا۔ اُس نے بکرے ذبح کرتے ہوئے بیٹے کو بادشاہ بنانے کے خواب دیکھ رکھے ہیں"۔

"تم ہی کرنا نوکری۔ مجھے نوکری نہیں کرنی۔ اپنا کوئی کام کروں گا۔ نوکری میں لگے بندھے پیسے ہوتے ہیں۔ میرے جتنے خواب ہیں۔ اُن کو پورا کرنے کے لئے بہت سا پیسہ چاہیئے۔ بارسلونا جانا ہے۔ پکاسو کا گھر دیکھنا ہے۔ Figures جانا ہے۔ سلوا دور والی کا گھر دیکھنا ہے۔ امریکہ جانا ہے۔ اپنی ریاضی اور فزکس کو آزمانا ہے۔ ابا جی کو جہاز کا سفر کرانا ہے۔ ماں کو حج کرانا ہے۔ اُس کے نام کا ٹرسٹ بنانا ہے۔ اور۔ اور "

"اور تمہارے خیال میں یہ سارے خواب تم پورے کرسکو گے"۔

"حیدر ماموں کے دوست کو سپین جا کر ملنا ہے۔ بنگلہ دیش جانا ہے۔ اپنی تاریخ کھنگالنی ہے۔ جڑیں تلاش کرنی ہیں۔ دہلی جانا ہے۔ امیر خسرو اور غالب والی گلی دیکھنی ہے۔"

"تم نے میرا سوال شائد سنا نہیں"

"سنا ہے۔ لیکن میرے پاس اِسکا جواب نہیں۔ کم از کم۔ اِس وقت نہیں۔ ابھی تو پڑھائی مکمل کرنے کے لئے ابا جی سے فیس کے پیسے لینے پڑتے ہیں۔"

"میری مانو۔ تم بھی مقابلے کا امتحان۔۔۔۔۔"

"چھوڑو یار۔ مجھے جہاز کا سفر نہیں کرنا۔ مَیں نے جہاز خریدنے ہیں۔ تم کرنا یہ نوکری دوکری۔ اور ہاں۔ تم نے بتایا تھا لاہور میں تمہارے تایا رہتے ہیں۔؟"

" کب جا رہے ہو لاہور؟ تایا کو بتا دوں گا۔ بتانا کیا ہے۔ تمہارے ساتھ لاہور تک تو جا ہی سکتا ہوں۔ امریکہ شائد تمہیں اکیلے جانا پڑے"۔

"امریکہ۔ اگر زندگی رہی۔ تو تمہیں بُلا کر۔ دکھاؤں گا۔ پھراؤں گا۔ فی الحال۔ لاہور اور اس کی مال روڈ کی بات کرتے ہیں۔ ماں نے کہا ہے پیسوں کا بندوبست ہو جائے گا۔ مَیں نے ہاسٹل میں رہنے اور فیسوں کی دو سالہ قیمت بتا دی ہے۔ ابا جی نے بھی ہاں کر دی ہے۔ حمزہ نے میرا پاسپورٹ بنوانے کا بندوبست شروع کرا دیا ہے"

''یہ پاسپورٹ مجھے امریکہ کے لئے چاہیئے "ولید نے اپنی دائیں ہتھیلی پر نظر جماتے ہوئے کہا۔

"ابھی تو گاؤں بھی نہیں بسا۔ ڈاکوا بھی سے؟"

"جو کام جتنی جلدی ہو جائے اچھا ہے۔ بنگلہ دیش' سری لنکا' ہندوستان وغیرہ کے

ویزے لگوالوں گا۔ سنا ہے کورے پاسپورٹ کو امریکی ایمبیسی والے دیکھتے بھی نہیں۔ پلاننگ کرنی پڑے گی"۔

"تم تو کہتے تھے کہ اپنے ملک سے بہت محبت کرتے ہو۔ تم واقعی امریکہ چلے جاؤ گے"

"میرے نبیؐ کو مکہ چھوڑنا پڑا تھا۔ اور جب وہ مدینے چلے گئے تو کیا مکہ کی محبت اور اہمیت اُن کے لئے ختم ہوگئی؟"

"تم سے بحث میں کوئی جیت سکا ہے"

"امریکہ تو ویسے بھی سوچ رکھا تھا جانے کا۔ میرے خیال میں سب سے مستحکم مستقبل اس ملک کا ہے۔ لیکن ماموں حیدر کی تتلیاں جب سے سمجھ آئی ہیں۔ امریکہ جانا لازمی لگنا شروع ہو گیا ہے"

"لیں جناب۔ آگئیں جنگل سے تتلیاں۔ پھر سے"

"تقریباً 28 ہزار اقسام کی تتلیاں ہیں دنیا بھر میں۔ 80 فیصد ٹراپکس میں رہتی ہیں۔ 700 سے زیادہ اقسام امریکہ اور کینیڈا میں پائی جاتی ہیں۔ پتوں کے اندر چھپ جاتی ہیں یا پتھروں کے بیچ میں۔ pygmy blue دنیا کی سب سے چھوٹی تتلی ہے۔ آدھے انچ کی یہ تتلی۔ اُس عظیم ملک میں پائی جاتی ہے۔ جہاں تمہارا دوست جانا چاہتا ہے۔ امریکہ۔!"

"لیکن ولید۔ میرے علم کے مطابق تتلیاں بہت جلد مر بھی جاتی ہیں"

"سب نہیں۔ کچھ تتلیوں کی عمر۔ جیسے Mourning cloak کی عمر 11 مہینے ہوتی ہے۔ اور سنو۔ یہاں بھی۔ یعنی انسانوں کی طرح۔ تتلیاں بھی!۔ مادہ تتلی کی عمر نر تتلی کی نسبت زیادہ ہوتی ہے"۔

"اس سے پہلے کہ عورت اور مرد کی وہ پرانی بحث شروع ہو۔ میرا خیال ہے۔ میرے لئے اتنی معلومات۔ آج کے لئے کافی ہیں"۔

"تو لاہور چلو گے مجھے چھوڑنے۔؟"

"بصد شوق۔ حضور والا۔ کورنش بجا کر غلام اطلاع دیتا ہے کہ شاہی سواری کے پیدل کی حیثیت سے خادم آپ کے جلو میں جانے کو اپنی زندگی کی سب سے بڑی۔۔۔۔"

"بس۔ آج کیلئے۔ واقعی۔ اتنی معلومات کافی ہیں"۔

CamScanner

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ دونوں دوستوں نے واپسی کی راہ لینے سے پہلے۔ زندگی میں ہمیشہ ساتھ رہنے کی کوئی بات کی۔ اور آدھے گھنٹے کے پیدل واپسی راستے کے بعد اپنے اپنے گھروں کے دروازوں پر پہنچ گئے۔ گھر پہنچنے پر حمزہ نے بتایا کہ ولید کا پاسپورٹ تیار ہو گیا تھا لیکن نام کے ہجے درست نہ ہونے کے باعث دوبارہ دفتر جانا پڑے گا۔

"what's in a name"۔ ولید نے کہا

"نام غلط ہو تو گڑبڑ ہو سکتی ہے۔ امیگریشن والے شیکسپیئر نہیں پڑھتے" حمزہ نے کہا اور تسلی دی کہ اگلے دن پاسپورٹ دفتر جا کر نام کے ہجے درست کرا دے گا۔

ﷻﷻﷻ

◎

لکڑی کے موٹے سے دروازے پر لگی زنگ آلود چٹخنی ہوا کے چلنے سے ادھر اُدھر ہوتی تو ایک خاص قسم کی آواز پیدا ہوتی۔ چٹخنی کے آخری حصے کے وزن سے دروازے کا کالا پینٹ کافی اکھڑ چکا تھا۔ پھر باہر آئے مہمانوں کے چٹخنی ہلانے سے دروازے پر ایک اور جگہ سے پینٹ بھی اکھڑ چکا تھا۔ دروازے کے نچلے حصے پر کسی بچے نے لکیریں کھینچی ہوئی تھیں۔ جیسے کوئی چڑیا درخت پر بٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔ دروازے سے اندر آئیں تو اُس دالان نما چھوٹے سے کمرے میں پلاسٹک کی تین کرسیاں۔ پلاسٹک کے ایک میز کے اردگرد بے ترتیبی سے پڑی تھیں۔ کرسیوں کا گلابی رنگ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ میلا ہونے کی وجہ سے ایک عجیب سی رنگت میں بدل چکا تھا۔ بتی جلانے والے بٹن سے بجلی کی تار آدھی ننگی صاف نظر آرہی تھی۔ چھت پر کئی مہینوں سے صفائی یا سفیدی نہ ہونے سے مکڑی کے جالے اور ایک جنگلی کبوتر کا گھونسلہ نما گھر تھا۔ دالان کے سیدھے ہاتھ دروازے سے نکلیں تو بیٹھک آتی تھی۔ جس میں ایک کالے چمڑے کا تین سیٹر۔ بینت کی چار پرانی کرسیاں۔ فرش پر بچھی پرانی دری اور کونے میں کارنس نما جگہ پر ایک پرانا ریڈیو۔ شرف الدین صدیقی کے اِس کرائے والے مکان کی کوئی پرانی یاد تازہ کرتا دکھائی دیتا تھا۔ دوسرے کونے میں لکڑی کے دو پٹوں سے بند ہونے والا ایک ٹی وی۔ اور ایک چھوٹی سی تپائی پر پڑی چائے کی ایک پیالی۔ جس کی پرچ کے کونے اکھڑے ہوئے تھے۔ بیٹھک سے سارے گھر میں گھوم کر واپس دالان آنے تک۔ چار کمرے اور۔ جن کی سفیدی بہت مدت سے نہیں ہوئی تھی۔ صحن میں پانی کی ٹنکی۔ جس کے آسمان کی طرف کھلے منہ پر کوئی ڈھکن نہیں تھا۔ ایک دیوار سے نکلتا ہوا نلکا اور پیتل کی ٹونٹی۔ جس سے بالٹی یا برتن رکھ کر پانی بھرا جاتا تھا۔ زنگ آلود ہو چکی تھی۔ صحن کے دائیں طرف باورچی خانہ اور ایک غسل خانہ۔ جس کے آگے تار میں پرویا ہوا ایک پردہ۔ اپنی نچلی سطح سے گیلا رہنے کے باعث بھربھرا گیا تھا۔ غسل خانے میں دو بالٹیاں۔ ایک نہانے

والا پلاسٹک کا برتن ۔ ایک پیتل کا لوٹا۔ اور کونے میں پڑی ایک صابن دانی میں لائف بوائے کا بچا ہوا ٹکڑا۔! باورچی خانے میں کیروسین کے ایک چولہے کے ساتھ "نعمت خانہ" جس کی جالی سے سوراخ اب بند ہو چکے تھے۔ چولہے کے سامنے رکھی پانچ چھوٹی چھوٹی پیڑھیاں۔ کونے میں رول کی ہوئی۔ دو چٹائیاں۔ اور ایک طرف چھوٹی بڑی دیگچیوں کی قطار کے ساتھ ایک بڑا سا پتیلہ۔!

باورچی خانے کے ساتھ سٹور روم میں دو بڑی پیٹیاں۔ لکڑی اور ٹین کے پندرہ سولہ صندوق۔ اندھیرا۔ اور ایک عجیب سی دھوئیں کی بُو لئے فضا۔ ایک کونے میں آٹے کا کنستر۔ جس کے ساتھ چاولوں کی ایک بوری جس میں کلو بھر چاول باقی تھے۔ دوسرے کونے میں دو چھوٹی صندوقچیاں۔ جن میں کنچے اور اخروٹ بھرے تھے۔ مریم علی راجپوت نے اپنے بچوں کے بچپن کی یادوں کو کہیں کونے میں سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔

دالان اور صحن کے ساتھ۔ بائیں طرف کوٹھے پر جاتی اٹھارہ سیڑھیاں۔ ایک ڈھارا۔ اور تکونی کوٹھے کے پہلے حصے میں چھوٹی سی دیوار کے ساتھ پرانی اینٹوں کے سات چھوٹے چھوٹے steps کے بعد ایک چوکور کھلا۔ چھوٹا سا علاقہ۔ جسے مُمٹی کہتے تھے۔ ساتھ والوں کی دیوار کے ساتھ جڑا تھا۔ مُمٹی پر پتنگوں کے ٹوٹے ہوئے تیلے۔ دو ایک ڈور کے الجھے ہوئے گچھے۔ اور ایک اینٹ کے ساتھ چپکی ہوئی لئی۔ بتا رہے تھے کہ یہاں پتنگ اڑائی ہوگی۔ مُمٹی کے ساتھ مضبوطی سے جڑا ہوا ٹی وی کا انٹینا۔ جس پر لاہور۔ اسلام آباد۔ کراچی کے علاوہ سری نگر اور امرتسر کے ٹی وی چینل بھی دیکھے گئے تھے۔ پتنگوں کے دو پرانے ڈھانچے اپنے ڈھانچے کے ساتھ جھولتے دیکھ رہا تھا۔

ڈھارے میں پڑی چھ چارپائیاں۔ ایک دوسرے کے اوپر یوں لدی پڑی تھیں جیسے لکن چھپن کھیلتے ہوئے سدرہ، طلحہ اور حمزہ چور کے پکڑنے جانے پر۔ ایک دوسرے کے اوپر گر جاتے تھے۔ گرمیوں میں یہ چارپائیاں کوٹھے کے ایک طرف ترتیب سے بچھائی جاتیں۔ اور کھلی۔ تازہ ہوا میں۔ آسمان پر تارے گنتے گنتے۔ سب گھر والے سو جایا کرتے۔ بارش آنے پر یہی چارپائیاں ڈھارے میں رکھ کے۔ سب سیڑھیوں کے ذریعے نیچے آتے اور جس کو جو جگہ ملتی۔ وہ وہیں چادر لے کر سو جاتا۔

سدرہ اپنے پانچ سال کے چھوٹے بیٹے کے ساتھ پورے گھر کا چکر لگا کر اپنے پرانے

کمرے کی الماری کے سامنے کھڑی۔ سامنے رکھے۔ چند کیلنڈر دیکھ رہی تھی۔ ماں کو چائے پلا دی تھی۔ بیٹے کو ناشتہ کرا دیا تھا۔ ولید ابھی سو کر نہیں اٹھا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کو اپنے بچپن کی باتیں سنا رہی تھی۔ ایسے جیسے اُسے ساری سمجھ آ رہی ہو۔!

وقت کتنی تیزی سے گذرتا ہے۔ 1965 کی جنگ کل کی بات لگتی ہے۔ جب دشمن کے کسی جہاز نے سیالکوٹ شہر کے قلعے پر بھی ایک بم پھینکا۔ ایک مدت تک اُس بم کی گونج قومی ترانوں کے سُروں میں کہیں گم نہ ہو سکی۔ مضبوط لوہے کے کچھ ٹکڑے شہریوں نے نشانی کے طور پر اپنے اپنے گھروں میں سجا لئے۔ بم کے یہ ٹکڑے ایک یاد کی طرح گھر کی فضا میں خاموشی سے رچے بسے رہتے۔ اور پھر کسی یاد کی طرح ہی وقت کی ندی میں کہیں اِدھر اُدھر بہہ نکلے۔

ایک بم شرف الدین صدیقی کے کرائے کے گھر میں عین صحن میں بھی گرا۔ اُس وقت جب ہسپتال سے آئی رپورٹ مریم علی راجپوت نے عام زبان میں ترجمہ کر کے اپنے بچوں کو سُنائی۔ "ابا جی کو کینسر ہے"۔۔۔۔۔!! اس بم کی کرچیاں گھر کے ہر فرد نے اپنی آنکھوں اور دلوں میں اترتی اور لہولہو ہوتی دیکھیں۔ باپ کی تسلّیاں۔ " کوئی فکر والی بات نہیں۔ علاج ممکن ہے"۔ ماں کے چہرے پر مستقل تفکرات۔ اور گھر میں ایک عجیب سی بے چینی نے بچوں کو اپنی عمر سے کئی برس بڑا کر دیا۔ بیٹوں نے باپ کا سہارا بننے کی خواہش کی۔ بیٹی نے دوائیوں کی فہرست اور اوقات کاغذ پر لکھنے شروع کر دیئے۔ ماں نے چاروں بچوں کے تاریک ہوتے مستقبل۔ پڑھائی۔ باورچی خانہ۔ بیٹی کی شادی۔ معاشرہ میں اکیلی عورت کا چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ زندگی گذارنا۔ ماں کے ساتھ باپ کا کردار بھی ادا کرنا۔ اور نجانے کیا کیا سوچنا شروع کر دیا۔ ہسپتال کی دوسری رپورٹ نے انجانے خوف کو یقین میں بدل دیا۔ بڑی آنت colon میں کینسر تھا۔

"دوائیوں سے علاج ہو جائے گا"

"نہیں آپریشن کرانا پڑے گا۔ colon کا ایک حصہ کاٹ کر پھینکنا ہوگا"

"خرچہ تو بہت ہوگا"

"ہاں۔ لیکن اللہ مالک ہے۔ کچھ نہ کچھ ہو جائے گا" بچے اپنے ماں باپ کی گفتگو سنتے۔ اور گھر کی اداسی مزید گھمبیر ہوتی چلی جاتی۔ "ابا جی کو کچھ ہو گیا تو۔؟" اور اس کے بعد سوچنے کی ہمت کسی میں نہ تھی۔ لاہور کے میو ہسپتال میں آپریشن کرایا گیا۔ ڈاکٹر نے اسے ایک کامیاب

آپریشن قرار دیا۔ سکون کے کچھ سانس میسر آئے۔ لیکن کچھ ہی دنوں بعد ایک اور رپورٹ سے خبر ملی کہ کینسر اب جگر میں چلا گیا ہے۔ محلے کے ایک بوڑھے کے کہنے پر حکیموں کا علاج شروع ہوا۔ گھر میں جڑی بوٹیوں کا لیپ تیار ہوتا۔ جڑی بوٹیوں کے کانٹے علیحدہ کر کے۔ اونٹنی کے دودھ میں ملا کر ہینگ کے پاپڑوں کے ساتھ۔ خدا جانے کس کس طرح سے جگر کی طرف آئے کینسر کا علاج شروع ہوا۔ بچوں کا زیادہ تر وقت گھر پر گذرتا۔ دوائیاں تیار کرنی۔ خوراکیں کھلانی۔ لیپ تیار کرنا۔ کمر کی مالش۔ امتحان کی تیاریوں کے دوران بھی یہ سلسلہ جاری رہتا۔

شرف الدین صدیقی اکثر بستر پر رہتے۔ اُن کی کمر کا درد نہ جاتا تھا۔ چڑچڑاپن کہیں سا آ گیا۔ عجیب عجیب خواہشیں کرنے لگے۔ ایک دن طلحہ سارا دن۔ شہر اور شہر سے ملحقہ گاؤں میں پپیتا تلاش کرتا رہا۔ اور رات گئے جب وہ پپیتا لایا تو باپ سے ڈانٹ پڑی "اتنی دیر لگا دی آنے میں۔ صبح سے نکلے ہوئے ہو۔"

شرف الدین نے سٹیل کا ایک گلاس اور چاول کھانے والا ایک چمچ اپنے تکیئے کے پاس رکھ لیا تھا۔ وہ چمچے کو گلاس پر زور زور سے بجا کر۔ کال بیل کا کام لیتے۔! جس دن کال بیل پر کوئی نہ آتا۔ سب کو ڈانٹ پڑتی۔ گھر میں فیصلہ ہوا کہ چوبیس گھنٹوں میں ہر وقت کوئی نہ کوئی ابا جی کے کمرے میں اُنکے ساتھ رہے گا۔ درد جب شرف الدین کے پی ایچ ڈی دماغ کی بساط سے باہر ہو جاتا تو Pathedine کا ٹیکا لگانا پڑتا۔ عقل علم اور دلیل کا داعی۔ بے انتہا درد ہونے۔ اور برداشت نہ کر سکنے کی وجہ سے۔ اپنے مزاج کے محور سے باہر نکل چکا تھا۔ بات بات پر ڈانٹ۔ بات بات پر غصہ۔ ماں اور بچوں نے رفتہ رفتہ بیمار کا مزاج سمجھنا شروع کر دیا۔ کبھی کبھی میاں بیوی میں بحث طویل ہو جاتی۔ "درد کے ساتھ ساتھ۔ موت کا خیال بھی آتا ہوگا۔ مجھے لگتا ہے آپ کو ہم سب کی فکر لگی رہتی ہے۔ یوں درد دگنا ہو جاتا ہوگا"۔

"ہاں۔ موت کا خیال تو تمہیں ہر وقت رہنا چاہیئے۔ سب نے مرنا ہے"۔

"مجھے لگتا ہے آپ اپنی فکروں سے زیادہ پریشان ہیں۔ ورنہ درد سے تو آپ کبھی نہ گھبرائے تھے"۔ ماں تسلی دینے کے انداز میں کہتی

"تم مرد نہیں ہو۔ عورت ہو۔ باپ نہیں ہو۔ ماں ہو۔ تم میرے درد نہیں سمجھ سکتیں۔"

"اپنے دماغ کو ٹھنڈا رکھ کے ہم اپنے بدن کی چوٹ اور جسم کا درد اور پھر درد کی شدت

میں کمی لا سکتے ہیں"۔ ماں نے بھی ایم اے کیا تھا۔!

"اتنا علم حاصل کیا۔ اتنی کتابیں پڑھیں۔ لیکن۔ دیکھو۔ میں آج تک جہاز میں نہیں بیٹھا۔" شرف الدین صدیقی کی آنکھوں میں ایک عجیب سی کسک ابھری۔!

"آپ کو کیا پتا۔ آپ کے بچے شائد ہوائی جہاز خود چلائیں"۔

سدرہ بھی پہروں ابا جی سے باتیں کرتی۔ ایک دن انکے پاؤں دباتے ہوئے وہ اُس وقت چونک گئی۔ جب ابا جی نے اُس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

"یہ جب چھوٹے چھوٹے تھے۔ تو میری انگلی پکڑ کر چلاتے تھے تمہیں۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ یہ ہاتھ میرے اتنے کام آئیں گے"۔

"جی۔ ابا جی"

"مجھے خوشی ہے تم بھائیوں سے بڑی ہو لیکن اُن سے چھوٹی لگتی ہو"۔

"آپ زیادہ سوچا نہ کریں ابا جی"۔

"نہیں بیٹا۔ مجھے اپنی تربیت پر پورا بھروسا ہے۔ تم اب بڑی ہو گئی ہو۔ شیر کی طرح اس دنیا میں نکل جاؤ۔ اپنی حفاظت خود کرنا۔ اچھے بُرے کی تمیز تمہیں آتی ہے"

اور سدرہ سوچتی کہ ابا جی نہ رہے تو گھر کا خرچہ کیسے چلے گا۔ گذارا کیسے ہوگا۔ مَیں یوں کروں گی کہ چائے بنانے کے بعد۔ چائے کی پتی سُکھا لیا کروں گی۔ تاکہ بعد میں بھی چائے بن سکے۔ نئی اون کے پیسے نہ ہوئے تو پرانے سویٹر ادھیڑ کر۔ اون کو رنگوا کر۔ نیا سویٹر بُن لوں گی۔ کچھ بھی ہو۔ میں بڑی ہوں۔ مجھے حوصلہ کرنا پڑے گا۔

مریم راجپوت اپنے میاں کے سرہانے بیٹھی تھی۔ سدرہ پائینتی کی طرف اور چارپائی کے سامنے طلحہ اور حمزہ۔ اور کمرے کے دروازے کا پٹ بنے ہوئے ولید کھڑا تھا۔! شدید درد سے شرف الدین صدیقی کا چہرہ سُرخ تھا۔ پسینے کی بوندیں ماتھے پر شطرنج کے بچے کھچے مہروں کی طرح بے ترتیب۔ کانپتے ہوئے بدن کے اوپر۔ چھت پر ہلکی رفتار سے چلتے ہوئے پنکھے سے آتی ہوئی آواز۔ وقت کی کم مائیگی کا احساس دلا رہی تھی۔ پیلے رنگ کی دیواریں۔ روشندان پر لگا لکڑی کا جالا۔ ولید نے ہاتھ میں پکڑی کتاب کو اور مضبوطی سے پکڑ لیا۔ مریم نے اپنے دوپٹے سے میاں کے ماتھے پر آیا پسینہ پونچھنا شروع کیا۔ سدرہ نے گھبراہٹ میں ابا جی کے پاؤں جلدی جلدی

CamScanner

دبانے شروع کر دیئے۔ شرف الدین کے منہ سے نکلتی ہوئی بے ترتیب آوازیں۔ سیدھی سینے سے نکل رہی تھیں۔ طلحہ نے حمزہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ اور دونوں نے ایک دوسرے کی طرف بے یقین نظروں سے دیکھا۔

ولید نے صحن کی طرف کھلتے دروازے سے باہر دیکھا۔ "دوسروں کے لئے جئو" والا فریم ہوا سے دائیں بائیں ہو رہا تھا۔ ایک عجیب سی خاموشی۔ اور دور سے آتی۔ محلے میں کھیلتی لڑکیوں کی آوازیں۔ "بول میری مچھلی کتنا پانی"۔ طلحہ نے اونچی آواز میں آیت الکرسی پڑھنی شروع کر دی تھی۔ حمزہ نے آگے بڑھ کے اپنے باپ کی تنی ہوئی گردن کو سیدھا کرنے کی کوشش کی۔ شرف الدین نے اچانک کروٹ بدلی۔ اپنی انگشتِ شہادت سے پیلی دیوار پر ڈی۔ ای۔ اے۔ ٹی۔ ایچ۔ لکھا۔ اور انکے دیوار سے گرتے ہوئے ہاتھ کے ساتھ۔ ولید کے ہاتھ میں پکڑی کتاب بھی گرتی چلی گئی۔

"سدرہ۔ بھائی کو اٹھاؤ۔ دیکھو سورج سر پر آ گیا ہے" ماں نے صحن سے آواز دی تو سدرہ کے خیالات اور الجھاؤ کا سلسلہ ٹوٹا۔

"چلو بیٹا۔ ماموں کو جگاتے ہیں"۔ سدرہ نے بیٹے کا ہاتھ پکڑا اور سیڑھیاں اترنی شروع کر دیں۔

شرف الدین کی برسی پر سدرہ اور ولید کہیں سے آ جاتے۔ ماں کو تسلی رہتی۔ طلحہ اور حمزہ صرف پہلی برسی میں شرکت کر سکے۔ طلحہ بنک مینیجر اور حمزہ فوج میں کیپٹن۔ نوکری کی مصروفیات۔ اور پھر شادی کے بعد شائد ذمہ داریوں کے پہلو بدل جاتے ہیں۔ دونوں بڑے بیٹوں نے ماں سے کئی بار کہا کہ اُن کے ساتھ جا کر رہیں۔ مریم علی راجپوت اپنے میاں کے " کرائے والے گھر" کو چھوڑنے سے انکاری تھیں۔ جوان بھائی کی موت اور پھر شوہر کا انتقال۔ اُس پر بھائیوں کا سلوک۔ جنہوں نے بہنوئی کی موت پر بھی پرانے گلے شکوے بھلا کر بہن کا ساتھ نہ دیا۔ ان سب حالات و واقعات میں مریم علی راجپوت نے صرف اور صرف اپنے بچوں کے بارے میں سوچتے رہنے اور دعائیں مانگتے رہنے ہی کو زندگی کا محور بنا لیا تھا۔

طلحہ اور حمزہ جب بھی ماں کو اپنے ساتھ رہنے کا کہتے۔ ماں "جو اللہ کو منظور" کہہ کر ٹال دیتی۔ یونیورسٹی میں پہلے سال میں تعلیم حاصل کرنے والے ولید کو اپنے کچھ برس چھوٹے ہونے

پر بہت غصہ تھا۔

اُسکا بس نہ چلتا تھا کہ ایک جست لگا کر کچھ برس آگے چلا جائے۔ اور ماں کو اپنے ساتھ رہنے کی فقط آفر ہی نہ کرے۔ زبردستی ساتھ لے جائے۔ سدرہ نے مشورہ دیا کہ سب بہن بھائی۔ ماں کو ماہانہ خرچہ بھیجیں۔ اور ایک فل ٹائم ماسی کا بندوبست کیا جائے۔ جو ماں کے ساتھ اُسی گھر میں رہے۔ جہاں اُن سب نے زندگی کی کئی گرمیاں اور سردیاں ساتھ گذاریں تھیں۔ ماں کو یہ بات اچھی لگی تھی۔ "ویسے بھی ولید۔ دو گھنٹے کے فاصلے پر ہی تو ہے۔ کبھی بھی بلا لوں گی"۔ کہہ کر ماں نے حامی بھر لی تھی۔

اُس دن ولید نے ضد کر کے ماں سے ناشتہ بنانے کو کہا۔ پراٹھا۔ چائے۔ مونگرے آلو کی بھجیا۔ اپنی مرضی کا ناشتہ کرتے ہوئے ولید نے سدرہ اور ماں سے خوب باتیں کیں۔

"طلحہ اور حمزہ۔ انہیں آپ کے پاس تواتر سے آنا چاہیئے"۔ ولید نے چائے کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا "بیٹا۔ کام ہوتے ہیں۔ اُن کی نوکریاں ہیں۔ گھرداریاں ہیں۔ ہزار جھمیلے ہوتے ہیں۔ ہاں۔ سدرہ۔ تمہیں یاد ہے۔ تمہارے ابا نے۔ بیٹھک سے نکلتے ہوئے۔ صحن میں آکر ولید کو ۱۹ کا پہاڑہ ایک مرتبہ سنایا اور اِس نے دوسرے ہی لمحے پورا صحیح سنا دیا۔ کیا عمر ہوگی اِسکی" ماں نے بات بدل دی" لگ بھگ چار سال۔ ماں"۔ اور سدرہ کو یاد آیا کہ کس طرح ابا جی نے ولید کو گود میں لیا۔ ہوا میں اچھالا۔ اور دوبارہ پکڑ کے۔ گال پر پیار کرتے ہوئے کہا۔ "شاباش بیٹا۔ دل خوش کر دیا۔ پہاڑے یاد کرو۔ باقی کا حساب زندگی خود کر لے گی"۔ حمزہ نے اِس "شاباش" کا کتنا بُرا منایا تھا۔ یہ شاباش اُسے کبھی نہ ملی تھی۔ اور پھر طلحہ نے کس طرح مسکراتے ہوئے لقمہ دیا تھا "رٹا۔ اچھا لگا لیتا ہے"۔

"اور یاد ہے ماں۔ ولید نے پانچویں جماعت میں وظیفہ لیا اور اگلے پچھلے سارے ریکارڈ توڑ دیئے۔ مجھ سے بھی زیادہ نمبر لئے۔ آپ بھی تو اِسے بہت محنت سے پڑھاتی تھیں"۔ سدرہ کو اپنے اِس بھائی سے خاص پیار تھا۔

"اللہ محنتیں قبول کرے بیٹا۔ آمین۔ ثم آمین"۔ ماں آمین کے بعد ثم آمین ضرور کہتی تھیں۔

سدرہ کو یاد آیا کیسے طلحہ اور حمزہ۔ ولید کو ستاتے اور وہ ہمیشہ بیچ میں آجاتی۔ اور ولید کو بچا

CamScanner

لیتی۔ وہی ولید جب چھوٹا تھا اور سردیاں آنے پر۔ تین سال کی عمر میں۔ سدرہ کی رضائی میں گھس کر "جنگ" کیا کرتا تھا۔ اور سدرہ رضائی میں گھستی تو ایک دم لگنے والی رضائی کی سردی وہاں نہ ہوتی۔ اُسے یاد آیا کہ وہ حمزہ اور طلحہ کے "ظلم وتشدد" سے کیسے ولید کو ہمیشہ بچالیا کرتی تھی۔ اور کیسے ولید۔ اُسے آج کا کیلنڈر لکھنا یاد کراتا تھا۔ "سب بچوں کو ڈانٹ پڑی۔ لیکن تمہارے ابا جی نے۔ اللہ انہیں جنت نصیب کرے۔ کبھی ولید کو نہیں ڈانٹا تھا" ماں نے ولید کا سر اپنی گود میں لیتے ہوئے کہا۔

"آپ میرے ساتھ کراچی کیوں نہیں چلتیں۔ کچھ دن رہیں گی تو دل بہل جائے گا"۔ سدرہ کو یاد آیا کہ ماں گھر میں بالکل اکیلی رہتی تھیں۔ یہ گھر۔ جہاں کسی زمانے میں سعدی کی "داستان" اور "بوستان" کے ساتھ علم وفن کے قصے۔ گردش کرتے تھے۔ یہ گھر۔ جہاں چاروں طرف۔ اب بس یادیں ہی رہ گئی ہیں۔ "نہیں بیٹا۔ تمہیں پہلے بھی کہا تھا۔ مَیں یہ گھر چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ ہاں وقت ملا۔ تو کسی بچے کے پاس کچھ دن رہنے کے لئے آسکتی ہوں"

"ابا جی نے ایک گھر نہ بنایا اپنے لئے۔" ولید نے بے خیالی میں کہا۔

"حلال کی کمائی میں گھر مشکل سے ہی بنتے ہیں بیٹا" ماں کو ولید کی یہ بات کچھ اچھی نہ لگی۔

"لیکن ماں۔ حلال کی دوسری کمائیاں بھی تو ہیں۔ ضروری تو نہیں کہ غریب رہ کر ہی اپنی دیانت داری ثابت کی جائے۔ ایمان داری سے دوسرے کام بھی تو کئے جاسکتے تھے"۔

"تم کر لینا کوئی ایسا کام۔ اب تم شروع نہ ہو جانا۔ تمہارے ابا جی کو خواہ مخواہ کی بحث اچھی نہیں لگتی تھی" ماں نے اپنا نام لے کر کبھی اپنے بچوں کو نہیں ٹوکا تھا۔

"مَیں ذرا عارف سے مل آؤں۔ شام تک آؤں گا۔ ماں۔ رات کا کھانا ساتھ کھائیں گے۔ اُسی ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کر۔ جہاں ابا جی کھانے کے دوران گفتگو کرتے تھے۔ اور مجھے بولنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی" ولید نے درمیان والے کمرے میں پڑے اُس پرانے میز کی طرف دیکھا جو 1965 کی جنگ میں اُس کے گھر والوں کے لئے ڈھال بنا تھا۔

"جو کھانا ہے۔ سدرہ کو بتا دو۔ اور یہ دیکھو۔ ماسی نہیں آئی ابھی تک"۔ ماں نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

سدرہ کو اچانک اندر سے ایک ہول سا اٹھا۔اب ماں۔ایک ماسی کے رحم وکرم پر تھی۔؟ اُس نے رونا شروع کر دیا۔

"دیکھا۔بہن کو رُلا دیا تم نے" ماں نے ولید سے شکا یتاً کہا۔

"مَیں نے کونسی ایسی بات کی ہے۔کیوں باجی۔؟ میری کس بات پر رونا آیا آپکو۔" ولید حیران تھا۔

"نہیں پگلے۔تمہاری کسی بات سے مجھے کبھی رونا آیا ہے؟ مَیں تو سوچ رہی ہوں۔ابا جی کے بعد یہ گھر کیسا ویران لگ رہا ہے۔کسی دن ماسی نہ آئی۔اور ماں کو کسی چیز کی ضرورت ہوئی۔ تو تم تو لاہور ہو گے۔اور مَیں کراچی۔"

"آپ فکر نہ کریں باجی۔کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔آپ رات کو قیمہ دھنیا ضرور بنایئے گا۔ آپ جیسا قیمہ دھنیا کوئی نہیں بنا سکتا۔ماں بھی نہیں"۔

"جیسے یہ قیمہ دھنیا۔سدرہ نے خود ہی سیکھ لیا تھا۔مَیں نے ہی تو سکھایا تھا اِسے" ماں کو اچانک یاد آیا کہ سدرہ کو کھانا پکانا تو اُس نے سکھایا تھا۔وہ اُس سے اچھا کھانا کیسے بنا سکتی ہے۔؟

"مذاق کر رہا ہے ماں۔آپ سے اچھا کھانا۔کوئی نہیں بنا سکتا۔مَیں نے آپ سے ہی سیکھا ہے۔یہ تو مسکا لگا رہا ہے۔مل جائے گا تمہیں قیمہ دھنیا۔اور سنو۔سگریٹ کم پینا"۔سدرہ نے گھر سے باہر جاتے ہوئے اپنے بھائی سے کہا اور ماسی کو ڈھونڈنے کے لئے اپنا دوپٹہ سر پر رکھتے ہوئے دالان کی طرف چل پڑی۔

☙☙☙

Mirza Zaheer Abass Rustmani

CamScanner

◎

ایک ہفتہ ماں کے پاس رہنے کے بعد یہ آخری رات تھی۔ ولید نے سدرہ سے وعدہ لیا تھا کہ وہ کم از کم ایک ماہ مزید ماں کے پاس رہے۔ اُس نے عارف کو ابا جی کو قبر پکی کرانے اور ماں کا ھمیشہ خیال رکھنے کے لئے خصوصی ہدایات دی تھیں۔ ماں کب کی سو چکی تھی۔ لیکن ولید ماں کے بستر کے پاس۔ زمین پر لیٹا۔ ماضی۔ حال اور مستقبل کے جھروکوں میں بیک وقت سفر کر رہا تھا۔
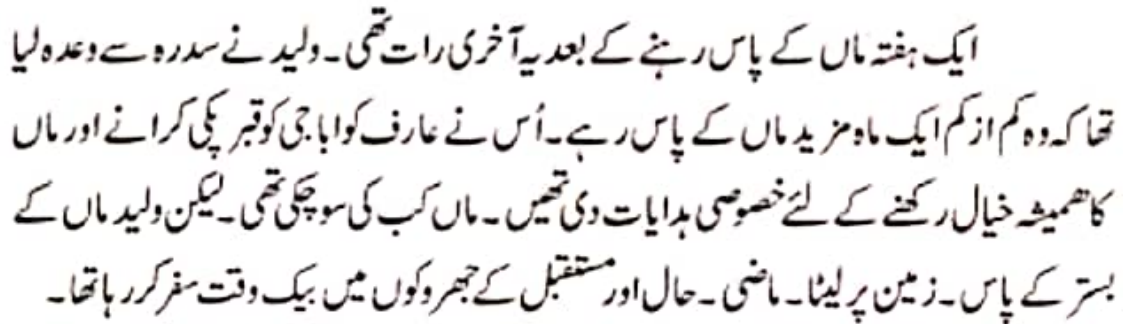
باپ نے "دیانت داری" میں اور "رشوت نہ لینے" میں کمال کر دیا۔ غربت میں ہی زندگی گذاری۔ اور پھر فقط ایمان داری۔ فقط دیانت داری۔! دنیاداری بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔ اگر ہر چیز کی زیادتی بڑی ہوتی ہے تو نیکی میں زیادتی بھی تو بڑی ہوتی ہو گی۔ اب ایسی دیانت داری۔ کس کام کی۔ کہ مرنے کے بعد بیوی کے دن رات گذارنے کا کوئی معقول انتظام بھی نہ ہو سکے۔ ایسی سچائی کا کوئی کیا کرے۔ جو ماں سے بچوں کو دور رکھے۔ علاج کی مناسب ضروریات پوری نہ کر سکے۔ ایسے پڑھے لکھے خاندان کا کیا فائدہ۔ جو ڈگریوں اور تعلیم کے بوجھ کو اٹھائے۔ زندگی کی بنیادی ضروریات کو بھول جاتا ہے۔ ولید کو طلحہ اور حمزہ پر بہت غصہ آ رہا تھا۔ اپنے پاس آ کر رہنے کی آفر کیا چیز ہوتی ہے۔؟ بیٹوں نے ماں کو اپنے ساتھ رکھنا تھا تو ساتھ لے کر کیوں نہیں گئے۔ اور ماموں؟ بھائیوں کو تو بہنوئی کے جنازے پر آنے کی فرصت نہ تھی۔ اُن سے کسی بھلائی کی توقع بھلا کیا ہوتی۔ ولید نے ماں کی چارپائی کا ایک پایہ اپنے دائیں ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑا اور رات کے اندھیرے میں اپنے دل میں دعائیہ انداز لئے ایک فیصلہ کیا۔

"ماں۔ تیری سچائی اور ابا جی کی دیانت داری کا بوجھ ضرور اتاروں گا لیکن دوسرا رخ بھی دیکھوں گا۔ بعضے گمان گناہ نہیں بھی ہوتے۔ میرا وہ دن آنے تک۔ مرنا نہیں۔ زندہ رہنا ماں۔ اور اپنے اِس بیٹے کو تھوڑی اور خدمت کا موقع ضرور دینا۔ کچھ سال اور۔ کچھ سال اور زندہ رہنا ماں۔ زندہ رہنا"۔۔۔۔ ولید نے چارپائی کے پائے پر اپنی گرفت ڈھیلی کی۔ اندھیرے میں اپنی

CamScanner

ماں کے پیروں کو ہاتھ سے چھوا۔ اور آنکھیں بند کرلیں۔ سامنے دیوار پر۔ "Live for others" کے فریم کا شیشہ ذرا سا چمکا اور پھر اندھیرے میں ڈوب گیا۔!

☙☙☙

CamScanner

◎

لاہور واپس پہنچ کر ولید نے سوچ لیا تھا کہ وہ پڑھائی کے ساتھ کوئی پارٹ ٹائم نوکری بھی شروع کرے گا۔ فوری خرچوں میں ٹیوشن فیس، ہاسٹل کا خرچہ، باپ کی قبر پکی کرانی اور ماں کو کچھ پیسے ماہانہ بھیجنے شامل تھے۔ امریکہ جانے میں ابھی تقریباً دو تین سال تھے۔ "ویزا بھی لگے گا۔ اور ٹکٹ کے پیسے بھی آئیں گے۔" ولید نے سگریٹ سلگاتے ہوئے سوچا۔ سگریٹ کا پیکٹ اُس نے سیالکوٹ کے بسوں والے اڈے پر لاہور والی بس پر چڑھنے سے ذرا پہلے خرید اتھا۔

عارف کے تایا سے دو گھنٹے ملاقات کے بعد ایک پرائیویٹ کمپنی کا اتہ پتہ، مینیجر کا نام حوالہ اور کام کی نوعیت کے بارے میں ساری معلومات ولید کے پاس تھیں۔ "سُپر ٹیکس کمپنی" لاہور میں چوبرجی کے پاس دو کمروں پر مشتمل ایک پرائیویٹ کمپنی تھی۔ جس کے مینیجر کے پاس اپنی خدمات کے علاوہ دو کلرک نما لوگوں کا ساتھ بھی حاصل تھا۔ سال بھر کے ٹیکس کے کھاتے جمع کرانے والے لوگ ٹیکس بچانے کے چکروں میں اِس طرح کی کمپنیوں اور اداروں میں مئی۔ جون میں نظر آتے ہیں۔

دو ہزار روپے ماہانہ میں تو اخراجات نہیں چلتے۔ ولید کے حساب کتاب سے مینیجر خوش تھا۔ لیکن بڑی بڑی آسامیاں۔ بڑی بڑی کمپنیوں میں جاتی ہیں۔ لہٰذا تنخواہ میں فوری اضافہ ممکن نہ تھا۔ ایک دن دفتر پہنچنے پر ولید کو سیٹھ صبغت اللہ اپنا انتظار کرتے نظر آئے۔ سیٹھ صبغت اللہ۔ لاہور کے مشہور کاروباری۔ کروڑ پتی۔ اور "سپر ٹیکس کمپنی" ۔؟

"تم ولید ہو"۔

"جی۔ فرمایئے۔"

"مجھے سجاد سے پتہ چلا ہے کہ تم کام جانتے ہو۔ سجاد مُنیر۔ فرنیچر والے"۔

"جی۔ لیکن آپ نے دفتر بلا لیا ہوتا۔ میں تو فارغ ہوتا ہوں۔ یہاں آنے کی زحمت

کیوں کی آپ نے" ولید نے دل ہی دل میں دعا کی کہ سیٹھ کو کوئی غلط فہمی نہ ہوئی ہو۔

"میں سیٹھ بننے سے پہلے۔ فٹ پاتھ پر پرانی کتابیں بیچا کرتا تھا۔ میں کام کرنے والے کی قدر جانتا ہوں"۔

"بتایئے۔ میں آپکی کیا خدمت کر سکتا ہوں" ولید نے دیکھا کہ اُس کا مینیجر اتنی بڑی آسامی دیکھ کر اپنی کرسی سے اٹھ کر سیٹھ کے بازو میں آ کر کھڑا ہو چکا تھا۔

"میرے ساتھ آیئے۔ سیٹھ صاحب۔ مجھے بتایئے کیا کام ہے" مینیجر نے کہا

مینیجر کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے سیٹھ نے ولید سے گفتگو جاری رکھی۔

"میرے چار اکاؤنٹنٹ ہیں۔ ایک چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ اُن کے علاوہ ہے۔ لیکن ٹیکس کا کام میری مرضی سے نہیں ہوتا۔ تم دفتر چلو گے۔ ایک نظر کھاتے دیکھو۔ پھر بات کریں گے"۔

"ابھی چلنا ہوگا" ولید نے مینیجر کے طرف دیکھتے ہوئے سیٹھ سے پوچھا" ہوں۔ اگر تم چل سکتے ہو تو۔"

" کیوں نہیں سیٹھ صاحب۔ میں ولید کو ساتھ لے کر آتا ہوں آپکے دفتر۔ مجھے پتہ ہے مال روڈ پر آپ کا دفتر کہاں ہے" مینیجر نے گفتگو میں "داخل" ہونے کی ایک اور کوشش کی۔

"نہیں۔ صرف یہ بچہ چلے گا" سیٹھ نے سونے کی چار موٹی موٹی انگوٹھیوں والا ہاتھ کھڑا کرتے ہوئے اعلان کیا۔ اور اپنے موٹے سے پیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

سیٹھ صبغت اللہ کے کاروبار کی وسعت۔ اور کھاتوں کی تعداد۔ ولید کو دو ہفتے لگاتار کام کرنا پڑا۔ کروڑوں روپوں کی adjustment میں۔ سرخ قلم سے دائرے لگا کر۔ سیٹھ کے بڑے سے دفتر میں۔ جب ولید نے اپنی ریاضی کے علم کے جوہر دکھائے تو سیٹھ خوشی سے تقریباً پاگل ہو گیا۔ اُسے 8 ملین روپے بچنے کی اتنی خوشی نہ تھی۔ جتنی اِس بات پر کہ اُس نے ولید کو خود "بازار" جا کر ڈھونڈا ہے۔

"میرے پاس نوکری کرو گے"۔ سیٹھ نے دراز کھول کر نئے نوٹوں کی ایک گڈی ولید کو دیتے ہوئے کہا" پڑھائی کر رہا ہوں۔ شام کو وقت ہوتا ہے۔ اور چار دنوں سے زیادہ کام نہیں کر سکتا۔ فائنل قریب ہیں"۔

"چلے گا"

"تنخواہ کتنی دیں گے"

"ابھی کی نوکری میں کتنی ملتی ہے"؟

"دو ھزار"

"بیس ھزار کافی ہوں گے"؟

"ماہانہ۔؟" ولید کے لئے اتنی بڑی رقم۔ کچھ زیادہ ہی بڑی تھی۔!

"یومیہ۔ بیس ھزار تو مَیں بھی نہیں کماتا۔ ماہانہ ہی سمجھو"

"کب سے آنا ہوگا"؟

"تم پچھلے دو ہفتوں کو بیچ میں شامل سمجھو۔ پندرہ دنوں بعد ایک مہینے کی تنخواہ تمہیں مل جائے گی"۔ سیٹھ صغبت اللہ نے ایک لمحے میں ولید کے تمام فوری خرچوں کا انتظام کرتے ہوئے کہا۔

اگلے دن ولید سیالکوٹ میں اپنی ماں کے ہاتھ میں پانچ ہزار کے نوٹ رکھ کے بہت سارے "احکامات" دے رہا تھا۔ "ماسی کی تنخواہ میں دوسو کا اضافہ کر دیں۔ اُسے کہیں وہ رات بھی یہیں رہا کرے۔"

"عارف کے ابا کو پیسے دے دیئے ہیں۔ اباجی کی قبر پکی ہو جائے گی"

"آپکے لئے کچھ دوائیاں لاہور سے لایا ہوں۔ ان کا استعمال شروع کیجئے۔ یہ گلابی رنگ کے محلول پینا بند کر دیں"

"اتنے پیسے تیرے پاس کہاں سے آئے بیٹا" ماں کچھ اور سوچ رہی تھی

"آپ کو ہر ماہ پانچ ھزار روپے بھجوایا کروں گا۔ ٹیلی فون لگوانے کا عارف سے کہہ دیا ہے۔ آپ صحت مندر ہیں ماں۔ مجھے ایک سیٹھ کے ہاں پارٹ ٹائم نوکری مل گئی ہے۔ اب ٹکٹ کے پیسے بھی ہو جائیں گے۔ سب ٹھیک ہوگا ماں"۔

"پارٹ ٹائم۔ اور اتنے پیسے۔ سیٹھ کی کوئی اپاہج بیٹی تو نہیں۔؟" پڑھی لکھی ماں تھی۔ اُسے اندازہ تھا کہ ایک طالبعلم کو پارٹ ٹائم نوکری پر کتنے پیسے مل سکتے ہیں۔

"نہیں ماں۔ سیٹھ کی بیٹی نہیں۔ اپنے حالات اپاہج ہیں۔ لیکن اب بیساکھیاں مل گئی ہیں۔ مَیں نے چلنا شروع کر دیا ہے۔ دعا کریں۔ جب مَیں بھاگنے لگوں۔ تو آپ اسی طرح زندہ

CamScanner

ہوں"۔ولید نے دل میں آئی کوئی بات ماں سے کی!۔

"مجھے کیا ہوگا بیٹا۔ جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔ اللہ بھلا کرے ڈاکٹر تبسم کا۔ جب سے تمہارے ابا جی رخصت ہوئے ہیں۔ ہر روز آتی ہے۔ حیدر کا ذکر کرتی ہے۔ روتی ہے۔ اُس نے ابھی تک شادی نہیں کی۔ کہتی ہے پروفیسر سے کرنی تھی۔ وہ نہیں رہا۔ اب زندگی ایسے ہی گزرے گی"ماں نے کہاں کی بات کہاں لے جاتے ہوئے کہا

"نسبتیں انسان کو کمزور کر دیتی ہیں۔ محبت زمین میں دھنسے پاؤں اکھاڑ دیتی ہے۔ رشتے پاؤں کی زنجیر بن جاتے ہیں۔ پرندہ آزاد ہوتے ہوئے بھی آزاد نہیں ہوتا۔"ولید نے ماں کے پسندیدہ فریم"Live for others" کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

"مشکل باتیں اب میری سمجھ میں نہیں آتیں بیٹا۔ اخبار والے سے کہنا کہ روزانہ اخبار دیا کرے۔ اللہ جانے ہفتہ میں ایک ناغہ کیوں کرتا ہے"

"ناغہ سے پہلے والے دن۔ آدھا اخبار پڑھا کریں ماں۔ باقی کا آدھا ناغہ والے دن۔ ویسے میں عارف سے کہہ دوں گا۔ اخبار آپ کو باقاعدگی سے ملا کرے گا"

بسوں کے اڈے پر پہنچ کر ولید نے سگرٹوں کا پورا کارٹن خریدا۔ کچھ پھل خریدے اور "سیٹھ صبغت اللہ کی اپاہج بچی"والی بات پر مسکراتے ہوئے۔ بس میں چڑھ گیا۔

☆☆☆☆

◎

صبا کے لمبے گھنگھر یالے بال اور بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں۔ فائن آرٹس ڈیپارٹمنٹ کے سارے لڑکوں کے لئے دل چسپی کا باعث تھے۔فیصل آباد سے لاہور آکر پڑھنے پر صبا کے دونوں "غیرت مند" بھائیوں کو اعتراض تھا۔ باپ نے بھی دل سے اجازت نہ دی تھی۔ لیکن ماں نے بیٹی کی آرٹسٹ بننے کی ضد نبھانے کے لئے حالات ہموار کر لئے تھے۔ فائن آرٹس میں آخری سال۔ کچھ کر کے دکھانے کا عزم۔ آرکیٹیکچر۔ مستقبل کے خواب۔ کسی امیر آدمی سے شادی۔ اور بچے پیدا کرنے سے پہلے اپنی مرضی کی نوکری کر کے۔ کچھ کمانا۔ بھائیوں کو غلط ثابت کرنا۔ ماں کا مان رکھنا۔ باپ پر مزید "بوجھ" نہ بننا۔صبا۔ ڈیپارٹمنٹ میں سب سے زیادہ قابل تو نہیں۔ البتہ دوسرے تیسرے نمبر پر ضرور تھی۔ اُسکی ملائم مسکراہٹ۔ بات کرنے کا انداز۔ ہلکا سا قہقہہ۔ جو وہ اکثر لگاتی تھی۔ ڈیپارٹمنٹ کے تمام لڑکے لڑکیوں کے علاوہ۔ ریاضی ڈیپارٹمنٹ کے سب سے لائق۔ فائنل ائیر کے جینئیس۔ ولید کو بھی اچھا لگتا تھا۔!

ریاضی اور فائن آرٹس۔؟ دو مختلف دنیائیں ہیں۔ ایک اپنی مرضی کا جواب نہ آئے تو فیل کر دیتا ہے۔ دوسرا۔ کسی اور کے جواب کو ثابت کرنے پر نقال ٹھہراتا ہے۔ ولید اور صبا۔ ریاضی اور فائن آرٹس پر گفتگو کم ہی کرتے تھے۔ پڑھائی کے دوران کبھی گوٹ پھنس جاتی تو صبا۔ ولید سے مشورہ ضرور لیتی۔ اور ولید۔ ریاضی کے قوانین کے مطابق لکیروں۔ سکیچز۔ پورٹریٹس۔ سٹل لائف۔ کی توجیہیں کر کے۔ صبا کو نئے زاویے دیتا۔

دونوں کی پہلی ملاقات یونیورسٹی کی نئی وائس چانسلر کے چارج لینے پر دی گئی کامن گیٹ ٹو گیدر میں ہوئی تھی۔ سو بٹا سو نمبر لینے۔ دو بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں۔ اپنے لمبے قد۔ تہذیب یافتہ ہونے۔ اور ایک نہائت خوش شکل نوجوان کے طور پر ولید کو یونیورسٹی میں ہر کوئی۔ کسی نہ کسی حوالے سے ضرور جانتا تھا۔ اردو ڈیپارٹمنٹ کی لڑکیاں طرحی مشاعروں میں ولید سے مشورہ لے کی

CS CamScanner

غزلیں لکھتی تھیں۔تقریروں کے مقابلے میں پہلے‘ دوسرے اور تیسرے نمبر پر آنے والے۔ تقریروں کی نوک پلک سنوارنے کے لئے ولید کے پاس آتے تھے۔فزکس ڈیپارٹمنٹ کے طالبعلم ہی نہیں ۔لیکچرر بھی ۔ولید سے کسی نہ کسی مسئلے پر گفتگو کرتے نظر آتے تھے۔فائن آرٹس کے چودھری گروپ کی لڑکیوں کو ایک دن ولید نے ڈاونچی کے بنیادی طور پر ریاضی دان ہونے پر۔لمبا لیکچر دیا۔تو سب کو حیران کر دیا۔"دنیا کا سارا نظام ۔ستارے۔فلکیات۔آسمان۔زمین۔لوگ۔ عمارتیں۔کاروبار۔حتی کہ انسانی رشتے بھی۔کسی نہ کسی ریاضیاتی اصول پر چلتے ہیں"۔

فزکس ڈیپارٹمنٹ کے پروفیسر سطوت شیرازی۔ولید کے دوست ہونے کے ساتھ ساتھ صبا کے دُور کے رشتے دار بھی تھے۔صبا اور ولید کی دوسری ملاقات پروفیسر سطوت کے گھر میں ہوئی۔ جہاں دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھ کر۔گفتگو کر کے۔ایک انجانے احساس کو خیالات میں درآتے محسوس کیا۔عجیب اتفاق ہے کہ ولید نے اگلے دن عارف کو فون کر کے اُس انجانے احساس کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ "صبا اچھی لڑکی ہے"اور صبا نے اپنی روم میٹ دوست شگفتہ سے باتیں کرتے ہوئے اُسی انجانے احساس کا ذکر کرتے ہوئے کہا"ولید مجھے اچھا لگتا ہے" کیلی فورنیا۔لندن۔پیرس۔میڈرڈ۔یاٹورنٹو میں۔ایک نوجوان۔ایک ہم عمر لڑکی سے۔چائے۔ کافی۔دوپہر کے کھانے۔اور پھر ڈنر کرنے کے بعد محبت کی جسمانیت۔پندرہ دنوں میں۔ناپ تول کر۔اور اپنے دوستوں کو سرِ راہ ذکر کر کے۔اپنی گرل فرینڈ کا تعارف کراتا ہے۔اُن پندرہ دنوں میں۔پاکستان میں۔80 کی دہائی کے آخری برسوں میں۔ایک پڑھا لکھا ذہین نوجوان۔ اور ایک پڑھی لکھی خوبصورت لڑکی۔صرف دوستوں کو یہی بتا سکتے تھے۔"وہ اچھی ہے"" مجھے اچھا لگتا ہے"۔ مواقع کا نہ ہونا دوسری بات ہے۔ یہ اس ملک کی ثقافت۔تہذیب۔ اور پھر عزت‘غیرت‘ کے تصورات میں ڈوبے نوجوان۔اپنے ماں باپ کی۔ "بے عزتی" کے خوف سے۔یا پھر مستقبل خطرے میں پڑ جانے کے ڈر سے۔یا ماحول کی صحیح طور پر تشریحات نہ کر سکنے کی بدولت۔ "ڈنر" کو اردو میں ترجمہ کرنے کے بعد۔جملوں میں استعمال کرنے سے پرہیز کرتے تھے ۔استثنائی لوگ اپنی جگہ پر۔لیکن بحیثیت مجموعی معاشرہ میں لڑکے لڑکی کا آزادانہ ملنا‘ شادی کے بغیر ایک ساتھ رہنا‘ سنگل پیرنٹ کا تصور۔آج بھی نوجوانوں کے ذہنوں کی رسائی سے بہت دور ہے۔سویڈن اور کینیڈا میں Gay marriages کے باقاعدہ قوانین بننے کے دور میں۔

پاکستان میں۔ کسی لڑکے کو کسی لڑکی سے شام کے بعد۔ کہیں مل کر۔ دو باتیں کرنے کے لئے۔ آج بھی کئی پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔

"ذرا سی بات پر آنسوؤں کا ڈھیر لگ جاتا ہے۔ چیزیں اپنا مفہوم بدلنے لگتی ہیں بلاوجہ۔ بات بات پر ہنسی آتی ہے۔ شام کا مطلب ملن۔ اور سورج کا مطلب گنگناتی روح ہو جاتا ہے۔ اچانک دل چاہتا ہے کہ دروازہ کھولیں۔ اور جہاں بھی ہیں۔ وہیں سے کہیں اور چل پڑیں۔ اس بے چینی میں ایک سرور ہوتا ہے۔ ہوا سرگوشیاں کرتی محسوس ہوتی ہے۔ دن۔ دن نہیں لگتا۔ رات۔ رات نہیں ہوتی۔ وقت اپنی اہمیت اور زندگی اپنے بجے بھولنے لگتی ہے۔ کیا اسے ہم "محبت" کہہ سکتے ہیں"۔ کئی ملاقاتیں ہونے کے بعد ولید اور صبا کی یہ ملاقات کچھ "فیصلہ کن" سی لگ رہی تھی۔

"تمہیں یہ سب کس نے بتایا ہے" صبا نے اپنے ہاتھ میں لگے پینٹ کے نشان کو کھرچتے ہوئے پوچھا۔

"کسی سے نہیں۔ میں تو اپنے اور تمہارے رشتے کو ایک نام دینے کی کوشش کر رہا ہوں"۔ ولید نے اِس ماہ کا sputnik رول کرتے ہوئے کہا۔

"تم باتیں کرتے ہو تو اچھا لگتا ہے۔ لیکچر اب زیادہ سمجھ میں نہیں آتا۔ پڑھائی اور پینٹ۔ دونوں جلدی جلدی کر کے۔ شام ہونے کا انتظار رہنے لگتا ہے۔ میں خود کو تنہا محسوس کرنے لگی ہوں" صبا نے گھاس کے ایک براؤن ہوتے حصے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"تنہائی تو خلاق ہوتی ہے۔ سوچ پیدا کرتی ہے۔ درد کا احساس دلاتی ہے۔ موسم جنم دیتی ہے۔ ڈاونچی اور آئین سٹائن پیدا کرتی ہے۔ تتلی کی طرح خوبصورت یہ تنہائی۔ تتلی ہی کی طرح خاموش اور کم عمر ہوتی ہے۔ کسی کو چھو جائے تو تتلی ہی طرح رنگ چھوڑ جاتی ہے۔ یہی رنگ کبھی موسیقی۔ کبھی شاعری۔ کبھی رقص۔ کبھی چاک پر رکھی گیلی مٹی سے نکلتے بُت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ یا پھر تمہاری کوئی پینٹنگ۔! مجھے تو تنہائی اچھی لگتی ہے۔ساڈیاں عمراں تو وی۔ وڈی عمر ہووے تیری۔" ولید نے تسلی دینے کے انداز سے تنہائی سمجھانے کی کوشش کی۔

"تمہیں نہیں لگتا۔ یہ سب لفظ ہیں۔ خالی خولی لفظ۔"

"لفظ ہی تو ہمیں بتاتے ہیں کہ وہ ہے۔ وہ تھا۔ اور یہ ہے۔! لفظ ہی تو ہمیں سکھاتے ہیں کہ تم اللہ کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ یہ لفظ ہی تو ہیں جو جب ماں باپ کو نہیں ملتے تو وہ اپنی

تنہائی اپنے بچوں کو سمجھا نہیں سکتے۔ ریاضی بھی ایک لفظ ہے۔لیکن۔۔۔۔۔"

"تم کہانیاں کیوں نہیں لکھتے" صبا نے بات بیچ میں روک کر کہا۔

"دو کہانیاں۔ شائد تین۔! تین کہانیاں لکھنی ہیں۔ لیکن کاغذ پر نہیں۔ زندگی کے چہرے پر۔"

"اِن تین میں سے کوئی ایک۔ ہماری بھی ہوگی" صبا نے سامنے پاپولر کے ایک درخت کی اونچائی دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اِس رشتے کو نام تو دے لیں۔ غلط فہمی کا امکان نہیں چھوڑنا چاہیئے"۔

"تو کیا پہل مَیں کروں"؟

"اِس سے پہلے کہ تم کچھ کہو۔ یہ بتانا ضروری ہے کہ میرے ذہن میں شادی کا کوئی تصور۔ کہیں دور دور بھی نہیں ہے۔ تم سے یا تم سے نہیں۔ کسی سے بھی۔ شادی میرے راستے کی رکاوٹ بن سکتی ہے۔ ہاں۔ اِس وقت کی زندگی میں۔ اگر کسی سے شادی کا خیال آیا۔ تو وہ تمہارے ساتھ....."

"رزلٹ کے فوراً بعد فیصل آباد چلی جاؤں گی۔ امی کہتی ہیں اتنی پڑھائی کافی ہے۔ نوکری کی ضرورت نہیں۔ شادی وغیرہ کا ذکر بھی ہوا تھا۔" صبا نے پاس پڑی کتابیں سمیٹتے ہوئے کہا۔

"اطلاع دے رہی ہو۔ یا۔ مشورہ مانگ رہی ہو"

"سیلف پورٹریٹ پر سب سے پہلا حق تمہارا ہے۔ اِس لئے صرف بتا رہی ہوں۔ کل کو گھر والوں نے شادی وادی کر دی تو بددعائیں نہ دینا مجھے"

" تمہیں نہیں لگتا کہ محبت۔ شادی میں بدل کر۔ بچوں کے فیڈر اور بجلی کے بلوں کو بھرنے میں ضائع ہو جاتی ہے"۔

" مجھے تو پتہ ہے۔ لیکن میرے دو بھائیوں کو شائد نہیں۔۔۔۔۔"

"اگر چار پانچ سال انتظار کرنا پڑا تو کر لو گی"۔

"اگر تم وعدہ کرو کہ چار پانچ سال بعد تم۔۔۔۔۔"

"وعدہ نہیں۔ پلیز۔ وعدہ نہیں۔! وعدہ کر لیں تو پورا کرنا پڑتا ہے۔ تم یہ بتاؤ۔ تمہیں لگتا

CamScanner

ہے تم میرے ساتھ خوش رہو گی"

"خوشی اور غم میرا مسئلہ ہے ہی نہیں۔ تمہارے ساتھ رہنا اچھا لگے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ تم میں بھی شادی کے بعد صرف ایک مرد بن کر زندہ رہنے کے سارے جراثیم موجود ہیں۔ میری ایلس۔ ونڈر لینڈ میں کھو جائے گی۔ سانتا کلاز کے کھلونے ختم ہو جائیں گے۔ اور ہم حساب کتاب کے ماہر ہو جائیں گے"

"تو پھر شادی کا سوچنا بھی فضول۔!"

"نہیں۔ یہ مَیں نے نہیں کہا۔ اپنے آپ کو تیار کر رہی ہوں۔ تکلیف ہو گی۔ بہت تکلیف ہو گی۔ شگفتہ کہتی ہے مجھے بڑی mature محبت ہوئی ہے۔ میرا نہیں خیال۔! تم ایک وعدہ تو کرلو۔"

"اور اگر۔ فرض کرو۔ کسی وجہ سے۔ ہماری شادی نہ ہو سکی تو۔" ولید آور گلاس میں بچی ریت کا اندازہ لگانا چاہتا تھا۔!

"نہ زہر کھاؤں گی۔ نہ تمہیں بد دعا دوں گی۔ اور نہ ہی اپنے شوہر میں تم کو ڈھونڈنے کی کوشش کروں گی"

"اور"!

"اور یہ کہ تم وعدہ نہ کرو گے تو۔ تو۔ مَیں اپنے شوہر سے محبت بھی کر سکتی ہوں۔ بچے بھی پیدا کروں گی۔ اور اُن میں سے کسی کا نام ولید نہیں رکھوں گی" صبا نے رسٹ واچ میں چکر لگاتی سیکنڈوں والی سوئی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"تماری ایگزی بشن کہاں تک پہنچی" ولید سب حساب لگا چکا تھا۔

"گیلری والے اپنا حصہ مانگ رہے ہیں۔ اور مَیں شاکر علی تو ہوں نہیں کہ کچھ پینٹنگز کے بک جانے کا یقین بھی ہو"

"اور شاکر علی نے اپنی پہلی ایگزی بشن کیسے کرائی تھی"؟

"مجھے کیا پتہ۔! چلو اب چلتے ہیں۔ اور سگریٹ کم پیا کرو۔ تمہاری نہیں۔ اپنی صحت کا سوچ کے کہہ رہی ہوں۔ passive سموکنگ زیادہ خطرناک ہوتی ہے"۔

"ہر passive شے عموماً خطرناک ہوتی ہے۔ سوائے خاموشی۔ اطمینان۔ اور سکون

کے"۔

"تم کبھی۔ عام لوگوں کی طرح۔ عام سی باتیں نہیں کر سکتے۔ ہر چیز۔ ہر بات میں۔ کوئی نہ کوئی گہری بات۔ کوئی نہ کوئی فلسفہ۔"

"عام سی باتیں ہی تو کرتا ہوں۔ عام سی باتیں ہی مجھنی مشکل ہوتی ہیں۔ مشکل باتیں آسان ہو سکتی ہیں۔ لیکن آسان باتوں کو سمجھنا۔ مشکل۔۔۔۔۔"

"کیا مشکل ہے۔!" صبا نے رکشہ کھڑا کرنے کے لئے ہاتھ کا اشارہ کیا۔

"یہ بھی مشکل بات تھی۔ تو چلو تم بتا دو۔ عام سی بات کیا ہوتی ہے"

"جیسے یہ کہ صبا۔ تم بہت خوبصورت ہو۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ وعدہ کرتا ہوں کہ شادی تمہارے ساتھ ہی کروں گا۔ اور یہ ساری باتیں کسی امریکہ۔ کسی تتلی۔ کسی ماموں حیدر۔ کسی عارف اور کسی خواب کا ذکر کئے بغیر۔۔۔۔۔ یہ ہوتی ہیں عام سی باتیں" صبا نے رکشہ کو جگہ بتائی اور چلنے کا اشارہ کیا۔ فضا میں صبا کا "خدا حافظ" کافی دیر گونجتا رہا۔ اور ولید "عام سی باتیں" سوچتے ہوئے اپنے لئے رکشہ کا انتظار کرنے لگا۔

ﷲﷲﷲﷲ

CamScanner

◎
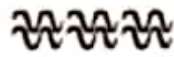
دونوں نے ایک دوسرے سے جھوٹ بولا۔ دونوں کے پاس جھوٹ بولنے کے جواز تھے۔ جھوٹ بولنے کے لئے ویسے کسی جواز کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کسی بھی وقت موقع کی نزاکت یا جان بچانے کے لئے یا پھر ازراہِ تفنن لوگ ایک دوسرے سے جھوٹ بولتے رہتے ہیں۔ ولید ابا جی کی موت۔ ماں کے اکیلے پن۔ بھائیوں کے لاتعلق روّیے۔ اور مستقبل کے چند خوابوں کے درمیان۔ سب کام جلدی جلدی نمٹانے کی کوششوں میں تھا۔ جیسے بیچ سمندر۔ طوفان میں گھری کوئی کشتی۔ جسے ساحل کی لگن ہو۔ اور ساحل تک پہنچنے کا حوصلہ بھی ہو۔ لیکن تیز چلتی ہوئی ہواؤں۔ اور طوفانی بارشوں کے نہ ختم ہونے والے سلسلے سے۔ منزل تک پہنچنے کا راستہ دشوار ہوتا نظر آئے تو ملاح ساحل تک پہنچنے کے لئے سب کام جلدی جلدی کرنا شروع کر دیتا ہے۔ ڈولتی کشتی اور اندھیرے میں۔ اس سے زیادہ وہ کر بھی کیا سکتا ہے۔ ولید کو صبا سے اتنی ہی محبت تھی۔ جتنی کسی کو اس عمر میں کسی ہم عمر لڑکی سے ہو سکتی ہے۔ مگر اُسے محبت لفظ کا پورا احاطہ کرنے میں بہت مشکل پیش آتی تھی۔ اپنے مستقبل کے خوابوں کی تکمیل والا پلڑا بھاری نہیں تھا۔ اُسے وعدوں سے بھی خوف آتا تھا۔ اُس نے جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی۔ وہاں وعدہ نہیں کیا جاتا تھا۔ اور کبھی کیا جائے تو ہر حال میں پورا کیا جاتا تھا۔ " کیا ہوگا۔ اگر امریکہ جا کر۔ کاموں میں دیر ہوگئی۔ اور وہ وقت پر پاکستان نہ آسکا۔ صبا تو ساری زندگی طعنے ہی دیتی رہے گی۔ وعدہ کر کے گیا تھا۔ نہیں آیا۔ کیا ہوا۔ اگر امریکہ اپنے خواب پورے ہونے سے پہلے۔ پاکستان میں۔ صبا کو اپنے بھائیوں اور ماں کا خواب پورا کرنے پر مجبور ہونا پڑا"۔

" مجھے تم سے محبت ہے"۔ یہ فقرہ ولید کے منہ سے نہیں نکلتا تھا۔ اُسے لگتا جیسے اس فقرے کی ادائیگی کے بعد فرائض کی ایک لمبی فہرست سامنے آجائے گی۔ اب شادی بھی اسی سے کرنی ہوگی۔ اسی کے بچوں کو اپنے بچوں کے روپ میں دیکھنا اور پالنا ہوگا۔ قربانی دینی پڑے گی۔

CamScanner

نبھانا پڑے گا۔

اگر یہ سب کچھ وہ کسی وجہ سے نہ کر سکا۔ تو "مجھے تم سے محبت ہے" کی وقعت کیا رہی۔؟ ضرورت ہی کیا ہے ایک ایسا فقرہ بولنے کی۔ جو دوسرے کے دل میں غلط فہمی کی جڑی بوٹیاں اگا دے۔ اور آدمی۔ اس فقرے کی حیثیت اور مقام نبھانے کے لئے۔ اپنی دوسری خواہشات کو۔ دوسرے خوابوں کا۔ گلا گھونٹ کے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گہری نیند سُلا دے۔ ولید کے لئے یہ فقرہ معافی کے کئی جہان لئے۔ ایک نہائت بھاری پتھر کی طرح تھا۔ جسے وہ ان حالات میں اٹھانے سے قاصر تھا۔ اس پتھر کو چوم کر۔ آگے چلے جانے کا حوصلہ بھی اُس میں نہیں تھا۔ اُسے صبا میں وہ بات۔ وہ خوشی نظر آتی تھی۔ جو ریاضی کے ایک مشکل سوال کو کتاب کے آخر میں دیئے گئے جواب کو دیکھے بغیر۔ خود حل کرنے کے بعد ملتی ہے۔" کیا تھا۔ اگر حالات کچھ برس ٹھیک رہتے۔ ابا جی کے زندہ رہنے سے ماں اکیلی نہ ہوتی۔ بھائیوں کا بھرم نہ ٹوٹتا۔ اور میں امریکہ چند سال گذار کر واپس آ جاتا۔ کتنے وثوق سے آج میں صبا سے یہ "عام سی بات" کر سکتا تھا۔"

"صبا نے یہ کہہ کے کہ "تم نہ آئے تو کسی اور سے شادی کر لوں گی"۔ ولید کے علاوہ۔ اپنے ساتھ بھی جھوٹ بولا۔ اور یہ جھوٹ بلا جواز نہیں تھا۔ وہ ولید سے اپنے جذبات اور احساسات کو تفصیل سے بتا کر۔ اپنی نظروں میں گرنے کے تصور سے خوفزدہ تھی۔ یہ تو اُسکی ماں۔ اور روم میٹ شگفتہ جانتے تھے۔ کہ صبا۔ ولید کے بارے میں کیا سوچتی تھی۔ کیوں اُسکی آنکھیں اداس ہو جاتی تھیں۔ اور کئی کئی دن تک۔ اُسکا وہ مخصوص قہقہہ۔ اُسکے کمرے میں بسی خاموشی میں کہیں سر چھپائے۔ پڑا رہتا تھا۔ ماں سے کھل کے بات کرنے کا حوصلہ صبا میں نہیں تھا۔ ماں کو صرف اتنا پتہ تھا کہ ولید سے صبا کی شادی ہو سکتی ہے۔ اور دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ اُس نے یہ بات صبا کے والد اور بھائیوں سے چھپا رکھی تھی۔ ورنہ اب تک فیصل آباد سے دو بھائی۔ لاہور سے اپنی بہن۔ زبردستی واپس گھر لے جا چکے ہوتے۔ شگفتہ سب جانتی تھی۔ اور سب جاننے کے بعد ہی صبا سے اُس نے کہا تھا کہ صاف صاف اُسے بتا دو کہ تم اُس سے محبت کرتی ہو۔ سب کچھ جاننے کے بعد ہی شگفتہ نے صبا سے کہا تھا۔ " محبت بس ایک مرتبہ ہی ہوتی ہے۔ اِسے جلد بازی میں گنوانا نہیں چاہیئے۔ جو اچھا لگتا ہے اُسے بتائیں۔ محبت اظہار مانگتی ہے۔ دیر ہو جائے تو کھلے دروازے چھوڑ کر جنگلوں کی طرف چلی جاتی ہے۔ محبت انتظار نہیں کرتی۔ وقت ضائع مت کرو۔

CS CamScanner

اُسے بتادو۔اورشادی کادیکھا جائے گا۔کتنی شادیاں ہیں جومحبت کرنے والوں کی آپس میں ہوئیں ہیں۔اورجن کی شادیاں ہو جاتی ہیں۔وہ شادی کے بعد۔محبت کی زندگی گذارتے بھی ہیں کہ نہیں؟"

انا کی دیوار۔ایک ظالم باپ کی طرح۔صبا کے سامنے آکھڑی ہوتی۔جس کا کہا ماننا بھی ضروری ہوتا ہےاور کہانہ مان کرکہیں امان بھی نہیں ملتی۔صبا کوولید۔ولید کا خاندان۔ولید کے خواب۔ولید کی لیاقت۔ولید کی عقل۔ولید کی زندگی کے الجھاؤ۔سب معلوم تھے۔وہ جانتی تھی کہ ولید کے تمام مسائل کا حل اُس کے پاس تو کیا خود ولید کے پاس بھی نہیں۔دوسری طرف اُسے یہ بھی خبرتھی کہ ولید کہیں کھوگیا۔نظروں سےاوجھل ہوگیا۔اور۔سب سے خوفناک۔اگرکسی اور کا ہو گیاتووہ درست طریقے سے سانس بھی نہیں لے سکے گی۔

"پیاری ماں۔میرے کمرے کی دیوار پرلگی اِس تصویر میں ایک چھوٹی سی لڑکی۔اپنے ننھے منے۔کمزور ہاتھوں سے مٹی کے کسی بُت کومکمل کرنے کی کوشش میں ہے۔ مجھے نہیں پتہ۔میری سمجھ میں نہیں آتا۔یہ لڑکیاں ہمیشہ مٹی کے بُت ہی کیوں بناتی ہیں!۔تمہیں یاد ہے ماں۔ہم ستاروں والی رات میں اپنے گھر کے باہر کھیلتے تھے۔

روشنیوں۔رنگوں۔چاند ستاروں کودیکھتے تھے۔کتنی میٹھی اورٹھنڈی ہواتھی۔پھرہم کھیلتے کھیلتے گھر سے دور چلے جاتے تو تم آواز دیتی تھیں۔اور میں کھیل ادھورا چھوڑ کر واپس تمہارے پاس آجاتی تھی۔راتوں کوہم کبھی گھومنے جاتے تو میرا ہاتھ اپنے ہاتھ مىں مضبوطی سے پکڑ کے۔تم سڑک کے دونوں طرف۔دودوبار دیکھ کر۔کراس کرتی تھیں۔مَیں تمہاراہاتھ پکڑ کراندھیروں میں بھی چل سکتی تھی۔مگر ماں۔اب مجھے رہ رہ کے یہ خیال آرہا ہے کہ ستاروں والی رات میں گھر کے باہر۔میری زندگی جس کھیل میں شریک ہوگئی ہے۔اُسے کھیلتے مَیں اگر گھر سے دور نکل گئی۔اورتم نے دور سے آواز دے کر مجھے بلایا۔تو میں اِس کھیل کوادھورا چھوڑ کر۔تمہارے پاس آ بھی سکوں گی کہ نہیں۔؟ مجھے معلوم ہے۔گھر میں۔میرے کمرے میں لگی تصویریں۔تم نے نہیں اتاری ہونگی اور میرے بستر پرکسی اورکوسونے بھی نہیں دیتی ہوں گی۔مجھے یہ بھی پتہ ہے کہ ابھی جب مَیں سوجاؤں گی تو تم میرے کمرے میں آؤ گی۔اگلے دن لاہور آنا ہوتو اُس سے ایک رات پہلے۔تم ضرور میرے کمرے میں آتی ہو۔اورپھرتم میرے ماتھے کو چومو گی۔تمہیں پتہ ہے۔تمہارے آنسو۔

CamScanner

اپنے چہرے پر۔ میں اُس دن تک محسوس کرتی رہتی ہوں۔ جب تک تمہارے پاس دوبارہ نہیں آجاتی۔! ماں۔ بہت دفعہ لگتا ہے کہ تم کہیں سامنے کھڑی ہو اور مجھے دیکھ رہی ہو۔ جیسے کبھی گھر میں صبح اٹھ کر میں کھڑکی کھولتی ہوں تو سامنے کچن میں تم نظر آجاتی ہو۔ "میری صبح ہوگئی" "میں نے تمہیں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا"۔ آج کل میری صبح نہیں ہوتی ماں۔ اور مجھے لگتا ہے میں اپنے آپ سے بہت دور ہوتی جا رہی ہوں۔ تم میرے ماتھے پر پیار کرو نا۔ ماں۔ مجھے سخت نیند آئی ہے۔ لیکن میں جاگنا چاہتی ہوں۔ مجھے آکے جگاؤ۔ ماں۔! تم بھی سوچ رہی ہوگی۔ تمہاری صبو۔ پاگل ہوگئی۔! نہیں ماں۔ میں پاگل نہیں ہوئی۔ اور ہاں۔ اب میں تمہارے ساتھ زیادہ ضدیں نہیں کروں گی۔ میں نے ساری ضدیں چھوڑ دی ہیں۔!

دھڑام سے کمرے کا دروازہ کھلا اور صبا گھبرا کے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "شگفتہ کی بچی۔ یہ کوئی طریقہ ہے اندر آنے کا"۔ صبا نے شگفتہ کے ہاتھ میں پکڑے کھانے پینے کی چیزوں کے دو لفافے پکڑتے ہوئے کہا۔

"دونوں ہاتھوں میں چیزیں ہوں۔ اندر سے کوئی دروازہ نہ کھول رہا ہو۔ اور آپ دستکوں پہ دستکیں دیتے جائیں۔ تو۔ ظلِ الٰہی۔ دروازہ ایسے ہی کھولا جاتا ہے"۔ شگفتہ نے میز پر پڑا پانی کا گلاس اٹھایا۔

"یہ کیا لکھ رہی ہو"

"بس یونہی۔ سوچا ماں کو ایک خط ہی لکھ دوں"

"خوشی کی باتیں لکھی ہیں نا۔ گھر میں خط لکھیں تو خوشی کی باتیں لکھتے ہیں۔ یعنی بالکل جھوٹ"

"اُس نے کہا ہے وہ وعدہ نہیں کر سکتا۔ اور شادی وغیرہ بھی اُس کے ایجنڈے میں کہیں نہیں ہے" صبا نے خط شگفتہ کو پڑھنے کے لئے دیتے ہوئے کہا

"تم نے اُس سے کہا کہ جو تم سارا دن۔ ساری رات۔ میرے کان کھاتی ہو۔؟"

"نہیں۔!"

"کیوں"

"بڑی بڑی باتیں ہوتی رہیں۔ اپنے قد اور اپنی اوقات سے بڑی۔ مشکل مشکل

پیرائے میں۔کہنا بھی۔نہ بھی کہنا۔ماننا بھی۔اور اشارتاً انکار بھی کر دینا۔ولید ایسا ہی ہے شائد۔!"

"یہ خط تمہاری ماں پڑھے گی تو تمہیں جوتیاں مارنے اگلی بس میں یہاں آ جائے گی اور ہمارے کمرے میں دھینگا مشتی کی گنجائش ہے اور نہ تیسرا بیڈ۔۔۔۔۔"

شگفتہ خط پڑھ چکی تھی۔!

"کیوں۔کیا ماں سے بیٹی۔دل کی باتیں نہیں کر سکتی۔"

"دل کی باتیں۔؟ پورا قصہ چہار درویش لکھا ہے۔اور اتنا اداس۔رُلا دینے والا۔ذرا خط کا لہجہ تو دیکھو۔جیسے خودکشی سے پہلے کا نوٹ۔یا پھر ناکام محبوبہ کا شادی شدہ محبوب کو شادی والے دن دیئے گئے کارڈ میں رکھا۔آنسوؤں میں ڈوبا۔خط۔۔۔۔۔"

"مذاق کر رہی ہو"

"نہیں۔اور یہ خط پوسٹ نہیں ہو گا۔خود تو پریشان ہو ہی۔ماں کو کیوں پریشان کرتی ہو۔لکھنا چاہتی ہو تو ضرور۔ہو سکتا ہے۔میری ماں زندہ ہوتی تو میں بھی اسی قسم کے "دل کے حالات" والے "محبت نامے" اُسے لکھا کرتی"۔

"چلو۔سوچتی ہوں" صبا نے کہا اور بستر پر بیٹھ گئی۔"اور صبا سوچتی ہی رہے گی۔وقت آگے نکل جائے گا۔ولید چلا جائے گا۔صبا سوچتی ہی رہے گی"۔شگفتہ نے سوچا۔لیکن مزید "استانی" بننے کی کوشش نہ کرتے ہوئے اُس نے صبا کو آج کیا ہوا' کس نے کس سے کیا بات کی' کونسی فلم کس سینما میں لگی ہے' جیسی باتیں شروع کر دیں۔

کمرے میں دو بیڈ۔ایک رائٹنگ ٹیبل۔ایک چھوٹا سا فرج۔اُس سے بھی چھوٹا ایک ٹی وی۔دو تکیے۔کتابیں۔کونے میں پڑی کچھ مکمل۔کچھ ادھوری پینٹنگز۔دیوار پہ لگی ایک تصویر جس میں ایک ننھی منی لڑکی مٹی کے بت بنا رہی ہے۔فرش پر بے ترتیبی سے پڑی چند جوتیاں۔الماری کے پاس پڑے صبا کے جاگرز۔اور چھت پر لگی دو ٹیوب لائٹس کے علاوہ اُس کمرے میں۔اُس وقت۔ایک خاموشی بھی تھی جو دونوں سہیلیوں کے دلوں سے نکل کر اب پورے کمرے میں پھیل چکی تھی۔رات کے کھانے کے لئے ہوسٹل کے میس کے اوقات کب سے گذر چکے تھے۔دونوں کو احساس ہی نہ رہا۔کھڑکی سے آنے والی ہوا سے کونے میں پڑی پینٹنگز میں ارتعاش ہونے سے ایک پینٹنگ آہستگی سے فرش پر آن گری۔نئی نئی بنی۔لیکن ادھوری۔اُس پینٹنگ

CamScanner

میں Statue of Liberty کے بالکل اوپر آسمان پر ایک پرندہ اڑتا ہوا دکھایا گیا تھا۔ جو Statue کے۔ دیوانہ وار چکر لگا رہا تھا۔ سرمئی رنگ کی اُس پینٹنگ کے دائیں طرف۔ نیچے والے کونے سے چند انچ اوپر۔ ایک پنجرہ بنا تھا۔ جس کا چھوٹا سا دروازہ کھلا تھا۔ پنجرے کے ساتھ۔ پنجرے کے باہر بیٹھا ایک اور پرندہ تھا۔ جس کے کٹے ہوئے بے شمار پر۔ چاروں طرف بکھرے تھے۔ پروں کے سُرخ رنگ اور پینٹنگ کے مجموعی طور پر سرمئی کیفیت۔ ایک کنٹراسٹ پیدا کر رہی تھی۔ وہی کنٹراسٹ جو شگفتہ کو صبا کی سوچوں میں پچھلے کافی دنوں سے نظر آ رہا تھا۔!

ﷲﷲﷲ

◎
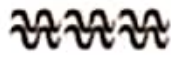
1990 میں جس دن جرمنی کی ٹیم نے ارجنٹائین کی ٹیم کو صفر کے مقابلے میں ایک گول سے ہرا کے ورلڈ کپ جیتا تھا۔ اُس دن ولید کو اپنی پسندیدہ ٹیم کے ہار جانے کے افسوس کے ساتھ ساتھ۔ اپنی مرضی کا رزلٹ پا کر خوشی بھی ہو رہی تھی۔ سیٹھ صبغت اللہ کے بیٹے معروف سے 500 روپے کی شرط اُس نے بہر حال جیت لی تھی۔ اُس نے معروف کے ساتھ شرط لگائی تھی کہ جرمنی جیتے گا۔ ولید ہمیشہ دوسری ٹیم پر شرط لگاتا تھا۔ اُس کا کہنا تھا کہ اپنی ٹیم جیت جائے تو شرط کے پیسے دیتے ہوئے زیادہ افسوس نہیں ہوتا۔ اور اگر اپنی پسند کی ٹیم ہار جائے۔ تو شرط تو کم از کم جیت لی جائے۔ ریاضی کے کچھ اصولوں نے ولید کو زندگی کرنے کے کئی گُر سکھا دیئے تھے۔ شطرنج اچھی کھیلنے کی وجہ سے اُسے بساط بچھانی بھی آتی تھی۔ کونسے پیدل کو مدِ مقابل کے کونسے گھوڑے سے پٹوا کر اپنے فیل کو دوسرے کی ملکہ کے عین مقابل کیسے کھڑا کر دینا ہے۔ یوں کہ ملکہ اپنے بادشاہ کے آگے سے ہٹ نہ سکے۔ اُسکی محبوب ترین چال تھی۔ ریاضی ۔ شطرنج۔ طبعیات۔ سائنس۔ آرٹ۔ ادب۔ فلسفہ۔ ٹیکنالوجی۔ ولید کی شخصیت کے کئی پہلو۔ اور وقت کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے۔ اُسکا فطری ردِعمل۔ علم۔ عقل۔ دلیل اور مشاہدے کے زور پر تیز کی ہوئی چھری کی طرح تھا۔!

سیٹھ صبغت اللہ کے اسسٹنٹ عبدالشکور کو بتا کے کہ وہ ہفتہ بھر دفتر نہ آسکے گا۔ اُسے سیالکوٹ جانا ہے۔ ولید نے صبا کو فون پر رزلٹ بتایا۔ تو صبا نے ٹریٹ لینے کی ضد کر دی۔ یونیورسٹی میں اگلے دن رزلٹ اناؤنس ہوا تو یونیورسٹی کی تاریخ مرتب ہوئی۔ پچھلے لگ بھگ سو سال میں کسی طالبعلم نے۔ کسی بھی مضمون میں۔ ایم اے یا ایم۔ ایس۔ سی میں 98 فیصد نمبر نہیں لئے تھے۔ بقول پروفیسر ساحر مشتاق کے۔ "یہ دو فیصد نمبر بھی ولید کو مل جانے تھے۔ لیکن کیا کیا جائے۔ استاد نے کچھ نمبر تو کاٹنے ہوتے ہی ہیں۔ اِس کے ایک پیپر کو سارا پڑھ کے سمجھ نہیں آتا تھا کہ سو میں سے

سونمبر دیئے جا سکتے ہیں یا اس سے بھی زیادہ۔"

Cathay ریسٹورانٹ میں اُس وقت دو ایک میزوں پر تین چار لوگ بیٹھے چائے پی رہے تھے جب ولید نے نوٹ کیا کہ جن کرسیوں پر صبا اور وہ بیٹھتے تھے۔ وہاں کوئی اور بیٹھا تھا۔ ویٹر نے پہچان کر ولید کو سلام کیا۔ اور ولید نے صبا کا انتظار کرتے ہوئے۔ دو چائے اور کچھ بسکٹوں کے ساتھ۔ ویٹر سے باہر جا کر۔ کچھ سموسے لانے کا آرڈر دیا۔ اُسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ صبا سفید رنگ کے شلوار قمیض پر ہلکے نیلے رنگ کا دوپٹہ۔ اور پاؤں میں۔ وہی۔ سدا کے کھُسے۔ پہنے ریسٹورانٹ میں داخل ہوئی۔!

"ولید۔ اتنے نمبر۔! اس میں سے کچھ مجھے بھی دیتے ہو۔ اپنا تو رزلٹ۔ خواب میں بھی ایسا نہیں آسکتا۔" صبا نے پرس کھول کر ایک چھوٹا سا wrapped ڈبہ ولید کے سامنے رکھتے ہوئے خوشی سے کہا۔

"اُس دن تمہارے ڈیپارٹمنٹ نہ آسکا۔ معذرت۔ تم نے زیادہ انتظار تو نہیں کیا تھا" ولید نے "مبارک باد" سنی ان سنی کرتے ہوئے پوچھا

"انتظار کی عادت ڈالنی پڑے گی۔ تم بتاؤ۔ لفافہ مل گیا تھا"

"ہاں۔ اور اپنے کزن کا شکریہ ادا کر دینا۔ میرے سارے سوالوں کے جواب اُس میں موجود تھے۔ یہ کمپیوٹر بھی عجیب چیز ہے۔ ایک سوال کا جواب ملے تو دوسرا سامنے آ جاتا ہے....."

" کمپیوٹر ہی نہیں۔ یہ زندگی بھی کچھ ایسی ہی چیز ہے"

" آج رات سیالکوٹ جاؤں گا۔ چار دن بعد عارف کی شادی بھی ہے۔ سب کچھ بھگتا کر آنا چاہتا ہوں"

" تم اور تمہارے دوست۔ شادی جیسی عام چیز پر یقین رکھتے ہیں" صبا نے "عام" پر زور دیتے ہوئے پوچھا" عارف۔ مجھ سے عمر میں بڑا ہے۔ اور اُن کے ہاں 25 سال کی عمر تک لڑکے کی شادی نہ ہو تو معیوب سمجھا جاتا ہے۔ ویسے بھی لڑکی والوں نے جلدی کی ہے۔ لڑکی کی ماں سخت بیمار ہے"

"اور تمہارے ہاں۔ لڑکے اور لڑکی کی شادی کتنی عمر تک ہو جاتی ہے" صبا کو اچھی طرح خبر تھی کی سیالکوٹ سے آنے کے بعد ولید امریکہ جانے کی تیاریوں میں مصروف ہو جائے گا۔ اور

CS CamScanner

ایلس۔ اپنے ونڈر لینڈ میں "To be continued" کا بورڈ لگا کر بیٹھ جائے گی۔

"طلحہ 29 سال کا تھا۔ حمزہ 26 اور باجی 25 سال کی۔ جب ان کی شادیاں ہوئیں۔ اُس وقت ابا جی زندہ تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ لڑکی تعلیم مکمل کرتے ہی۔ اپنے گھر چلی جانی چاہئے۔ اور لڑکے کمانے جوگے ہو جائیں تو اُن کی شادی کر دینی چاہئے۔ اس میں عمر کی کوئی قید نہیں تھی" ولید نے جھوٹ بولا۔ اُسے یاد تھا کہ ابا جی نے لڑکوں کے " کمانے جوگے" ہونے کی کوئی شرط نہیں لگائی تھی۔ "شادی کی عمر ہو جائے تو بچوں کی شادی کر دینی چاہیئے" صدیقی صاحب اکثر کہا کرتے تھے۔

"فیصل آباد سے ماں آئی ہوئی ہیں۔ آج کل مَیں زمین پہ سوتی ہوں۔ ملو گے؟"

"رات کو تو بس پکڑنی ہے۔ کتنے دن رہیں گی لاہور میں۔"

"پرسوں جا رہی ہیں۔"

"ابھی مل سکتے ہیں؟۔ ایک آدھ گھنٹہ تو نکل سکتا ہے" ولید نے گھڑی کی سوئی سے اپنے بیگ بنانے اور بسوں کے اڈے تک جانے کے سارے مراحل کو وقت میں تقسیم کر کے حامی بھر لی۔

"تو تم بھی کیا یاد کرو گے۔ آؤ۔ تمہیں اُس عظیم ہستی سے ملواتی ہوں۔ جنہوں نے اِس قیامت کو پیدا کیا۔ اور....."

"اور اب روزِ حساب کیلئے تیاری کروانے۔ یہاں آئی ہیں"۔ ولید نے فقرہ راستے میں ہی اچک لیا۔

"ولید.....!"

"مذاق۔ عام باتوں میں آتا ہے" ولید نے مسکراتے ہوئے کہا" تم ابھی تک۔ میری "عام باتوں" والی بات نہیں بھولے!" صبا کو اچھا لگا کہ ولید کو اُس کی بات یاد تھی۔ لیکن ماں کے لاہور آنے پر ولید کا loose ریمارک بُرا بھی لگا۔

"ماں۔ میرا رزلٹ سن کر کتنا خوش ہو گی!" ولید نے چائے کا بل دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ اور ماں کو امریکہ جانے کے بارے بھی بتانا"۔

"ضرور"۔ اور ولید نے صبا کو نہیں بتایا کہ وہ صبا کی ماں نہیں۔ اپنی ماں کے خوش ہونے کی بات کر رہا تھا۔

CamScanner

رکشہ میں دونوں ساتھ بیٹھے۔ یہ دوسری مرتبہ ہوا۔ ورنہ دونوں اپنے اپنے سونے کے ٹھکانوں پر علیحدہ علیحدہ رکشوں میں جایا کرتے تھے۔ پہلی مرتبہ دونوں رکشے میں اکھٹے کچھ مہینوں پہلے۔ آرٹ گیلری جاتے ہوئے بیٹھے تھے۔ اُس وقت ولید اور صبا کے درمیان۔ کچھ پینٹنگز حائل تھیں۔ یہ پہلی دفعہ تھا کہ دونوں ساتھ بیٹھے تھے۔ ولید کو رات ماں سے مل کر رزلٹ سنانے کی خوشی تھی۔ اور صبا۔ ولید کو اپنی ماں سے ملانے کا سوچ کر خوش تھی۔ دونوں کی الگ الگ خوشی۔ اور رکشے والے نے صبا اور ولید کے ہاتھ میں ہاتھ۔ ملے ہوئے۔ نہ دیکھے۔ اِسے مَن آباد پہنچ کر سواریاں اتار کر شائد کسی اپنے کام سے کہیں اور جانے کی جلدی تھی۔ رکشہ بہت تیز چل رہا تھا۔

"لڑکیوں کے ہاسٹل میں۔ شام کے وقت۔ لڑکے۔ کسی لڑکی کی ماں سے ملنے نہیں آسکتے۔ جانتے ہونا۔؟" صبا کو اچانک یاد آیا کہ ملاقات کہاں ہوگی۔؟

"تو۔؟"

"تو یہ کہ تم باہر انتظار کرنا۔ اور مَیں ماں کو باہر لاؤں گی۔ رکشے میں تین لوگ بیٹھ سکتے ہیں۔ واپس Cathay آجائیں گے۔ تھوڑی دیر کی تو بات ہے"۔

"رکشہ روکنا۔ بھائی۔" ولید نے عجیب سی نظروں سے صبا کو دیکھتے ہوئے رکشہ رکوا دیا۔

"مَیں واپس جاتا ہوں۔ زیادہ دیر نہ کرنا۔ مجھے 9 بجے والی بس پکڑنی ہے" ولید نے صبا کر سر ہلاتے دیکھا۔ اور سڑک پر کسی اور رکشہ اور ٹیکسی کی تلاش کرنے لگا۔ ریسٹورانٹ واپس پہنچ کر اُسے اِس مرتبہ وہ میز خالی ملی۔ جہاں وہ اور صبا خاص خاص دنوں میں آیا کرتے تھے۔ لاہور میں ہوٹلوں، ریستورانوں اور چائے خانوں کی کمی نہ تھی۔ لیکن پہلی مرتبہ جب صبا نے Cathay میں "پانچ منٹ ملنے کے لئے" جگہ تجویز کی۔ اُس دن سے آج تک۔ یہ چھوٹا سا ریسٹورانٹ دونوں کے لئے ایک خوبصورت سا استعارہ بن گیا تھا۔

تین سگریٹ۔ دو چائے کے کپ۔ اور تین مرتبہ باہر سے اندر چکر لگانے کے بعد۔ ولید نے سوچا۔ نو بجے والی بس تو نہیں پکڑی جا سکے گی۔ اب صبح ہی سیالکوٹ جاؤں گا۔ ویسے بھی رات بارہ بجے پہنچ کر ماں کو جگانے سے بچ جاؤں گا۔

"میری ماں"۔ صبا نے ماں کو بٹھاتے ہوئے۔ کھڑے کھڑے تعارف کرایا۔

CamScanner

ولید اُس وقت تک کھڑا رہا جب تک صبا اور اُس کی ماں ۔ ٹھیک طرح ۔ کرسیوں پر جم کر نہیں بیٹھ گئے ۔ اُسکے گھرانے میں بڑوں کی ۔ عورتوں کی ۔ اور خاص طور پر ماؤں کی بہت عزت کرنے کے سبق دیئے گئے تھے ۔ تیر کی طرح کھڑے ہو کر ۔ سگریٹ فوراً بجھاتے ہوئے ۔ ولید کا اٹھنا اور کچھ دیر تک احتراماً کھڑے رہنا ۔ صبا کو بہت اچھا لگا ۔

" تمہارے ابا جی کا بہت افسوس ہوا تھا بیٹا ۔ اللہ انہیں جنت نصیب کرے ۔ آمین ۔ تمہاری امی اب کیسی ہیں " ۔ صبا کی ماں نے پاکستان کی تمام ماؤں کی طرح روائتی انداز میں بتایا کہ وہ بھی ایک " ماں " ہیں ۔

" جی ۔ اب بہتر ہیں ۔ آپ سُنائیے ۔ " ولید کو بات کرنے کے لئے لفظ ڈھونڈنے پڑ رہے تھے ۔

" صبا تمہاری بڑی تعریف کرتی ہے ۔ بیٹا ہم لوگ پرانی طرز کے ہیں ۔ لڑکے لڑکیوں کا شادی سے پہلے ملنا کچھ مناسب نہیں سمجھتے ۔ لیکن نئے زمانے کو بھی تو سمجھنا ہے ہمیں ۔ ! "

" جی ۔ " 98 فیصد نمبر لینے والے کو واقعی سمجھ نہ آیا کہ اِس " اچانک حملے " کا وہ کیا جواب دے ۔

" اب ۔ اِس کے ابا کو پتہ چلے کہ مَیں شام کے وقت ۔ یہاں بیٹھی ۔ تمہاری امی کی بجائے ۔ سید حاتم سے بات کر رہی ہوں تو انہیں کتنا غصہ آئے گا ۔ صبا جانتی ہے "

" ہاں ۔ ولید نے گولڈ میڈل لیا ہے ۔ سب سے زیادہ نمبر لئے ہیں " صبا نے ولید کے چہرے پر .S.O.S کا بڑا سا نشان دیکھتے ہوئے بات بدلی ۔

" ہاں بیٹا ۔ سنا ہے تم بہت لائق ہو ۔ کوئی نوکری اور بزنس کا سوچا ہے ۔ صبا کے تو بہت سے رشتے آ چکے ہیں ۔ لیکن اب وقت آ گیا ہے " ۔

" سوچا ہے امریکہ جاؤں گا ۔ نیو یارک ۔ کچھ مزید پڑھائی ہو جائے تو پھر ـــــــ "

" یعنی دو سال اور "

" کم از کم چار سال اور "

" اور پھر اُسکے بعد "

" پھر قسمت آزما کے دیکھیں گے ۔ کچھ دال دلیہ شائد ہو جائے "

Mir Zaheer Abass Rustmani
CamScanner

"بیٹا چھ سات سالوں میں تو صبا کی خاصی عمر ہو جائے گی۔تم دونوں نے کیا سوچا ہے"
ماں۔یہ باتیں کرنے کے لئے تو آپ کو ولید سے نہیں ملوایا۔آپ نے تو صرف 'دیکھنا چاہتی ہوں' کی بات کی تھی۔صبا کو ایک عجیب سی اجنبیت ماحول میں درآتی نظر رہی تھی۔یہ کس قسم کی باتیں ہو رہی ہیں۔میَں نے ماں کی بات کیوں مانی۔ولید ہی انکار کر دیتا کہ بس پکڑنی ہے۔
اور صبا کو یاد آیا کہ ولید نے نو بجے والی بس پکڑنی تھی۔
"تمہاری بس ولید"۔
"کل چلا جاؤں گا"۔کہہ کے ولید نے صبا کی ماں کی طرف اُس نظر سے دیکھا جس سے وہ اپنی ماں کو دیکھتا تھا۔اُسے اس ماں کی کسی بات میں کوئی برائی نظر نہ آئی۔"اِن حالات میں سدرہ ہوتی۔تو ماں یہی سوالات۔یہی خدشات۔اور انہی باتوں کا ذکر کرتی جو صبا کی ماں کر رہی تھی"۔
"سچ بتاؤں تو آپ کی کسی بات کا جواب میرے پاس نہیں ہے۔مجھے معاف کر دیجئے گا"۔ولید کے ایک ایک لفظ میں کھری سچائی تھی۔!
"بیٹا۔خیال رکھنا۔ہم لڑکی والے ہیں"۔ماں نے سر پر رکھی چادر کو درست کرتے ہوئے کہا۔
"چلیں ماں۔میرا خیال ہے اب چلتے ہیں۔کیوں ولید" صبا نے کہا
"میَں ساتھ چلوں۔؟"
"نہیں۔ہم چلے جائیں گے"۔دونوں ماں بیٹی میز سے اٹھے۔اور جانے سے پہلے۔ماں کو ریستورانٹ کے دروازے پر ذرا کی ذرا رکنے کا کہہ کر صبا واپس ولید کے پاس آئی۔
"بُرا لگا"
"نہیں"
"سچ کہہ رہے ہو"
"نہیں"
"ہاسٹل سے کل فون کروں گی۔شام کو گھر ہی رہنا"۔صبا نے کہا اور ماں کی طرف مُڑ گئی۔

تیاری کرنی ہے۔اور ہاں۔میرے گھر واپسی کے امکانات یا اوقات نہیں ہوتے۔اکثر۔اپنی روٹین میں میرے آنے کا انتظار وغیرہ شامل نہ کرنا۔ اسی لئے تمہاری entrance بالکل independent ہے۔جب مرضی آؤ۔جب مرضی جاؤ۔تم آئے ہو تو اچھا لگا ہے"۔

"سٹڈی میں داخلہ فری ہے"۔؟

"اگر مَیں نہ ہوں تو بالکل فری۔ویسے تمہارے کام کی کتابیں یہاں کم ہی ملیں گی"

"تم نے شادی کب کرنی ہے؟"

"ارے۔یہ شادی کہاں سے یاد آ گئی"

"سائے تو ہمیشہ ساتھ رہیں گے۔بچپن بھی ساتھ جڑا رہے گا۔پیسہ بھی خوب بنا لیا ہے۔گھر بھی ہے۔اب تم اپنے بچوں کو مستقبل کا تحفہ دینے کے قابل بھی ہو گئے ہو....."

"شادی بھی کر لیں گے۔اس ملینیم میں ابھی بہت سے سال باقی ہیں۔ابھی تو شروع ہوا ہے۔اور تم نے میری شادی کروا کے کیا کرنا ہے۔؟"

"امریکہ۔شادی کے بغیر۔کسی بھی قسم کی کوئی بھی عورت۔نہ کسی عورت کا سایہ۔شادی نہ سہی کچھ "شادی نما" ہی کوئی کام کر لو"۔

"شادی نما"۔یہ بھی اچھا ہے۔جہاں نما تو سنا تھا۔یہ شادی نما پہلی بار سنا ہے"

"میرا مطلب ہے۔ذہن۔دل۔اور روح کے ساتھ ساتھ بدن کی کچھ ضروریات بھی ہوتی ہیں"۔

"کیا بے تکا سوال ہے "

عارف نے اپنے ذہن میں مختلف انداز سے تجزیے کئے۔لیکن اُسے سمجھ نہ آ سکا کہ ولید اپنی کچھ ضروریات آخر کہاں سے پوری کرتا ہوگا۔زیادہ کرید ولید کو اچھی نہیں لگتی تھی۔لہٰذا عارف نے بحث کو آگے بڑھانے کی بجائے بات ہی بدل دی "بارسلونا کب جاؤ گے۔؟ اور پھر پاکستان کب چلنا ہے بھئی"۔

"حیدر ماموں کے دوست کا پتہ ڈھونڈ لیا ہے۔بارسلونا کے ساتھ Figueres بھی جانا ہے۔جہاں سلواڈور پیدا ہوا اور پھر اُس کا انتقال بھی وہیں ہُوا۔ذرا وقت ملے تو چکر لگاؤں گا۔غرناطہ اور قرطبہ بھی جانا ہے۔سپین پورا ہی دیکھنے والا ملک ہے۔لیکن وقت کم ہوگا۔اور پاکستان۔

CS CamScanner

◎

محلے کے شروع والے موڑ پر تانگے والے کو پیسے دے کر ولید نے اپنا چھوٹا سا بیگ گلے میں لٹکایا اور ذرا سی چڑھائی والی گلی۔ جس میں اُسکا بچپن گذرا تھا۔ چڑھنے لگا۔ اپنے گھر پہنچ کر اُس کالے دروازے کی چٹخنی کو کھٹکھٹا کر اندر جانے کی اُسے ضرورت نہیں تھی۔ دروازہ ذرا سا کھلا تھا۔ اُس نے ہولے سے دروازے کے پٹ کو مزید کھولا۔ دالان سے گذرتا ہوا صحن میں آیا۔ تو پانی کی ٹنکی پر بیٹھا ہوا کوا اچانک کوئی آواز نکالتا ہوا اور پر کو اڑ گیا۔ پیتل کی چھوٹی سی پلیٹ۔ جس پر بڑی روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے وہ کھا رہا تھا۔ الٹ گئی۔ آواز سامنے والے کمرے سے بھی آئی۔

"تبسّم۔ یہ تم ہو"۔ ماں بستر پر لیٹی اخبار پڑھ رہی تھی۔

"ماں۔ مَیں ہوں"

"میرا بیٹا آیا ہے۔ صبح سے یہ مردود کوا تنگ کر رہا تھا۔ مجھے کیا پتہ تھا۔ کہ میرے بیٹے کے آنے کا پیغام لایا ہے" ماں نے جلدی جلدی سلیپر پہنتے ہوئے کسی پرانی کہاوت کو سچ ثابت کرتے ہوئے کہا۔ گلے ملنے۔ ماتھے پر پیار کرنے اور اپنا بیگ ایک طرف کرنے کے بعد ولید کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ باہر سے عارف کی آواز آئی۔

"ہم نے بھی جاسوس چھوڑ رکھے ہیں۔ پتہ چل گیا کہ جناب کل نہیں۔ آج تشریف لائیں گے"۔ عارف بغیر اجازت لئے۔ بغیر سلام دعا کئے بولے چلا جا رہا تھا۔

"تم نے اچھا کیا۔ دو تین دن پہلے ہی آ گئے۔ تمہارے بغیر شادی کا بھلا کیا مزا آنا تھا۔ چلو۔ گھر چلتے ہیں"

"اسے بیٹھنے تو دو ذرا عارف۔ ابھی تو یہ ٹھیک طرح سے پہنچا بھی نہیں" ماں نے شکائتاً کہا

"ماں۔مَیں فیل ہوگیا"۔ولید نے منہ کو لٹکانے کی کوشش کی

" کیا ہوگیا۔فیل۔؟"ماں کا منہ کُھلے کا کُھلا رہ گیا

"ہاں ماں۔فیل۔پہلی مرتبہ۔تیاری کرنے کا موقع ہی نہیں مِلا۔نوکری جوشروع کردی تھی۔اچھا ہے اباجی نہیں ہیں۔ورنہ خوب پٹائی ہوتی"۔ولید نے اپنی بات میں وزن پیدا کیا

"تو کیا ہوا بیٹا۔ہم دوبارہ امتحان دیں گے۔خیری سلّا۔"ماں نے بیٹے کو گلے لگایا اور کئی بار ماتھے اور گال کو چوم کر۔کہا۔" کھانا کھایا بیٹا"۔

" بکواس کررہا ہے خالہ۔جھوٹ بول رہا ہے۔شرم کرو۔ماں سے جھوٹ بول رہے ہو۔خالہ۔اِس نے یونیورسٹی کے سارے ریکارڈ توڑ دیئے ہیں۔آپ نے کل کا اخبار نہیں دیکھا تھا"۔عارف بولا

"نہیں بیٹا۔کل اُس کم بخت اخبار والے کا ناغہ تھا۔کیا یہ سچ ہے۔ولید۔مَیں بھی کتنی بھولی ہوں۔اپنے بیٹے کا مذاق بھی نہ سمجھی"۔ماں نے اچانک رونا شروع کردیا۔

"معاف کردے ماں"۔ولید نے ماں کو چپ کرانے کے لئے اُسکا سر اپنے بائیں کاندھے سے لگایا۔اُسے ماں کا "خیری سلّا" سننے کو کیسے ملتا اگر وہ یہ ذرا سا ڈرامہ نہ کرتا۔"ہم دوبارہ امتحان دیں گے" میں جو محبت ہوتی ہے۔وہ مبارک باد میں نہیں ہوتی۔وہ پریشان اور حیران آنکھیں جو بیٹے کے اچانک فیل ہونے والی "المناک" خبرسُن کر ذرا پھیل جاتی ہیں۔اُس حُسن کو ولید کیسے دیکھتا اگر سیدھا اپنا رزلٹ سنا دیتا۔امتحان گیا جہنم میں۔اور رزلٹ کی ایسی تیسی۔" کھانا کھایا تم نے" میں جو ایک سرور ہے اُسکی دلفریبی کو وہی محسوس کر سکتے ہیں جن کے پاس کسی زمانے میں ولید کی ماں جیسی ماں ہوتی ہوگی۔!

ماسی کے کھانا گرم کرنے تک ولید نے ماں کے پچھلے کئی دنوں کا حساب لے لیا۔کھانے کے دوران دوائیاں۔گھٹنے کا درد۔اخبار والے کا ناغہ۔ڈاکٹر تبسم کی تعریفیں۔محلے کی دو عورتوں کے قصے۔درزیوں کے بڑے بیٹے کا دوبئی سے واپس آنا۔اباجی کے قصے۔سدرہ کا تواتر سے خط نہ لکھنا۔اور ولید کے پیسوں پر دل کھول کر۔اللہ کا شکر کرتے ہوئے۔ذکر کرنا۔ماں تو شائد ولید کا ہی انتظار کررہی تھی۔

"ماں۔عارف کافی دیر سے انتظار کررہا ہے۔اجازت دیں تو اِسکے ساتھ ہوآؤں۔

CamScanner

رات کو دروازہ کھلا رکھیئے گا۔ ناشتے پر ملاقات ہو گی"

"جا بیٹا۔ دوست کی شادی ہے۔ ضرور جا۔ اور دروازہ ماسی کھول دے گی"۔ ماں نے کہا اور ولید کو یاد آیا کہ اب تو ماسی۔ رات کو بھی ماں کے پاس ہی رہتی ہے۔

عارف کے گھر۔ عارف کے ساتھ۔ ولید پہنچا تو ایک جم گفیر اپنے انتظار میں پایا۔ وہ ہنگامہ۔ جو پاکستان میں شادیوں سے ذرا پہلے ہر گھر میں ہوتا ہے۔ رنگ برنگ کے کپڑے۔ کان پڑی آواز سنائی نہ دینا۔ سب کچھ کہنے کی کوشش میں کچھ بھی نہ کہہ سکنا۔ کمیونیکیشن ٹھیک طرح سے نہیں ہوتی اگر سننے کا وقت کم اور بولنے کی حاجت زیادہ ہو اسی شور میں کئی آوازیں بغیر سُنے۔ بغیر سمجھے۔ کھو جاتی ہیں۔ ڈھولک پر شادی کے گیت۔ اور آس پاس بیٹھی چند لڑکیاں۔! اسی ماحول میں دو ایک آنے والی شادیوں کی داغ بیل پڑنے کا امکان بھی ہوتا ہے۔ آنکھوں آنکھوں میں کچھ پیغامات بھی دیئے جاتے ہیں۔ اور پیغام وصول پانے کی خواہشیں کبھی کبھی چھوٹے چھوٹے رقعوں میں بدل کر کسی چھوٹے بچے کی ٹافیوں کا انتظام بھی کر دیتی ہیں۔

"تم نے اچھا کیا۔ آ گئے۔ ویسے تمہارے آنے تک یہ شادی روکی بھی جا سکتی تھی"۔ عارف نے ڈھولک کے شور سے ذرا دور ہوتے ہوئے ولید سے کہا

"بھابی دکھاؤ"

"بھابی۔؟ یہاں۔؟ میاں یہ سیالکوٹ ہے۔ لکسمبرگ نہیں۔ کہ دولہا اور دلہن۔ شادی اور نکاح سے تین دن پہلے ایک ساتھ پائے جائیں"

"تم نے دیکھی ہے"

"تو کیا بغیر دیکھے یہ شادی کر رہا ہوں۔ اب اتنا بھی گیا گذرا نہیں اپنا سیالکوٹ"

عارف کی ہونے والی دلہن۔ نسرین۔ اُسکی چچا زاد۔ پانچ بہنوں اور ایک بھائی میں سب سے چھوٹی۔ ایک مناسب شکل وصورت کی لڑکی۔ جسے سب "نیناں" کہتے تھے۔ بہنوں میں صرف اُس نے بی۔ اے کیا تھا۔ باقی سب دس دس جماعتیں پڑھ کے بیاہی گئی تھیں۔ بھائی پولیس میں چلا گیا۔ باپ بیمار تھا۔ اور ماں کو "اگر نیناں کی شادی ہو جائے تو میں دنیا پر آ جاؤں گی" کا ورد جلد ہی کام آ گیا۔

سی۔ ایس۔ ایس کے امتحان کی تیاری۔ عارف اور نیناں نے تقریباً ساتھ مل کر شروع

CamScanner

کی تھی۔ شروع کا تحریری امتحان دونوں نے پاس کیا اور اب فائنل انٹرویو سے پہلے۔ دونوں نے سوچا۔ کہ شادی کر لی جائے۔

"اگر نیناں فیل ہوگئی تو۔" ولید نے داستان سننے کے بعد پوچھا۔

" کیا فرق پڑتا ہے۔ شامی کباب ہی تو بنانے ہیں اُس نے۔ فیل ہو یا پاس ہو"

"اور اگر وہ پاس ہوگئی اور تم فیل ہو گئے تو" ولید نے پوچھا

"اِس کا امکان ذرا کم ہے"

1653 میں Chevalier de Mere۔ ایک جواری نے مشہور ریاضی دان Blaise Pascal سے رابطہ کیا۔ اور پوچھا کہ جوئے میں لگی رقموں کو کیسے تقسیم کیا جائے۔ اگر کھیل کو بیچ میں سے روکنا پڑے تو۔ Pascal نے ایک وکیل Pierre de Fermat کی مدد سے جو ریاضی کا طالبعلم بھی تھا۔ مل کر سوال کا جواب ڈھونڈا۔ جواب ڈھونڈنے کے عمل کے دوران ہی اُس تصور کی بنیاد پڑی جسے آج ہم Laws of Probability کہتے ہیں۔ پھر 20 ویں صدی کے انگریز ریاضی دانوں نے Mortality Tables کا تجزیہ کیا۔ جہاں سے پتہ چلا کہ کتنی عمروں کے کتنے لوگ کس کس طرح موت سے ہمکنار ہوئے۔ انہی اعداد و شمار سے انہوں نے حساب لگایا کہ مستقبل میں کتنے لوگ۔ کس تاریخ تک زندہ رہ سکتے ہیں۔ اور پھر 1699 میں پہلی انشورنس کمپنی کا وجود میں آنا بھی Pascal کے حساب کتاب کا نتیجہ تھا"۔

"اور جناب۔ یہ ریاضی کا سبق۔ آپ ایک شاعر کو کیوں یاد کرا رہے ہیں"

"ایسے ہی۔ Probability Theory کے تحت۔ تم دونوں کا تحریری امتحان پاس کرنا۔ اور اکٹھے پاس ہونا ممکن ہے۔ لیکن اتنے سارے variables ہیں۔ اور پھر تمہاری لیاقت سے زیادہ رزلٹ کا انحصار دوسروں کی لیاقت پر بھی ہے۔ صرف پاس ہی تو نہیں ہونا۔ میرٹ پر بھی آنا ہے۔ اور پاس یا فیل ہونے کی Probability نیناں کی اتنی ہی ہے جتنی تمہاری۔ !یار چائے تو پلواؤ"۔ ولید نے تشویش و تفکر کی ایک ہلکی سی لکیر عارف کے ماتھے پر ابھرتے دیکھی تو سوچا کہ بات بدلی جائے۔

"ہوں۔ یہ ٹھیک ہے۔ تمہاری باتوں نے سوچ میں ڈال دیا مجھے۔ مگر اُستاد نے کہا ہے نا۔ " ڈبویا مجھ کو ہونے نے۔ نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا"۔ خیر ہے۔ دیکھی جائے گی" اور عارف باورچی

CamScanner

خانے میں کسی سے چائے بنانے کا کہنے چلا گیا۔

صحن میں شور کچھ کم ہو رہا تھا۔ اگلے دن کی تیاریوں میں مصروف گھر والے۔ رخصت ہوتے ہوئے مہمانوں کا شکریہ ادا کر رہے تھے۔ بچپن کے دونوں دوست۔ رات گئے تک۔ آخری مہمان کے جانے کے بعد تک۔ بیٹھے ایک دوسرے سے دنیا جہان کی باتیں کرتے رہے۔ یہ وہی جولائی کی راتیں تھی جب اپنے کوٹھے کے ڈھارے سے چارپائیاں نکال کر صاف شفاف۔ کھلے آسمان کے نیچے۔ سدرہ، طلحہ، حمزہ اور ولید۔ اپنے ماں باپ کے ساتھ۔ ایک دوسرے سے باتیں کرتے کرتے سو جاتے تھے۔ سدرہ خاص طور پر دعا مانگ کر سوتی تھی کہ "یا باری تعالی۔ بارش نہ ہو جائے" ولید کو بچپن کی دھندلی یادیں دکھائی دے رہی تھیں۔ اور عارف اپنی پانچویں "تازہ غزل" سنانے پر مصر تھا۔

"اب تمہاری شادی ہونے والی ہے۔ کچھ پریکٹس کر لو" ولید کا پانچویں غزل سننے کا موڈ تھا نہ حوصلہ۔ اُسے نیند آ رہی تھی۔

" کس چیز کی پریکٹس"؟

"یہی۔ مرثیہ۔ نوحہ۔ منکبت وغیرہ" ولید نے مسکراتے ہوئے کہا اور گھڑی کی طرف اشارہ کیا۔ رات کو صبح میں ڈھلے تین گھنٹے ہو چکے تھے.....!

❀❀❀❀

◎
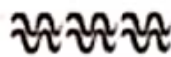
"سرمئی رنگ زندگی میں پس و پیش لاتا ہے۔ رنگ یا تو سفید ہوتا ہے یا کالا۔ میرا خیال ہے تم ہاں کردو۔ Caltax میں مینیجر۔ اچھا خاصا کما لیتا ہوگا لیکن معلوم کرلو۔ وہ پکاسو کو جانتا ہے کہ نہیں۔ Prado اور Louvre میوزیمز کے بارے میں اُسے کچھ علم بھی ہے کہ نہیں۔ اب دیکھو نا۔ تم ایک آرٹسٹ۔۔۔۔۔" ولید کو لاہور واپس آتے ہی صبا نے اطلاع دی کہ ماں نے ایک رشتہ آنے کی بات کی ہے اور دونوں بھائیوں کا خیال ہے کہ پڑھائی کافی ہوگئی۔ اب شادی ہو جانی چاہیئے۔

"آرٹسٹ تو میں ہوں۔ لیکن شوہر کا سلوا دور دالی ہونا یا نہ ہونا۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا"۔ صبا نے اپنے چہرے سے گھنگھریالے بالوں کی ایک لٹ ہٹاتے ہوئے کہا "سچ بتاؤں تو کسی بات سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ محسوس کرنے کی بات ہے۔ کسی نے باپ کی موت کو اپنی آزادی سمجھا۔ کسی نے ساری زندگی اُس کی یاد میں گذارنے کا فیصلہ کرلیا۔ کسی نے باپ کی موت پر ماں کے آنسو دیکھ کر اپنے راستے میں تبدیلی کر لی۔ اور وہ باپ جو ساری زندگی سچائی اور دیانت داری کے راستے پر چلا۔ اپنے چند بیٹوں کو ماں کا صحیح معنوں میں احترام کرنا نہ سکھا سکا۔ کیا فرق پڑا۔؟ کس پر فرق پڑا۔ یہ محسوس کرنے اور سوچنے کے عمل پر منحصر ہے"۔ ولید کو نجانے کیوں اچانک یہ سب یاد آنا شروع ہوگیا تھا۔

"تم ایک دن کوئی ایسے سائنسدان بنو گے جو اپنی ہی بنائی ہوئی کسی ایجاد کے ہاتھوں مارا جاتا ہے"۔ صبا کا جواب ولید کی سمجھ میں نہیں آیا

"یہ سائنسدان کہاں سے آگیا بیچ میں"۔ ولید نے سگریٹ بجھاتے ہوئے پوچھا۔

"بالکل ویسے۔ جیسے میرے رشتے کی بات میں تمہارے ابا جی کی موت آگئی تھی۔ کیسے دوست ہو تم۔! میری جان پر بنی ہے۔ گھر والوں نے ایک ہفتہ کے بعد فیصل آباد آنے کا الٹی میٹم

دیا ہے۔ رشتہ گھر والوں کو پسند ہے۔ اور میرے پاس جواب میں انکار کرنے کے لئے ایک بھی ٹھوس دلیل نہیں ہے"۔ صبا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"پڑھائی ختم ہوتے ہی شادی۔؟ کیا فیصل آباد میں لوگ۔ اپنی بیٹیوں کو سال دو سال آرام کرنے۔ تھوڑا گھومنے پھرنے۔ یونہی وقت گذارنے کے لئے وقت نہیں دیتے۔؟ کیا یہ دلیل کافی نہیں کہ ابھی بہت جلدی ہے۔ تھوڑا انتظار کر لیتے ہیں"۔ ولید کو خبر تھی کو صبا کس قسم کی "دلیل" اُس سے مانگ رہی تھی۔

"اچھے رشتے انتظار نہیں کرتے۔ مَیں تو انتظار کر سکتی ہوں۔ لیکن میرے گھر والے۔! کیا چھوٹی موٹی۔ کوئی منگنی نما چیز ہو سکتی ہے؟ اس میں کوئی obligations نہیں ہوتیں۔ یوں کچھ سال انتظار کرنے کا بہانہ مل جائے گا"۔ صبا نے آخر "دلیل" کی وضاحت کر ہی دی۔

"مجھے لگتا ہے اسلام آباد جانا ہی پڑے گا" ولید کسی گہری سوچ میں ڈوبا تھا۔

"منگنی اسلام آباد میں کریں گے"

"پاگل ہو گئی ہو۔! مَیں تو ویزے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ انٹرویو اسلام آباد میں ہوگا۔ پروفیسر آرتھر کا خط ہے۔ یونیورسٹی سے آفر ہے۔ فُل سکالر شپ کی۔ پاسپورٹ۔ تصویریں۔ سارے کاغذات مکمل ہیں۔ بس ایک بنک سٹیٹ منٹ کی کمی ہے"۔

"مَیں نے انکل ہارون سے بات کر لی ہے۔ وہ دفتر خارجہ سے ایک تعارفی خط تمہیں دلوا دیں گے۔ اور ویسے بھی انٹرویو تو تمہارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوگا۔ ایمبیسی والوں کو پہلی مرتبہ پتہ چلے گا کہ کوئی نوجوان۔ انٹرویو دینے کے لئے آیا ہے"۔ صبا اپنے سارے مسائل بھول کر ولید کے ویزے میں الجھ چکی تھی۔

"شروع کے کچھ دن۔ لگتا ہے پروفیسر آرتھر کے پاس ہی رہنا پڑے گا۔ اور پھر نوکری تلاش کرنی پڑے گی۔ جگہ ڈھونڈنی پڑے گی رہنے کے لئے۔ اور۔۔۔۔"

"کب تک جاؤ گے"

"کچھ ماہ بعد۔ ٹکٹ بن جائے تو اسلام آباد جاؤں گا۔ سنا ہے کہ ریٹرن ٹکٹ بھی مانگتے ہیں۔ اب مَیں نے اگر وہاں پڑھائی کرنی ہے تو ریٹرن ٹکٹ کی مدت کیا ہوگی۔؟ اور پھر کنفرم ٹکٹ میں تبدیلی ہو تو پیسے الگ ضائع ہوتے ہیں"۔

CamScanner

صبا نے دل میں کوئی دعا مانگی لیکن کچھ بولی نہیں۔ اُسے اب تک خبر ہو چکی تھی کہ ولید شادی تو کیا۔ منگنی کی بات بھی سننے کو تیار نہ تھا۔ کوئی وعدہ بھی نہیں۔ وہ اپنے مقصد کے حصول سے پہلے شادی کی بات کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ مگر وہ اِس دل کا کیا کرتی۔ جو پکار پکار کر کہہ رہا تھا۔ "روک لو اِسے صبا۔ یہ چلا گیا تو واپس نہ آئے گا۔ تم سُنسان ہو جاؤ گی۔ سب کچھ ختم ہو جائے گا"۔

" کیا سوچ رہی ہو" ولید نے سگریٹ سلگاتے ہوئے پوچھا" سوچ رہی ہوں۔ کہ مجھے ہی کچھ کرنا پڑے گا۔ تم تو ایک بڑے آدمی بن ہی جاؤ گے۔ میں ایک آرٹسٹ بھی بن جاؤں گی۔ لیکن ہم زندگی شائد ساتھ نہیں گذار سکیں گے۔ اور۔ تم اپنے ماموں حیدر کی طرح شائد زندگی گذار سکتے ہو۔ تم میں ہمت ہے۔ مجھ میں آنٹی تبسم بننے کا حوصلہ۔ شائد۔ نہیں ہے"۔

"تو پھر۔ Caltax۔ زندہ باد؟"

" نہیں۔ اِسکا یہ مطلب نہیں۔ اور اِسکا صحیح مطلب کیا ہے۔ ٹھیک طرح سے میں بھی نہیں جانتی۔ لیکن۔ ولید۔ مجھے میرے وجود کا ایک ایک حصہ۔ روزانہ یاد کراتا ہے کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ کسی اور کے نام کا دل میں آنا۔ یہ ناممکن ہے۔ یا تو تم ہو گے۔ یا پھر کوئی نہیں ہوگا"

"مدھو بالا۔ مجھے بھی اچھی لگتی ہے۔ بالکل مدھو بالا لگی ہو اِس وقت۔! دلیپ کمار کے سامنے۔ مجبور دلیپ کمار کے سامنے۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی۔ وہی ایک سوال۔ وہی ایک رٹ۔!"

"لڑکیوں کو سمجھنا ذرا مشکل ہوتا ہے ولید۔ تم نہیں سمجھو گے۔ اور میں اتنی سمجھدار نہیں کہ تمہیں سمجھا سکوں"۔

"مثلاً کیا"

"مثلاً یہ کہ تم بڑے آدمی بن جاؤ گے۔ تمہارے پاس دولت' عزت اور شہرت۔ سب ہو گا۔ لیکن یہ سارا کچھ۔ کس کے ساتھ share یا enjoy کرو گے۔؟ یادوں کے ساتھ؟ تتلیوں کے ساتھ۔ یا پھر کسی امریکی گوری کے ساتھ۔؟ اور پھر اُس گوری کے ساتھ انگریزی میں ہی باتیں کرو گے یا الف بے سکھاؤ گے پہلے۔؟ میں تمہیں نہیں سمجھا سکتی کہ زندگی۔ اصل میں۔ ایک دوسرے کے ساتھ رہنے۔ دکھ سکھ بانٹنے۔ اور ساتھ ساتھ چلنے کا نام ہے۔ اور میرے خیال میں۔ میرے ساتھ چلنے کے لئے۔ تم سے بہتر کوئی نہیں"

CamScanner

"تمہیں یہ کس نے کہا کہ میں امیر آدمی بنا چاہتا ہوں۔ یا مشہور ہونا چاہتا ہوں۔"؟

"تو امریکہ جا کر تم نے پراٹھے بنانے ہیں"۔ صبا نے ہنستے ہوئے کہا

"یہ تو وقت ہی بتائے گا۔ پراٹھا بنتا ہے یا نہاری۔ لیکن صبا۔ میں کچھ اور کرنا چاہتا ہوں۔ کچھ ایسا۔ جو تمہیں ابھی بتا دیا تو تم مجھے پاگل کہہ کر اپنے سارے فیصلے میرے خلاف کر دو گی"۔

"آزما کے دیکھو تو۔! اور پھر تم مجھے امریکہ ساتھ کیوں نہیں لے کر جا سکتے۔ شادی کرتے ہیں۔ اور اکٹھے امریکہ جاتے ہیں"۔

"ایسے جیسے بازار سے دو درجن انڈے لانے ہیں۔ تم تو یوں کہہ رہی ہو جیسے یہ سب بہت آسان ہے۔ میرا خیال ہے اب چلنا چاہئے۔ گفتگو بے معنی ہوتی جا رہی ہے" ولید نے ویٹر کو بلانے کے لئے ہاتھ کا اشارہ کیا۔

"ایک کتاب میں کل پڑھا تھا کہ پرانے یونانی لوگ ایک کُلیے کو بڑا استعمال کرتے تھے۔ وہی کلیہ جو بعد میں فیثا غورث نے اپنایا۔ تبدیلی کے ساتھ۔ پرانے یونانیوں کے مطابق اگر ہمیں کسی Right angled" تکون کی دو اطراف کا پتہ ہو تو تیسری طرف کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ اور اگر ہمیں تینوں اطراف کی لمبائی کا پتہ چل جائے تو ہم جان سکتے ہیں کہ تکون Right angled ہے کہ نہیں۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔؟" صبا نے پوچھا "ہوں۔" ولید نے چائے کا بل دیتے ہوئے کچھ ریزگاری ویٹر کے لئے پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہا" مجھے تمہاری دو اطراف کا پتہ ہے۔ تو کیا میں تیسری طرف کا اندازہ نہیں لگا سکتی۔؟ تم کیسے کہہ سکتے ہو کو میں تمہارے بارے میں نہیں جانتی"۔ صبا نے ایک ریاضی دان سے ریاضی کی زبان میں بات کرتے ہوئے جانے کیوں اپنی بات میں خاصہ وزن محسوس کیا۔

"مفروضہ ہے۔ مفروضے غلط بھی ہو سکتے ہیں۔ اور ویسے بھی ایک ایسی تکون۔ جو Right angled ہے ہی نہیں۔ اُسکے a، b اور c کے بارے میں وثوق سے بات نہیں کی جا سکتی۔ ویسے۔ یہ کس قسم کی کتابیں تم پڑھ رہی ہو آج کل۔؟"

"کتابوں کی بھی قسمیں ہوتی ہیں؟ ہاں۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ تمہارے سوچنے کا انداز۔ تکون کی تینوں اطراف کو اچھی طرح ماپنے تک ہے۔ کہیں جواب غلط نہ آ جائے۔ میں نے کہا نا۔ تم

CamScanner

لڑکیوں کو نہیں جانتے۔! لڑکیاں شائد صحیح جواب میں اتنی interested نہیں ہوتیں۔ اُنہیں تو تکون کے اندر رہنا کیسے ہے۔ تکون کے باہر کیا ہے؟ تکون خوبصورت ہے کہ نہیں۔ اِن سوالوں میں زیادہ دلچسپی ہوتی ہے"۔

"اب چلیں"۔ ولید نے جیسے صبا کی آخری بات سُنی ہی نہ تھی۔

"مطلب۔ کہ تم اب ریاضی کے حوالے بھی۔نہیں سنو گے؟" صبا کو لگا جیسے اُسکی پچھلے کئی دنوں کی محنت۔ ریاضی کی کتابوں کے کھنگالنے۔ اور مشکل concepts کو سمجھنے میں جو وقت لگا۔ سب ضائع ہو گیا۔ وہ ولید سے اپنی مرضی کا کوئی جواب نہ لے سکی۔

اپنے اپنے رکشے میں بیٹھنے سے پہلے دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ سر کے اشارے سے خدا حافظ کہا۔ اور اُس ایک نظر میں بہت سی ان کہی باتیں۔ بہت سے اندیشے۔ بہت سے خوف۔ ایک دوسرے کے دلوں میں منتقل ہوتے محسوس کیا۔ صبا کو محسوس ہوا۔ شائد زندگی صرف اور صرف اداسی اور تنہائی کا دوسرا نام ہے۔ ولید نے وقت کے آہستہ چلنے۔ اپنی رفتار کے کم ہونے۔ خوابوں کی آبیاری کے راستے میں آئے کانٹے چننے میں تکلیفوں اور اپنی ماں کے بارے سوچا۔ "لڑکیوں کی بات تو دوُر۔ مجھے تو صحیح طور پر یہ بھی سمجھ میں نہ آ سکا۔ کہ میرا باپ اتنا دیانت دار کیوں تھا۔ میری ماں نے کبھی کوئی شکائت کیوں نہیں کی۔؟ ماموں حیدر کا تکیوں سے کیا رشتہ تھا۔؟ بیوی۔ بھابی بنتی ہے تو کیا علم خودکشی کر لیتا ہے"۔

دو مختلف سمتوں میں۔ رکشے مڑے۔ اور اپنے پیچھے بہت سا دھواں چھوڑ گئے۔ اُس دھوئیں میں کہیں ولید اور صبا کی محبت بھی تھی۔ جو Cathay ریسٹورانٹ کے اندر۔ اُسکے گردنواح میں رچی بسی تھی۔ لیکن اِس وقت تازہ سانس کے نہ ہونے کی وجہ سے دھوئیں میں گم تھی۔

ﷲﷲﷲ

◎
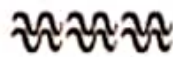
قذافی سٹیڈیم تماشائیوں سے بھرا پڑا تھا۔ لاہور میں کرکٹ کے شیدائیوں کے ساتھ ساتھ دوسرے شہروں سے بھی لوگ پاکستان اور ویسٹ انڈیز کا 40 اوورز ون ڈے دیکھنے آئے ہوئے تھے۔ ہوا میں ذرا سی خنکی تھی۔ اسی لئے ولید اور عارف نے ہلکے سوئیٹر پہن رکھے تھے۔ کچھ کھانے پینے کا سامان ساتھ تھا۔ دونوں کو ایک دوسرے سے بہت کچھ کہنا تھا۔ بہت کچھ سننا تھا۔ عارف کی شادی کے بعد دو ایک مرتبہ دونوں کی مختصر وقت کے لئے ملاقات رہی۔ لیکن ایک عرصہ کے بعد دونوں نے لاشعوری طور پر۔ ساری اہم باتیں۔ اسی دن کے لئے رکھ چھوڑی تھیں۔ عارف نے سی ایس ایس کے امتحان میں دو مرتبہ کوشش کے باوجود کامیابی حاصل نہ کی۔ دوسری طرف نیناں پہلی ہی کوشش میں کامیاب ہوکر ٹریننگ کے لئے سیالکوٹ سے لاہور آ گئی۔ ایک طرف عارف کی غزلیں اور نظمیں عروج پا رہی تھیں۔ اور دوسری طرف اُسے بیوی کے اعلیٰ افسر بن جانے سے اٹھنے والی مخالف ہواؤں کا سامنا تھا۔ اسلام آباد میں بیوی کے گھر رہنا اُسے اچھا نہ لگتا تھا۔ یوں وہ چند روز ٹھہر کر واپس سیالکوٹ چلا جاتا تھا۔ شاعری۔ پاکستان اور پاکستان جیسے کئی اور ممالک میں۔ کوئی پیشہ نہیں مانا جاتا۔ شاعر۔ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ۔ کسی ذریعہء معاش سے بھی منسلک ہو تو بات بنتی ہے۔ عارف کو کوئی مناسب نوکری نہ ملی تھی۔ تیسری مرتبہ امتحان دینے کا وقت گذر چکا تھا۔ اور یوں بیوی کا افسر بن جانا۔ اپنے پاس نوکری کا نہ ہونا۔ بیوی کا گھر۔ اور سیالکوٹ میں محلے کی عورتوں کے الٹے سیدھے سوالات۔ عارف کچھ بددل سا ہو گیا تھا۔ اُسکی غزلوں میں تلخی اور نظموں میں ایک عجیب سی بے چینی نظر آنے لگی۔ تلخی اور بے چینی۔ شاعری کو جلا بخشنے کے لئے مکمل طور پر کافی نہیں ہوتیں۔ ایک خاص قسم کی اداسی بھی ضروری ہوتی ہے۔ جو اُسے اس خیال نے دے دی کو شائد عملی طور پر وہ ایک ناکام آدمی ہے۔ شاعری اعلیٰ ہوتی چلی گئی۔ ازدواجی تعلقات بگڑتے گئے۔ محلے کی عورتوں کے سوالات کی نوعیت وہی رہی۔ اُدھر نیناں

CS CamScanner

کے بارے میں عارف کی غلط فہمیاں بڑھتی گئیں۔ نیناں کی گفتگو میں انگریزی کے الفاظ بڑھتے گئے۔ انہی فاصلوں کی طرح جو میاں بیوی کے درمیان روز بروز بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ نیناں کبھی کبھی ولید کو فون کر کے حالات سے آگاہ کرتی۔ اور ولید کو معلوم تھا کی شادی کے فوراً بعد۔ یا چند سال بعد رشتہ مضبوط ہونے سے پہلے دو ایک امتحان ضرور لیتا ہے۔ یوں۔ اُسکے لئے یہ معمول کے جھگڑے تھے۔ جو وقت آنے پر خود بخود ختم ہو جاتے ہیں۔

ولید نے اپنے ویزا لگنے۔ نیویارک جانے۔ اور "ماں کا خیال رکھنے" والی بات کرنی تھی۔ عارف نے اپنے واحد دوست کے امریکہ جانے سے پہلے۔ کچھ ضروری مشورے کرنے تھے۔ کرکٹ دونوں کو اچھی لگتی تھی لہٰذا قذافی سٹیڈیم میں سارا دن گذارنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اکثر باتیں اپنی توقعات کے مطابق نہیں ہوتیں۔ میچ اتنا دلچسپ تھا کہ دونوں تھوڑی دیر بعد باتوں کا سلسلہ توڑ کے گراؤنڈ میں محو ہو جاتے۔ عمران خان کے 51 رنز۔ وسیم اکرم اور وقار یونس کے آخری وقت میں لگائے دو دو چوکے کام آئے۔ میچ 186۔186 رن سے Tie ہو گیا۔ بالکل ایسے جیسے دونوں دوستوں کے اپنے اپنے مسائل کی نوعیت سامنے آنے پر یہ فیصلہ مشکل ہو گیا کہ کونسے مسئلے پر بات پہلے کی جائے۔ دونوں کے مسائل۔ اپنی اپنی جگہ وزنی تھے۔ ترازو کے دونوں پلڑوں میں۔ پڑے۔ ایک سے باٹ۔ لیکن نوعیت میں مختلف۔!

میچ کے نتیجے سے عارف اور ولید۔ دونوں کو۔ نہ خوشی تھی۔ نہ افسوس۔ برابر ہونے والے میچ بھی عجیب ہوتے ہیں۔ ایک ایسا تاثر دل میں چھوڑتے ہیں جس کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ انسان نے ابھی اپنے بہت سارے احساسات کو نام نہیں دیا۔

مین گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے دونوں نے سوچا کہ گفتگو تو ابھی بہت باقی ہے۔

"لبرٹی چل کر بیٹھتے ہیں۔ ویسے یہ انضام الحق کون ہے بھئی" عارف نے مشورہ اور سوال۔ ایک ساتھ داغ دیئے۔

"نیا لڑکا ہے۔ آج اس کا پہلا میچ تھا۔ اسکے سٹائل میں ایک عجیب سی لاپروائی ہے۔ جو عین وقت میں جیتا ہوا میچ ہرا سکتی ہے یا پھر دلیری کا روپ دھار لے تو ناممکن جیت کو ممکن اور سہل بنا دیتی ہے"۔ ولید نے اپنا مشاہدہ ظاہر کیا۔ لیکن عارف کو یہ نہ بتایا کہ نیا لڑکا اچھا کھیلتا ہے یا نہیں۔ اچھا کھیلے گا یا نہیں۔ یہ ولید کی فطرت تھی۔ وہ دو ٹوک نہیں۔ کم از کم چار اطراف میں نظر دوڑا کر بات کرتا

تھا۔

اُس کھلے سے ریسٹورانٹ میں چائے کا آرڈر دینے کے بعد دونوں دوستوں نے آس پاس سے آتی آوازوں کے طرف دھیان دیا۔ جیسے جاننے کی کوشش کر رہے ہوں کہ کسی اور کی کوئی بات۔ اپنی بات سے ملتی جلتی ہے۔ یا کسی اور کی خوشی یا دکھ اپنے کسی دکھ اور خوشی سے مماثلت رکھتے ہیں۔ بہت زیادہ جان پہچان بسا اوقات ایک دوسرے سے۔ تھوڑی دیر کے لئے۔ لاتعلق کر دیتی ہے۔ ایک نامانوس سی خاموشی۔ بلکہ اجنبیت در آتی ہے۔

"مجھے نہیں لگتا یہ شادی چلے گی" عارف نے خاموشی توڑی اور ردِّعمل جاننے کیلئے ولید کی طرف دیکھا۔

"شادی نہیں چلے گی۔ شادی چل نہیں سکتی۔ یا شادی چلانا نہیں چاہتے۔؟" ولید نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

"طلاق سے پہلے۔ اپنی شادی کو ایک موقع اور دینا چاہتا ہوں۔ تم پر بھروسہ ہے کہ تم سوچ سمجھ کر مشورہ دو گے۔ ویسے سچ پوچھو تو مشورے سے بات کہیں آگے پہنچ چکی ہے۔ وہ مجھے سمجھ ہی نہیں سکی۔ چھوٹی سی بیٹی ہے ہماری۔ نوکرانی کے حوالے کر کے چلی جاتی ہے۔ اپنے منحوس گھر والوں کے اثر میں ہے۔ یا پھر نوکری کا خمار ہے۔ تھوڑے بہت دن جو ساتھ گذرتے ہیں۔ لڑائی جھگڑے کی نذر ہو جاتے ہیں۔ سکون نام کی کوئی شے نہیں۔ سارے پیسوں کا حساب خود رکھتی ہے۔ جانتی ہے کہ میری نوکری نہیں ہے۔ پھر بھی باتوں باتوں میں جتا دیتی ہے کہ گھر کا خرچہ اُس کی کمائی سے چل رہا ہے۔ میرے مشاعروں پر جانے سے اُسے لگتا ہے وقت ضائع ہو رہا ہے۔ ذرا لکھنے کے لئے بیٹھنے لگوں تو بیٹی کو میرے پاس لے آئے گی۔ " آج نوکرانی نہیں آئی۔ مَیں نے Reception پر جانا ہے۔ ذرا سنبھال لو اِسے پلیز۔ اینڈ بی کیئرفُل۔ اِس کو وقت پر دودھ پلا دینا"۔ کیسا شعر اور کیسی نظم۔؟ اسی لئے سیالکوٹ واپس چلا جاتا ہوں۔ پھر فون پر فون آتے ہیں۔ "بیٹی تمہیں مِس کر رہی ہے۔ آ جاؤ"۔ اب چند ماہ کی بیٹی۔ کیسے کسی کو مِس کر سکتی ہے اور اُسے کس آلے کی مدد سے پتہ چلتا ہے کی بیٹی۔ باپ کو ہی مِس کر رہی ہے۔ مَیں نہیں جانتا۔ اپنے دفتر والوں کے ساتھ۔ اپنی سہیلی صاعقہ کے ساتھ۔ ہر کسی کے ساتھ ہنس ہنس کر بات کرتی ہے۔ میرے ساتھ ہوتی ہے۔ ہنسنا تو درکنار۔ بات کرنے پر بھی موت پڑ جاتی ہے۔ افسر ہے بھئی۔ اور

میں ٹھہرا ایک شاعر"۔ عارف بے تکان بولے جا رہا تھا اور ولید نے بھی درمیان میں ٹوکنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ حالات کی اصل نوعیت جاننا چاہتا تھا۔

"تمہارا خیال نہیں رکھتی؟"

"خیال۔؟ خیالوں ہی میں رکھتی ہوگی۔ سامنے تو کبھی اندازہ نہ ہو سکا کہ یہ میری بیوی ہے۔ کوئی ایک آدھ چیز ہو تو آدمی نمٹ بھی لے۔ میں نے کہیں جانا ہو تو ڈرائیور کو حکم ہوتا ہے کہ ڈراپ کرتے ہی واپس آ جانا۔ اور پھر واپس آنے کے لئے فون کرنا پڑتا ہے۔ اپنے لئے گاڑی چاہیئے تو سارا سارا دن ڈرائیور کو انتظار کرنے کے لئے بیگم صاحبہ باہر بٹھا دیتی ہیں۔ ہر سالگرہ پر اپنے بہن بھائیوں کو تحفے بھیجے گی۔ اور میرے لئے....."

"کوئی دوسری لڑکی تمہاری نظر میں ہے۔؟" ولید نے بات کاٹ دی۔

"دوسری لڑکی۔؟ بے شمار لڑکیاں ہیں۔ جو میرے فن کی قدر کرتی ہیں۔ میرے شعر کو سمجھتی ہیں۔ میرے ساتھ رہنا چاہتی ہیں۔ بہت ہیں۔ لیکن اُس زاویے کی ایک بھی نہیں۔ جس کا تم پوچھ رہے ہو"

"نیناں کیا کہتی ہے؟ وہ بھی طلاق لینا چاہتی ہے؟ بات کی ہے اُس کے ساتھ"۔

"اُسے کچھ اندازہ ہے"

"یعنی ابھی تک تم نے۔ آمنے سامنے بیٹھ کر۔ سنجیدگی سے اِس موضوع پر بات ہی نہیں کی۔؟" ولید واقعی حیران ہو گیا تھا۔

"میرا خیال ہے روز روز کے لڑائی جھگڑے۔ کافی ہیں یہ جاننے کے لئے کہ اب خوشی کے راستے مسدود ہو چکے ہیں"۔ عارف کو بھی اچانک خیال آیا کہ واقعی۔ "طلاق"۔ کے موضوع پر تو بات ہوئی نہیں۔ کبھی بھی نہیں۔!

"کھانا کھاتے ہیں۔ اور پھر سیالکوٹ چلتے ہیں۔ ابھی۔!" ولید نے کہا۔

"سیالکوٹ؟۔ لیکن نیناں تو اسلام آباد ہے!"

"اسلام آباد بعد میں جائیں گے۔ میں ذرا تمہارے گھر اور نیناں کے امی ابا سے کچھ دیر بات کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تم بُرا نہ مانو۔ مجھے لگتا ہے کہ کچھ تفصیل جاننی ضروری ہے۔ مجھے نیناں سے بات بھی کرنی ہے۔ وہیں سے اسلام آباد جائیں گے۔ یوں۔ سیٹھ سے دو دن چھٹی بھی مل

جائیگی۔ اور راستے میں ماں سے ملاقات بھی ہو جائے گی۔ ایک ماہ سے اُن سے بات تک نہیں ہوئی"۔

"اور وہ تمہاری باتیں۔ جو کرنی تھیں"۔ عارف کو یاد آیا کہ قدافی سٹیڈیم میں ملنے کا اور سارا دن باتیں کرنے کا آئیڈیا ولید کا تھا۔!

"وہ بھی کر لیں گے۔ تمہارا مسئلہ زیادہ اہم ہے۔ اور فوری بھی۔ چلو چلتے ہیں"۔!

سیالکوٹ میں ایک رات اور ایک دن گذار کے ولید کو اندازہ ہوا کہ شاعر کو شادی کرنی ہی نہیں چاہیئے۔ عارف کے باپ نے صرف ایک بات کی۔ "ایک انگلی دوسروں کی طرف اٹھائیں تو باقی چار اپنی طرف اٹھتی ہیں"۔ نیناں کی ماں نے رو رو کر معافیاں مانگیں۔ "میری بچی کا گھر بسا رہے بیٹا۔ مجھے اور کچھ نہیں چاہیئے"۔ ولید نے اِن سب ملاقاتوں میں اِس بات کا خاص خیال رکھا کہ عارف وہاں موجود نہ ہو۔ اور یوں جو کچھ اُسے معلوم ہوا وہ تقریباً سچ تھا۔

سیالکوٹ سے راولپنڈی صبح سویرے ایک ریل کار چلتی تھی۔ دونوں دوست اُس پانچ گھنٹے کے سفر میں زیادہ تر خاموش رہے۔ عارف جاننا چاہتا تھا کہ ولید نے ابھی تک کیا معلوم کیا ہے۔ اور ولید۔ نیناں سے بات کیئے بغیر۔ کوئی بات بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اُسے اِس بھاری ذمہ داری کا احساس تھا۔ جسے اٹھانے سے پہلے۔ اُس نے سوچا تھا کہ دیکھ بھال کر ہی کوئی بات عارف سے کی جائے گی۔ پچاس سے اکاون کر دینے والی ایک بات ہی کافی تھی۔ اور معاملہ ایک بچی کا۔ ایک شادی کا۔ اور دوست کی خوشی کا تھا۔ تھوڑی دیر میں عارف سمجھ گیا کہ ولید ابھی بات نہیں کرے گا۔!

راولپنڈی ریلوے اسٹیشن سے اسلام آباد سیکٹر F-6/1 تک کا راستہ ٹیکسی نے تقریباً ایک گھنٹے میں طے کیا۔ مری روڈ پر ہمیشہ کی طرح اُس دن بھی رش بہت زیادہ تھا۔ دروازے پر گھنٹی دی تو نوکرانی باہر آئی۔ "سلام صاحب"۔ اور نوکرانی نے دونوں کے لئے دروازہ کھول دیا۔ دو بیڈ روم کا یہ فلیٹ نما گھر نیناں کو سرکار کی طرف سے ملا تھا۔ گھر میں بے ترتیبی سے پڑی چیزیں۔ فرنیچر۔ اور ذاتی ضروریات کی اشیاء کا ادھر اُدھر نظر آتا۔ صاف پتہ چل رہا تھا کہ گھر میں رہنے والے کتنے صفائی پسند ہیں۔ " افسروں کا گھر اندر سے ایسا ہوتا ہے۔؟" ولید نے سوچا اور عارف سے کہا کہ چائے کا انتظام کرو۔

CamScanner

"بیگم صاحب بس آنے ہی والی ہونگی۔ میری چھٹی کا ٹائم ہو گیا ہے۔ رخشاں بی بی کو دودھ پلا دیا ہے۔ وہ کچھ دیر تک سوئی رہے گی۔ اگر آپ اجازت دیں تو صاحب جی۔ میں جاؤں"۔ نوکرانی نے چائے میز پر رکھتے ہوئے کہا" یہ کپ کونسے لائی ہو۔؟ میرا کپ کدھر ہے؟" عارف نے کہا اور اپنا کپ ڈھونڈنے باورچی خانے کی طرف چلا گیا

"سارے کپ ایک جیسے ہیں صاحب" نوکرانی نے ولید کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

" کیسے لگتے ہیں تمہیں عارف صاحب"۔ ولید نے اچانک سوال کیا

"صاحب جی اچھے ہیں صاحب۔ بس ذرا حسابی کتابی ہیں۔ کہتے ہیں ایک منٹ میں ساٹھ سیکنڈ ہوتے ہیں۔ اور سچ پوچھیں تو صاحب مجھے یہ بات سمجھ ہی نہیں آئی کبھی"۔ نوکرانی نے عارف کو آتے دیکھا تو جلدی سے اپنی چادر درست کرتی ہوئی باہر چلی گئی۔

دو گھنٹے بعد نیناں گھر آ گئی۔ گاڑی دروازے کے پاس رکنے کی آواز آئی تو عارف نے ولید سے کہا۔

"اور اگر نوکرانی اپنے وقت پر چلی جاتی۔ تو دو گھنٹے رخشاں اکیلی ہوتی نا۔؟"

"ارے۔ آپ۔ آپ دونوں۔؟ السلام علیکم۔ فون کر دیتے تو ڈرائیور کو بھیج دیتی۔ کب سے آئے ہیں آپ" نیناں نے حیرانی میں بہت سی باتیں کر دیں۔ دونوں کو اکٹھا دیکھ کر۔ ایک لمحے کے لئے وہ دل میں خوفزدہ بھی ہوئی۔ اس طرح۔ عارف اور ولید۔ کا ایک ساتھ۔ اچانک آنا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔

" کیسی ہو نیناں"۔ ولید نے نہائت پر سکون لہجے میں پوچھا

" ٹھیک ہوں ولید۔ ایوری تھنگ از فائین۔ تم سناؤ" نیناں نے ساتھ والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"میں تمہارے اور عارف کے گھر سے ہو کر آ رہا ہوں۔ معاملہ سنجیدہ ہے۔ عارف کچھ فیصلہ کرنا چاہتا ہے۔ تم بات کرو گی"۔ ولید کا لہجہ بدستور پر سکون تھا۔

" خیریت ہے؟" نیناں نے اپنے دل میں آئے خوف کو سب سے بری شکل میں دیکھا اور اندر سے لرزنے لگی۔

"ہوں۔ خیریت ہونی چاہئے۔ تم فریش ہو جاؤ۔ دفتر سے آئی ہو۔ رات کا کھانا باہر

CamScanner

کھائیں گے"۔ولید بات کرنے سے پہلے نیناں کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔!

کچھ دیر بعد عارف اپنے بیڈروم میں ٹی وی دیکھ رہا تھا اور ڈرائنگ روم میں ولید اور نیناں۔ایک شادی اور ایک بچی کے مستقبل پر بات کر رہے تھے۔!

"تم بھی وہی چاہتی ہو جو عارف چاہتا ہے۔طلاق؟"۔ولید نے جیسے نیناں کے خوف کو اصلی شکل دے دی"طلاق لینی ہوتی تو اُسی دن لے لیتی جب اس نے مجھے پہلی مرتبہ مارا تھا"۔ نیناں نے کہااور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ولید سے کسی بھی قسم کے آنسو دیکھے نہ جاتے تھے۔اُس نے بچپن میں اپنی ماں کو کئی مرتبہ روتے دیکھا تھااور ماں روتی تھی تو اُسے کچھ سمجھ نہیں آتا تھا کہ کیا کرے۔اُس کا بس نہ چلتا تھا۔کہ ان آنسوؤں کو کیسے روک دے۔

"رو کر نہیں نیناں۔پلیز۔!" ولید نے سامنے پڑا پانی کا گلاس نیناں کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

"تمہارے دوست نے دیئے ہیں یہ آنسو۔دفتر میں دس منٹ زیادہ رکنا پڑے۔تو گھر آکر مار پڑتی ہے۔طعنے دیتا ہے کہ کس کے ساتھ لیٹی ہوئی تھیں۔اسلام آباد سے اِسکے برتھ ڈے پر پھول بھجواؤں تو سیالکوٹ سے فون آجاتا ہے۔کس کس کو یہ پھول دیتی ہو۔میری ساری تنخواہ خود خرچ کرتا ہے۔اور پھر مہینے کے آخر میں تقاضا ہوتا ہے کہ پیسے دو۔ایک سال کی ہو گئی ہے رخشاں۔آج تک اِس نے بچی کو گود میں نہیں اٹھایا۔سنو گے۔کہتا ہے یہ کسی اور کی اولاد ہے۔اب اللہ نے بیٹا نہیں دیا تو میں کیا کروں۔یہاں ہوتا ہے تو میَں اور رخشاں اِسکے کمرے میں نہیں جا سکتے۔کمرے میں ایک کال بیل لگوائی گئی ہے۔کوئی چیز چاہیئے تو گھنٹی بجا کر مجھے بلاتا ہے۔میرے تو فلک کو پتہ نہیں تھا کہ میری نوکری۔اِس طرح میرے گھٹنوں میں بیٹھ جائے گی"۔نیناں نے پانی کا گھونٹ لیا۔

"بولتی رہو۔میَں سُن رہا ہوں"ولید کے لئے یہ سب کچھ بالکل نیا تھا۔

"ایک دن دفتر میں شام ہوگئی۔واپسی پر اس نے۔اس نے۔میرے پورے خاندان کو۔ایک ایک کا نام لے کر گالیاں دیں۔ایسی گالیاں جو میَں نے کبھی سیالکوٹ میں بھی نہیں سُنی تھیں۔دیر کیوں ہوئی۔؟کس کے ساتھ تھیں۔کیا کر رہی تھیں۔میَں نے جب کہا کہ باس نے

روک لیا تھا۔ سارے دفتر کے لوگ موجود تھے۔ ایک ڈیڈ لائن meet کرنی تھی۔ رات گیارہ بجے مجھے گاڑی میں بٹھا کر میرے باس کے گھر لے گیا۔ کہتا تھا۔ میں جھوٹ بولتی ہوں۔ بیل دی۔ میرے باس کو جگایا۔ اُس سے بات کی۔ پوچھا اتنی دیر نیناں دفتر میں تھی کہ نہیں۔؟ میں پاس کھڑی تھی۔!! ذلت کی انتہا ہوگئی۔ کیا عزت رہ گئی میری۔ میرے باس نے کیا سوچا ہوگا۔؟ واپس آئے تو بے دریغ مجھے مارنا شروع کر دیا۔ کہتا تھا کہ تم اور تمہارا باس دونوں ملے ہوئے ہو۔ جھوٹ بولتے ہو۔ اپنی سوجی ہوئی آنکھ لے کر اگلے دن دفتر کیسے جاتی۔ ایک ہفتے کی چھٹی لینی پڑی"۔!

" کس کس کو پتہ ہے کہ عارف تمہیں مارتا ہے"۔

" کس کس کو نہیں پتہ۔؟ لوگوں کو میرے چہرے۔ میرے بازوؤں پر لگے تازہ نشان نظر نہیں آتے۔ ہمسائے میں شبیر صاحب۔ میرے دفتر میں کام کرتے ہیں۔ کیا انہیں آوازیں۔ گالیاں سنائی نہیں دیتی ہوں گی۔ نوکرانی ہے۔ اس نے کئی مرتبہ بیگم صاحبہ کو مار پڑتے دیکھا ہے۔ سب کو پتہ ہے"۔

"تو پھر۔؟ یہ سلسلہ کب تک چلے گا۔؟ کیوں مارتا ہے؟۔ کوئی وجہ تو ہوگی۔ پاگل نہیں ہے وہ۔ اس ملک میں ایک اعلیٰ شاعر کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ لفظوں کی حرمت کا خیال ہے اُسے۔ بتاؤ۔ اور بتاؤ۔" ولید کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اس گھر سے کہیں دور چلا جائے۔ اسی وقت۔ اُسے اپنے دوست کا یہ روپ قطعی اچھا نہ لگا تھا۔ مگر وہ اپنے دوست کی دوستی کو نظر میں رکھے ہوا تھا۔

"الماری میں تمام قمیضیں ایک خاص ترتیب سے پڑی ہونی چاہیں۔ سارے ہینگر ایک طرح کے۔ ایک رنگ اور وزن کے ہونے چاہیں۔ کسی دوسرے رنگ کا ہینگر نظر آ جائے تو کھینچ کر میری کمر پہ مارا جاتا ہے۔ خاص قسم کا کپ۔ خاص قسم کی پلیٹ۔ خاص چمچ۔ ایک دن غلط چمچ سامنے رکھنے پر مار پڑی کہ یہ وہ چمچ نہیں جو اُس نے علیحدہ کر کے رکھا تھا صرف اپنے استعمال کے لئے۔ اب مجھے کیا پتہ۔ سیٹ کے سارے چمچے ایک جیسے ہوتے ہیں۔ یہ تو بعد میں پتہ چلا کہ اُس نے اپنے چمچ کے پیچھے کوئی خاص نشان لگا رکھا تھا۔! کیا شاعری یہ سب کچھ سکھاتی ہے۔؟ بڑا شاعر بنتا ہے۔" نیناں بولتی جا رہی تھی۔

"میرے بائیں کان کے تقریباً سارے بُندے misplaced ہیں۔ اس لئے کہ رخشاں کو لے کر گاڑی میں بیٹھوں تو وہ بایاں بُندہ اتار لیتی ہے۔ میں نے بُندے پہننا ہی چھوڑ دیا

ہے۔اور اس نے رخشاں کو کبھی گود میں نہیں اٹھایا۔ کہتا ہے میرے بازو کی استری خراب ہو جائے گی۔ بچپن میں جب میرے ہاتھ یا پاؤں کو چوٹ لگتی تھی تو میں ماں سے کہتی تھی۔ کہ یہ ہاتھ اور پاؤں۔ علیحدہ علیحدہ روتے تو ہوں گے۔ اور مجھے اپنی تکلیف سے زیادہ اپنے ہاتھ اور پاؤں کی تکلیف کا سوچ کر رونا آتا تھا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ ایک دن میرے بدن کی چھوٹی چھوٹی۔ ساری ہڈیوں کا رونا بھی مجھے برداشت کرنا پڑے گا"۔ نیناں بولتے بولتے رُکی۔ عارف کمرے سے نکل کر باورچی خانہ جا رہا تھا۔

"تم تھرما میٹر کا کیا کرتے ہو"۔ نیناں نے ایک اچانک سوال ولید سے کیا۔

"بخار۔ درجہ حرارت دیکھتے ہیں"۔ ولید کو سوال کی سمجھ نہ آئی تھی۔

"ھمارے گھر میں کم از کم پندرہ تھرما میٹر ہیں۔ ہر قسم اور ہر نوعیت کے۔ ھمارے گھر میں تھرما میٹر چائے کا درجہ حرارت ماپنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ شاعر صاحب کو ایک خاص درجہ حرارت والی چائے پینے کی عادت ہے۔ ایک درجہ کم۔ یا ایک درجہ زیادہ۔ اور وہ چائے۔ پیالی اور پلیٹ سمیت میری طرف پھینک دی جاتی ہے"۔

نیناں نے سر کے بال ذرا سا سرکا کے وہ جگہ دکھائی جہاں ایک نشان بتا رہا تھا کہ چائے کا درجہ حرارت مناسب مقام سے ہٹا ہوا ہو گا۔

"اتنا کچھ تم نے کیوں سہا"۔ ولید سے تھرما میٹر والی بات سنبھالی نہیں جا رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا۔ کہ یہ عارف۔ وہی عارف ہے جو پچھلے کئی برسوں سے اُس کے ساتھ ہے۔ یا یہ عارف کوئی اور شخص ہے۔؟

"قسمت۔ امی کہتی ہیں۔ یہ میری قسمت ہے" نیناں نے گیلی آنکھوں سے ولید کو دیکھا۔ اُسکے ہاتھ کی دس کی دس انگلیاں ایک دوسرے کے ساتھ سختی کے ساتھ جڑی ہوئی تھیں۔ اور بائیں پاؤں پر دایاں پاؤں مضبوطی سے رکھا ہوا تھا۔

"تمھیں لگتا ہے۔ بات بن سکتی ہے"۔

"نہیں"

"تو پھر علیحدگی۔ طلاق"۔ ولید شائد کسی نتیجے پر پہنچ چکا تھا

"نہیں۔" طلاق کے سوال پر نیناں کی "نہیں" بڑی مشکل سے حلق سے نکلی۔ ولید

CamScanner

نے اس" نہیں" کو نہ سُنا۔ وہ مشرقی عورت کی بے بسی کے کئی باب اپنے سامنے کھُلتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ ایک پڑھی لکھی۔ برسرِ روزگار۔ افسر خاتون۔ روزانہ خاوند کی مار کھاتی ہے۔ گھر کا خرچہ خود چلاتی ہے۔ خاوند کو کھلاتی ہے۔ رسوا ہو جاتی ہے۔ لیکن طلاق کے لفظ سے گھبراتی ہے۔ حد ہے۔!

"بچی کی وجہ سے؟ یا کوئی اور وجہ ہے"۔ ولید نے سوچا کہ یہ آخری مُہرہ بھی دیکھ لیا جائے۔!

"یہ بھی۔ اور ویسے بھی۔ میرے ماں باپ لوگوں کو کیا جواب دیں گے۔ مَیں تو بچی پال لوں گی۔ ماں باپ یہ روگ نہیں پال سکتے۔ اتنی جلدی۔؟ معاشرہ عورت کو ہی بُرا گردانتا ہے۔ اس نے صرف ایک بات کرنی ہے اور فیصلہ اِسکے حق میں ہو جائے گا۔ "یہ بچی میری نہیں ہے"۔

"مَیں ذرا عارف سے دو ایک باتیں کر لوں؟ تم منہ ہاتھ دھو لو۔ پھر باہر چلتے ہیں"۔ ولید نے کہا اور عارف کو آواز دے کے بلایا۔

"وہ طلاق نہیں چاہتی۔ کہتی ہے اُسے تم سے محبت ہے۔ وہ تمہیں کھونا نہیں چاہتی۔ معافی مانگتی ہے۔ کرتے ہو اُس کو معاف"۔ ولید نے سراسر جھوٹ بولا۔

"مجھے معلوم ہے میرے بغیر یہ نہیں رہ سکتی"۔ عارف کا جواب سُن کر ولید نے ایک لمحے کے لئے سوچا کہ مرد کتنے بے وقوف ہو جاتے ہیں۔ خصوصاً عورتوں کے بارے میں۔!

"معاف کرتے ہو۔" ولید سوچ کچھ اور رہا تھا اور پوچھ کچھ اور۔!

"معافی کیسی۔ چائے تو اس کو بنانی نہیں آتی ابھی تک"۔

"تمہارے سی ایس ایس میں نمبرز زیادہ آ جاتے۔ تم بھی افسر بن جاتے۔ اور نیناں اپنے نہیں بلکہ تمہارے گھر میں رہتی۔ گھر کا خرچہ تمہاری کمائی سے چلتا۔ بچی کے بجائے بیٹا ہوتا۔ تو کیا نیناں کو چائے بنانا آ جاتی"۔ ولید کے لہجے میں ہلکی سی تلخی تھی۔

"یہ ایک علیحدہ بحث ہے" عارف گھبرا سا گیا۔

"شعر کا اصلی حُسن اُسکے باطنی مطلب میں ہوتا ہے۔ شعر کی تشریح فقیر۔ درویش۔ صوفی۔ طالب علم۔ شاعر۔ سب اپنی اپنی نظر سے دیکھ کر کرتے ہیں۔ یہ الگ قصہ کہ شعر کے خالق کے ذہن میں شعر کا کوئی بالکل جدا مطلب ہو۔ ضروری ہے کہ شعر کا ایک ہی مطلب نکالا جائے"۔ ولید نے کہا۔

CamScanner

"شعر۔ شادی کے مسائل میں کہاں سے کود پڑا" ؟

"یہی میں کہنا چاہتا ہوں۔ شاعری اور شادی دو الگ الگ دنیائیں ہیں۔ ایک دنیا میں ستارے اور گلاب۔ خواب چُنتے ہیں۔ دوسری دنیا میں پانی اور بجلی کا بل ادا ہوتا ہے۔ ایک دنیا خوبصورتی کے سراب میں زندہ رکھتی ہے۔ دوسری دنیا میں حقیقتوں کے پتھر اٹھواتی ہے۔ مشقت کراتی ہے۔ لگان وصول کرتی ہے۔ شاعر تم بہت اچھے ہو۔ شادی ایک الگ گورکھ دھندا ہے۔ یہاں مصلحت اور مصالحت۔ دونوں نہ ہوں تو بات نہیں بنتی۔ اور شاعری میں مصلحت اور مصالحت۔ شعر کا قتل ہوتا ہے۔ آخری مرتبہ تم نے نیناں کی کسی بھی چیز کی تعریف کب کی تھی"۔

"تعریف۔؟ نیناں کی۔؟ اُس نے کیا ایسا کیا جو تعریف کی جائے۔"

"مثلاً آج تم نے کھانا اچھا بنایا۔ رخشاں کتنی پیاری بچی ہے۔ تمہارا ہیئر اسٹائل بہت اچھا ہے۔۔ یا پھر۔ برتھ ڈے پر کوئی تحفہ خرید کر دیتے ہوئے کہا کہ اُسکی آنکھیں کتنی خوبصورت ہیں۔ وغیرہ وغیرہ"

"نہیں۔ یاد نہیں پڑتا۔ عورت اگر خوبصورت ہے تو اُسے خبر ہوتی ہے کہ وہ حسین ہے۔ تعریف کیسی۔؟ ایسی تعریف تو بلا جواز ہوئی۔ جھوٹ۔!"

عارف کے جواب نے ولید کو اچھی طرح بتا دیا کہ یہ شادی زیادہ دیر تک نہیں چل سکتی۔ اُسے حیرت ہوئی کہ عارف لفظوں کو سمجھتا ہے۔ حرفوں کو ترتیب دیتا ہے۔ عورت کو پورا نہ سہی۔ کچھ تو سمجھتا۔ خوبصورت عورت ہی کو تو تعریف کی ضرورت ہوتی ہے۔ بدصورت کی تعریف تو خود اُس عورت کو گالی کی طرح کی لگتی ہے۔ اور پھر بیوی۔ خوبصورت یا بدصورت تو ہوتی ہی نہیں۔ وہ تو ایک ساتھی ہوتی ہے۔ اور اپنا ساتھی بدصورت کیسے ہو سکتا ہے۔؟

☙☙☙☙

Mr. Zaheer Abass Rustmani

CamScanner

◎

مہینوں کے انتظار کے بعد۔ امریکہ کے ویزا ملنے اور ماں کے شدید علیل ہونے کی خبریں ولید کو تقریباً ایک ساتھ ملیں۔ صبا سے ایک "فیصلہ کُن" گفتگو بھی اُنہی دنوں ہوئی تھی۔ عارف اور نیناں کی طلاق کی خبر چند روز پہلے ولید تک پہنچ چکی تھی۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی اور ایک ساتھ ہوا کہ ولید کو حالات سمجھنے کا وقت نے صحیح طور پر وقت ہی نہ دیا۔ ایک طرف مستقبل اور امریکہ جانے کی خوشی۔ دوسری طرف ماں کی شدید بیماری۔ صبا نے آخری ہاں یا ناں کی بحث چھیڑ کر آخر کار "ناں" سُن ہی لی۔ نیناں سے عارف کو ایک آخری موقع دینے کی بات بھی نہ ہو سکی۔ وہ روز روز کے لڑائی جھگڑوں سے تنگ آ کر ایک دن خود ہی مفتی اور عدالت کے پاس چلی گئی۔ کسی بُری فلم کی طرح اہم واقعات ایک ساتھ وقوع پذیر ہو رہے تھے۔ ولید رشتوں کی اتھل پتھل میں اپنے روشن مستقبل کے خواب ڈوبتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ کس کی طرف پہلے توجہ دی جائے؟ کس کو ولید کی اس وقت زیادہ ضرورت تھی۔؟ ٹکٹ کنفرم کرانا اہم تھا کہ سیالکوٹ ماں کے پاس جانا۔؟ یہی وہ سوالات تھے جو ولید کو اُس دن لاحق تھے جب سدرہ کا فون آیا اور روتے روتے اُس نے بتایا کہ اُسکے بیٹے کا ہرنیہ کا آپریشن بگڑ گیا ہے اور وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں ہے۔ تو کیا لاہور سے کراچی جا کر بھانجے کی دیکھ بھال کی جائے یا ماں کا حال پوچھنے جانا چاہیئے۔؟ زندگی میں شائد پہلی مرتبہ ولید نے اپنے آپ کو بالکل تنہا۔ بے یار و مددگار۔ اور کسی حد تک کنفیوزڈ محسوس کیا۔ سورہ والعصر میں سنائے گئے فیصلے "یقیناً انسان خسارے میں ہے" کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور چاروں طرف گرد و غبار میں ڈوبے حالات کو سنبھالنے کی کوششیں کرتے ہوئے ولید کو کسی دوست کی ضرورت تھی۔ صبا روٹھ کر جا چکی تھی۔ عارف عدالت میں طلاق کی پیشیاں بھگت رہا تھا۔ ماں بیمار اور سدرہ اپنی تکلیفوں میں۔!

"To hell with it" کہتے ہوئے ولید نے سگریٹ بجھایا۔ اور سیالکوٹ جانے

CamScanner

کے لئے اپنا چھوٹا سا بیگ بنانے لگا۔

"انکل۔آپ کو پتہ ہے۔ جہاز میں رکھے بلیک باکس کا اصل میں رنگ نارنجی ہوتا ہے"۔بس میں بیٹھے ایک بچے نے ولید کے خیالات کو اِدھر اُدھر جانے سے روکتے ہوئے کہا۔

"نہیں بیٹا۔لیکن تم مجھے یہ کیوں بتا رہے ہو"۔ولید نے بچے کے پاس دوسری طرف بیٹھے پچاس پچپن برس کے اُس شخص کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ جو ایک موٹی سی کتاب میں کہیں غرق تھا۔

"پھر تو آپ کو یہ بھی پتہ نہیں ہوگا کہ روس میں انقلابِ اکتوبر اصل میں نومبر کے مہینے میں آیا تھا"۔پندرہ سولہ سال کے اُس بچے نے چھوٹے سائز کی ایک کتاب سے دیکھ کر کہا۔

"یہ مجھے پتہ ہے"۔ولید نے دیکھا کہ وہ پچاس سالہ شخص اب دونوں کی گفتگو سُن رہا تھا۔

"اور سو سالہ جنگ۔بھی پورے ایک سو سولہ برس چلی تھی"۔اُس اجنبی شخص نے گفتگو کو مزید دلچسپ بناتے ہوئے لقمہ دیا۔بس تھوڑی دیر کے لئے گوجرانوالہ کے سٹاپ پر رُکی۔مسافر ایک ایک کر کے بس سے اترنے اور کچھ کھانے پینے کے لئے ساتھ والے ریستورانٹ میں جانے لگے۔ولید نے سر کے اوپر رکھے بیگ کی طرف ہاتھ بڑھایا اور سگریٹ کی ڈبیہ نکالی۔

"ذرا رکنا نوجوان"۔اُس اجنبی شخص نے ولید کی ہتھیلی کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا

"جی"۔!

"ذرا اپنا دایاں ہاتھ مجھے دکھانا"۔

"لیجیئے"۔ولید نے سگریٹ کی ڈبیہ بائیں ہاتھ میں تھام کر دایاں ہاتھ آگے کر دیا۔چند لمحوں تک ولید کا ہاتھ اُس اجنبی شخص کی آنکھوں اور موٹے موٹے شیشوں والی عینک کی زد میں رہا۔

"چائے پئیں یا کوئی ٹھنڈا۔میرا نام کرامت میرزا ہے"۔اجنبی نے تعارف کراتے ہوئے چائے کی آفر بھی دے دی۔

"مَیں ولید ہوں۔خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔آپ نے میرے ہاتھ میں کیا دیکھا"۔

کچھ دیر کے لئے ولید اپنی تمام پریشان سوچوں سے دور سا ہوگیا۔

CS CamScanner

"یہی کہ تمہاری ایک بہن ہے۔ دو بھائی ہیں۔ والدین میں سے ایک فوت ہو چکا ہے۔اور تم ایک نہائت ذہین نو جوان ہو"۔

"لیکن یہ تو۔! کیا آپ نے یہ سب دیکھنے کے لئے میرا ہاتھ دیکھا" ولید نے چائے اور بسکٹوں کا آرڈر دیتے ہوئے پوچھا" نہیں۔ یہ تو صرف تمہیں بتایا کہ مجھے پامسٹری کی سمجھ ہے۔ اصل میں دلچسپی کی بات تمہاری یہ لکیر ہے"۔ کرامت میرزا نے ایک گہری ہوتی لکیر کی طرف اشارہ کیا" کیا ہے اِس میں۔کوئی خاص بات؟"

"ہوں۔خاص ہی تو ہے"

" آپ کچھ وضاحت کریں گے؟"

"ایک شرط پر۔تمہیں میرے دو ایک سوالوں کا جواب پہلے دینا ہوگا"۔

دونوں اب واپس بس میں بیٹھ چکے تھے۔تقریباً ایک گھنٹے کا سفر ابھی باقی تھا۔

"منظور"۔ولید نے حامی بھرلی"مَیں نے چار شادیاں کیں۔چاروں عورتوں کو طلاق دی۔کیا اِس کا مطلب ہے کہ خرابی مجھ میں ہے۔یا یہ وہ چار عورتیں تھیں۔جن کی کسی سے بھی شادی ہو جاتی۔انہیں طلاق ہی ہونی تھی۔؟"

"دونوں طرف سے دلیل دی جا سکتی ہے۔آپ کے سوال میں جواب چھپے ہیں۔ میرے خیال میں یہ وہ چار عورتیں تھیں جنہیں طلاق ہونی ہی تھی۔آپ محض طلاقوں کا وسیلہ بنے"۔ ولید نے سوال سمجھ کر۔حالات دیکھ کر۔سوچ سمجھ کر جواب دیا" پہلے میرا خیال تھا کہ عمر خاصی ہو گئی ہے۔کسی مطلقہ یا بیوہ سے اب شادی ہونی چاہیئے۔لیکن کچھ دنوں سے سوچ رہا ہوں کہ مطلقہ یا بیوہ کے علاوہ کوئی کنواری۔غیر شادی شدہ بھی چلے گی کیونکہ مطلقہ یا بیوہ تو اُس نے ہو ہی جانا ہے۔کیا کہتے ہو؟"

"1857 کی جنگ۔مسلمانانِ ہند کے لئے "جنگِ آزادی" تھی۔انگریز اُسے "غدر" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔میچ میں ایک ٹیم ہارتی ہے ایک جیتتی ہے۔ایک کے لئے دکھ۔ایک کے لئے خوشی۔میچ تو ایک ہی ہوتا ہے"۔ولید نے اپنے جواب کو فلسفے کا غلاف دے دیا۔

"There you are!۔ میں نے ٹھیک دیکھا تھا۔تم عام آدمی نہیں ہو۔تمہاری لکیریں کہتی ہیں کہ تم ایک اونچی اڑان اڑو گے۔ بہت بلندیوں پر جاؤ گے۔ پچاس لاکھ لوگوں میں

CamScanner

سے ایک کو ایسا دماغ ملتا ہے۔ سیالکوٹ کیا کرنے جا رہے ہو؟"۔

"ماں بیمار ہے۔ اور آپ؟"

"مَیں نے آگے امرتسر جانا ہے۔ سیالکوٹ میں میرا کوئی نہیں"

"اور۔ اونچا اڑنے۔ بلندیاں۔ کچھ تفصیل بھی پتہ چلتی ہے لکیروں سے"

"زیادہ نہیں۔ لیکن تم one in a million ہو۔ اِس لئے میری دلچسپی بڑھی۔ ماں سے بہت پیار کرتے ہو؟"

"ہوں"

"اور اگر وہ مر گئی۔"

"مرنا تو سب نے ہے۔ موت ہی زندگی کا واحد سچ ہے۔ باقی سب باتوں پر بحث ہو سکتی ہے۔ بس۔ دل چاہتا ہے ماں کچھ برس اور زندہ رہے۔ مَیں اُسے کچھ اور سُکھ دینا چاہتا ہوں"۔

"سب کچھ چاہا اگر مل جائے۔ تو انسان اور خدا میں فاصلہ کم رہ جاتا ہے۔ اور جو کچھ مل جاتا ہے۔ ضروری نہیں کہ من چاہا ہو"

"امرتسر میں کون ہے آپ کا"

"وہاں ایک گوردوارا ہے۔ کچھ لوگوں کو میری ضرورت ہے"۔

"اور آپکی اپنی ضرورتیں۔؟"

"وہ کوئی اور پوری کرے گا۔ ہم سے اپنی ساری ضروریات کبھی بھی پوری نہیں ہو سکتیں۔ اور پھر ہمیں حالات پوری طرح سمجھ کب آئے ہیں۔ تاش کھیلنے والے کتنے لوگوں کو پتہ ہے کی حکم کا بادشاہ کنگ ڈیوڈ ہے۔ چڑیا کا بادشاہ سکندر اعظم اور اینٹ کا بادشاہ جولیس سیزر۔ لیکن لوگ روز تاش کھیلتے ہیں۔ ہارتے ہیں۔ جیتتے ہیں۔ پرانی گڈی کو پھینک دیتے ہیں۔ نئی گڈی خریدتے ہیں۔ اندر تک۔ گہرائی میں جا کر چیزوں کو سمجھنے۔ اُن کی اصل ہیئت اور شکل وصورت کو دیکھنے کا وقت ہی کہاں ہے؟۔" فلسفے اور مذہب نے کچھ سوالوں کے جواب دیئے ہیں۔ بہت سی حقیقتیں فضول کی مصروفیات میں نظر انداز ہو رہی ہیں۔ سب کا یہی خیال ہے کہ جو خواب اُن کی آنکھوں میں ہے۔ وہی سچ ہے۔ اُسی کی تکمیل ہونا ضروری ہے۔ لیکن۔ لیکن جونہی وہ خواب

CamScanner

ٹوٹتا ہے یا پورا ہو جاتا ہے۔ فضول کی مصروفیات میں نظرانداز ہوتی حقیقتوں میں سے ایک سر نکالتی ہے اور ہمیں اپنے ہی سینچے ہوئے خواب پر شک ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ نئی ابھری ہوئی حقیقت۔ ایک نئے خواب کو جنم دیتی ہے۔ اور ہم وہیں آ جاتے ہیں جہاں سے سفر کا آغاز ہوا تھا۔ ہم دو خوابوں کے درمیان محوِ سفر رہتے ہیں۔ لاہور سے امرتسر جانے والوں کے لئے منزل امرتسر۔ اور امرتسر سے لاہور آنے والوں کے لئے منزل لاہور۔! زندگی دو خوابوں کے درمیان کسی مسافت کا نام ہے"۔!!

بس کے اڈے سے گھر تک رکشہ میں آتے ہوئے ولید اِس اتفاقیہ ملاقات۔ اور کرامت میرزا سے گفتگو کے بارے سوچ رہا تھا۔ کیا یہ محض اتفاق تھا۔؟ اگر وہ کسی اور بس میں سفر کرتا۔ تو کیا یہ ملاقات نہ ہوتی۔؟ یقیناً نہ ہوتی۔! تو کیا قدرت کہیں چھپ کے اپنا کام کر رہی ہے؟ سائنس اِس بارے کیا کہتی ہے؟ اِس ایک مختصری ملاقات میں۔ ولید کو بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ اور پھر کرامت میرزا سے اُس کا کیا رشتہ تھا۔؟ ٹھیک ہی تو ہے۔ ایک رشتہ "اجنبیت" کا بھی تو ہوتا ہے۔ زندگی میں شائد یہ ملاقات دوبارہ نہ ہو۔ اور پھر۔ اُس شخص نے عام رویوں سے ہٹ کر گفتگو کی۔ اور یہ پامسٹری کتنا کچھ بتا دیتی ہے۔ ولید کو پامسٹری کی شد بد تھی۔ لیکن۔ اتنا کچھ پتہ چل جاتا ہے۔؟ اور اگر ایسا ہے تو کرامت میرزا کو اپنی چار طلاقوں کا پہلے سے علم ہونا چاہیئے تھا۔ یا پھر یہ کہ اُسے خبر تھی لیکن ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔!! ہونی کو واقعی کوئی نہیں ٹال سکتا۔ مریم علی راجپوت۔ اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کو صرف دو دن اور دے سکی۔ مرنے سے پہلے۔ اُس نے ولید کو کوئی وصیت کی نہ سبق دیا۔ اور نہ ہی کسی ڈرامائی انداز میں اپنی تنہائی۔ اپنی بیماری یا اپنی زندگی کی مشکلات کا ذکر کیا۔ "سدرہ کے پاس جانا۔ تمہاری مرضی کا کھانا کھلائے گی تمہیں"۔ "اپنے مولا سے ملیں گے۔ پورے ہو گئے دن"۔ "تبسّم بے چاری" اور بابل شہید قبرستان میں طلحہ' حمزہ اور ولید نے اپنی ماں کو شرف الدین صدیقی کی قبر کے ساتھ نئی کھدی قبر میں قبلہ رُو سر کر کے نہائت آہستگی سے اتار دیا۔ سدرہ کراچی سے نہ آ سکی۔ بیٹے کی بیماری نے اُسے ماں کے جنازے میں شرکت نہ کرنے دی۔ قُل کر کے حمزہ اپنی یونٹ میں چلا گیا۔ کرائے کا بقیہ حساب اور دوسرے لوازمات طے کر کے طلحہ دو دن بعد اپنے گھر روانہ ہو گیا۔ اور ولید نے مالک مکان سے کچھ دن اُسی گھر میں رہنے کی اجازت لے لی۔ وہ اِس دکھ کو سارے کا سارا۔ اپنے وجود میں سمو لینا چاہتا تھا جو

CamScanner

اُسے ماں کی موت نے دیا تھا۔

"آپا جی جیسی عورتیں دنیا میں کم کم ہوتی ہیں۔میاں کے ہوتے ہوئے اور خصوصاً میاں کی موت کے بعد۔اتنے حوصلے سے زندہ رہنا۔بچوں کی ایسی پرورش۔اور پھر کسی سے نہ لڑائی۔نہ جھگڑا۔اتنی پڑھی لکھی۔اتنے پڑھے لکھے گھرانے سے تعلق بھی۔لیکن اپنے علم کی دھاک بٹھانے کی کبھی کوشش نہ کی۔بلکہ اس کی تو بھنک بھی پڑنے نہ دی۔میاں کی تھوڑی کمائی میں گذارا کیا۔حلال کا کھایا۔حلال ہی بچوں کو کھلایا۔بیٹا تمہاری ماں۔جنتی ہے"۔ڈاکٹر تبسم بولتی جارہی تھی اور ولید سُن رہا تھا۔!

"میرے پروفیسر کی عادتیں بھی آپا جی جیسی تھیں۔وہ بھی سارا بوجھ خود پر لے لیتا تھا"۔ اور یہ کہتے کہتے ڈاکٹر تبسم کی آنکھوں میں ہلکے ہلکے آنسوؤں نے جگہ بنانی شروع کردی۔

"آپ نے شادی نہ کی"۔ولید کچھ معلوم کرنا چاہتا تھا۔

"شادی۔کس سے کرتی۔کوئی پروفیسر جیسا ہوتا تو۔ہوتا بھی تو مشکل تھا۔شادی دو انسانوں کے ایک ساتھ زندگی گذارنے کا قانونی اجازت نامہ ہوتا ہے۔میرے نصیب میں میری مرضی کا ساتھی تھا۔نہ یہ اجازت نامہ۔!"

"آپکے خیال میں ماموں حیدر سے آپکی شادی ہوجاتی تو آپ دونوں خوش رہتے"

"مَیں نے ساتھ رہنے کی بات کی تھی۔خوش رہنے کی نہیں۔خوشی تو بیٹا آدمی کے اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے۔سب کچھ ہوتے ہوئے بھی بے چینی۔اور تھوڑا ہوتے ہوئے بھی اطمینان"۔!

"ماموں نے خودکشی کیوں کی۔؟ کیا کوئی تیسرا زاویہ ہے اُنکی موت کا"۔"

"پہلے دوزاویے کونسے ہیں؟"

"ایک تو یہ کہ وہ اپنی بیوی کو اپنی بھابی کے روپ میں۔اُسی گھر میں نہ دیکھ سکے۔ دوسرا۔آپ سے شادی نہ ہونا"۔

"اُسکی خودکشی کا اصل زاویہ تو خدا ہی جانتا ہے۔مجھے تو یہ پتہ ہے کہ جہاں مَیں اپنے دوست سے محروم ہوگئی وہاں بے شمار بچے بچیاں ایک اعلیٰ پائے کے پروفیسر سے بھی محروم رہ گئے۔ مجھے تو یہ سمجھ نہیں آتی کہ اُس نے کسی کا کبھی بُرا نہ چاہا تھا۔کبھی کسی کو دکھ نہ دیا تھا۔کبھی کسی نے اُسکی شکائت نہ کی۔وہ اس طرح کی موت deserve نہیں کرتا تھا۔قدرت کے قانون میں کہیں کچھ

CamScanner

elements ایسے ہیں جو ہماری ذہنی رسائی سے ماورا ہیں"۔

"اور وہ تتلیاں۔؟ وہ سب کیا تھا۔؟" ولید نے اچانک ایک اور سوال کر دیا۔

"تم نے سیلواڈور دالی کی وہ پینٹنگ دیکھی ہے۔ جس میں فیروزی رنگ کے دریائی پانی پر ایک کشتی رواں ہے اور جس کے بادبان تتلیوں سے بنے ہیں۔ مصور نے مضبوط بادبان بنانے کی بجائے وہاں بے شمار تتلیاں۔ ایک کے ساتھ۔ ایک۔ جوڑ دیں۔ کیسی طاقت کا احساس دلاتی ہیں یہ تتلیاں۔! اور پھر دالی کی ایک دوسری پینٹنگ۔ ہرے رنگ کے بظاہر کچے۔ سیپ میں سے۔ سیپ کے ساتھ جڑی ڈونڈی کے سہارے باہر نکلتی ہوئی تتلی۔ مجھے اِن سب علامتوں کا کہاں پتہ تھا۔ اُسی کی وجہ سے شوق بڑھا۔ اُسی نے یہ سب۔ ارے۔ مجھے تو خیال ہی نہیں رہا۔ بیٹا۔ کچھ کھاؤ گے اور تمہیں پتہ ہے تمہاری آنکھیں بالکل پروفیسر جیسی ہیں"۔

"any regrets Khala"۔ ولید نے کرسی سے اٹھتے ہوئے جیسے آخری سوال کیا

"regrets کیسے بیٹا۔ مَیں تو خوش نصیب ہوں۔ مجھے اُس شخص کی محبت ملی۔ اُس شخص کا ساتھ ملا۔ اُس شخص سے دوستی ہوئی۔ جس کے ساتھ کے حصول کے لئے۔ میں اِس طرح کی دو ایک زندگیاں۔ انتظار میں گذار سکتی ہوں۔ تمہیں پتہ ہے بیٹا۔ شیر بھوکا بھی ہو تو گھاس نہیں کھاتا"۔

"جی۔ خالہ۔ اب اجازت دیں۔ پرسوں۔ لاہور واپس چلا جاؤں گا۔ اِسکے بعد کہاں۔ کیسے۔ یہ ابھی معلوم نہیں"۔

ولید کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے۔ ڈاکٹر تبسم ایک ماں کی طرح نم آنکھوں سے مسکرائی۔ "اللہ کے حوالے بیٹا۔ جہاں رہو۔ آزاد رہو۔ اور اپنی مرضی کی جیو"۔

ﷺﷺﷺ

CamScanner

◎
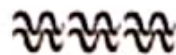
ٹریول ایجنٹ نے اسلام آباد۔لندن۔ نیویارک کا روٹ سمجھا کر ٹکٹ تھما دی تھی۔ ولید نے لاہور سے اسلام آباد پہنچ کر لندن کی فلائٹ پکڑنے کے لئے ٹرین اور بس کی بجائے جہاز پر جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ اِس بیس پچیس منٹ کی فلائٹ میں جہاز میں سفر کا مختصر سا ہی سہی۔ تجربہ کر کے بڑے سفر پر نکلنا چاہتا تھا۔

اسلام آباد سے لندن تقریباً آٹھ گھنٹے کا مسلسل سفر شروع ہونے میں کچھ گھنٹے باقی تھے۔ ولید کے بیگ میں کچھ ذاتی چیزوں کے علاوہ صرف کتابیں اور کاغذ تھے۔ فلائٹ سے دو گھنٹے پہلے پہنچنے کی بجائے وہ ائرپورٹ چار گھنٹے پہلے سے ہی موجود تھا۔ عارف ساتھ تھا۔ جو سیالکوٹ سے صبح کی ریل کے ذریعے راولپنڈی اور پھر ولید کے تقریباً ساتھ ہی اسلام آباد ائرپورٹ پہنچا تھا۔

"خالہ تبسم نے خاص دعائیں بھیجی ہیں"۔ عارف نے چائے پینے کے لئے اِدھر اُدھر ریستورانٹ تلاش کرتے ہوئے۔ کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ہوں" ولید اپنے سامنے دکھائی دینے والے کاؤنٹر پر نظریں جمائے تھا۔ جہاں دو ایک مسافر اپنا اپنا سامان ٹرالیوں میں رکھ کر مسافروں کی لائین بنانے کی ابتدا کر چکے تھے۔

"صبا سے نہیں ملے؟"

"ملا تھا۔ لیکن"۔

"نہیں۔ وہ ملاقات نہیں۔ ! پچھلے دنوں میں۔ اس کو امریکہ جانے کا دن بتایا تھا؟"

"کیا فائدہ۔ مَیں نے سوچا خواہ مخواہ کنفیوژن مزید بڑھے گا"

"اُسکا فون آیا تھا۔ کہہ رہی تھی سب کچھ ختم نہیں ہوا۔ ایک امید باقی ہے۔"

"امید تو لوگ موت سے چند گھڑیاں پہلے بھی..... "ولید نے اپنی ٹرالی کو سیدھا کرتے

CS CamScanner

ہوئے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"تم اگر اُس سے وعدہ کر لیتے۔تو کیا ہو جاتا۔بعد میں جو ہوتا دیکھا جاتا"۔

"یہی فرق ہے میری اور تمہاری سوچ میں۔وعدہ پورا نہ کر سکنے کا اگر ایک فیصد بھی خدشہ ہو تو وعدہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔اور یہاں تو خدشات سے پورا سفر بھرا ہے"۔

"چلو۔لائین میں کھڑے ہوتے ہیں"۔عارف نے ولید سے ٹرالی لے لی۔

"تمہیں معلوم ہے عارف۔میں نے آج تک تم سے یا کسی سے کوئی وعدہ نہیں کیا۔ مجھے خوف ہے کہ اگر پورا نہ کر سکا تو۔میرے والد صاحب نے ایک وعدہ ماں سے کیا تھا۔" تمہیں خوش رکھوں گا"۔وہ یہ وعدہ پورا نہ کر سکے۔ماں نے ایک دن یہ وعدہ یاد کرا کے مجھے انجانے میں بہت کچھ سکھا دیا تھا۔زندگی اور موت سے زیادہ۔رشتوں میں سچائی کا ہونا۔اہم ہے۔تم شاعر ہو۔ توجیہات ڈھونڈ لو گے"۔لائین نے لمبا ہونا شروع کر دیا تھا۔

"تم رابطہ رکھنا۔ مجھے تم نے وہاں بلوانا ہے۔ یاد ہے نا۔؟" عارف نے کسی "تقریباً وعدے" کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

برٹش ائیرویز کا مخصوص یونیفارم پہنے ایک دبلی پتلی خاتون کاؤنٹر پر آ چکی تھی۔ولید کا پانچواں نمبر تھا۔

"اور تم وہاں آ کے کیا کرو گے۔امریکیوں کو غزل کی کوئی سمجھ نہیں"۔ولید نے مذاق کیا

''تو سمجھا دیں گے۔دیر کتنی لگتی ہے؟'' عارف نے مذاق کا جواب میں مذاق میں دیا۔

"ناانصافیاں دنیا میں ہر جگہ ہیں۔مصیبت یہ ہے کہ فیصلہ ہماری مرضی کا نہ ہو تو ہم اُسے ناانصافی کہہ دیتے ہیں"۔ولید نے نہائت پرسکون لہجے میں جواب دیا۔

"تو تم وہاں کیا کرنے جا رہے ہو۔اگر وہاں بھی ناانصافیاں ہوئیں تو۔یہیں رہ کر انصاف کا ماتم کرتے ہیں"۔

"پاکستان میری پہچان ہے۔ مجھے اپنے ملک سے پیارا اور کوئی ملک۔کبھی بھی۔ نہیں ہوگا۔میں تو اپنے مغالطوں کو بھی نہائت اہتمام سے اپنے ذہن میں رکھتا ہوں۔میں ان میں مبتلا جو ہوں۔!اور ہاں۔تمہیں بتایا تھا کہ امریکہ کچھ خواب پورے کرنے جا رہا ہوں۔اپنے ملک سے بددل ہو کر نہیں"۔کاؤنٹر پر ولید کی باری آ گئی تھی۔

CS CamScanner

لندن سے نیویارک کے لئے اڑے جہاز کو فضا میں لگ بھگ تیس منٹ ہو چکے تھے۔ ولید کا ساتھ بیٹھی امریکی لڑکی ۔جیسیکا۔ سے ہلکا سا تعارف ہو چکا تھا۔سیٹ بلٹ باندھنے کے انداز اور فوری طور پر سامنے پڑے برٹش ائرلائنز کے میگزین کو پورا پڑھتا دیکھ کر جیسیکا نے اُس سے پوچھا۔

"پہلی دفعہ ہے"

"پہلی دفعہ بھی نہیں ۔کوئی تجربہ نہیں"۔

"کیا مطلب ۔مَیں نے تو پوچھا کہ تمہارا جہاز میں بیٹھنے کا پہلا اتفاق ہے"۔

"مَیں کچھ اور سمجھا تھا۔آپکا سوال اتنا اچانک تھا۔کہ۔"

"اور تم کیا سمجھے تھے"۔؟جیسیکا نے فقرہ بیچ میں سے ٹوکتے ہوئے ولید کی خوبصورت آنکھوں سے نئے جوتوں تک ۔پورے خوبصورت وجود کو لحہ بھر۔اوپر سے نیچے کا مکمل جائزہ لینے کے بعد۔پوچھا" چھوڑیئے۔میرا نام ولید ہے"۔اور یوں اس مختصر سی گفتگو کے بعد دونوں نے ایک دوسرے کو" سفر بہت لمبا ہے" کہتے ہوئے اپنے اپنے بارے میں کچھ باتیں بتائیں۔جیسیکا ورجینا میں رہتی تھی۔نیویارک سے پڑھائی کے بعد وہ ورجینا میں ایک بنک میں ملازمت کر رہی تھی۔ایک بچی اور اپنے میاں کے ساتھ۔وہ اپنی زندگی سے خوش تھی۔لندن" کسی کام سے کچھ دنوں کے لئے آنا پڑا" کہہ کر اُس نے تفصیل نہ بتائی تھی۔

تقریباً تیس برس کی جیسیکا اپنے ہمسفر ولید کے تیز دماغ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

"نیویارک کے بارے میں کتنا کچھ یاد ہے؟"ولید نے اپنی نوٹ بک نکال لی۔

" سبھی کچھ۔ابھی تین سال پہلے ہی تو چھوڑا ہے نیویارک ۔کیوں؟"

جیسیکا نے پہلو بدلتے ہوئے پوچھا۔

1831 میں بنی نیویارک یونیورسٹی کے پاس پروفیسر آرتھر اوڈانل کے فلیٹ پر پہنچنا ولید کا پہلا مقصد تھا۔Manhatten کے نزدیک ۔واشنگٹن سکوائر پارک کیسے پہنچنا ہے۔ جہاز۔ ٹرین۔بس یا سب وے۔اُسے یہ سب کچھ معلوم کرنا تھا۔اور یوں جیسیکا نے جہاز کے سفر میں۔ وہ سب معلومات باتوں باتوں میں۔ولید کو بہم پہنچائیں جس کا محض ایک خاکہ سا اُس کے ذہن

Mir Zaheer Abass Rustmani
CamScanner

میں تھا۔ولید کومعلوم ہو چکا تھا کہ Lexington ایونیو سب وے نمبر 6 اُسے Astor Place سٹیشن لے جائیگی۔مغرب کی طرف سفر کر کے وہ Broadway پہنچ سکتا ہے۔جہاں جنوب کی طرف پیدل چل کے وہ Waverly Place پہنچے گا۔وہاں سے مغرب کی طرف مذید پیدل چل کے وہ واشنگٹن سکوائر پہنچ سکتا ہے۔اُسے بسوں کے بارے میں بھی تفصیل سے علم ہو چکا تھا۔ Greyhound اور نیو جرسی کی ٹرانزٹ بسیں پورٹ ٹرمینل اتھارٹی جاتی تھیں۔وہاں سے ڈاؤن ٹاؤن جانے والی 8th ایونیو بس پکڑنی تھی۔

"اور Brooklyn سے وہاں کیسے پہنچتے ہیں۔" ولید کی نوٹ بک نیلی ہوتی جارہی تھی۔

"Manhatten Bridge سے۔کنال سٹریٹ۔مغرب کی طرف۔6th ایونیو۔ جسے Avenue of Americans بھی کہا جاتا ہے۔شمال کی طرف جائیں تو West Fourth Street آئے گی۔وہاں سے مشرق کی طرف واشنگٹن سکوائر ہے۔لیکن نیو یارک پر یہ ساری معلومات ناکافی ہیں۔یہ تو تمہیں کوئی بھی بتادے گا۔کسی سٹیشن پر۔کوئی بھی گائیڈ۔کتاب۔ اصل چیز تو وہاں کی "اندر کی معلومات" ہیں"۔جیسیکا نے پلاسٹک میں چھپے کھانے کو پلاسٹک سے آزاد کرتے ہوئے کہا "اندر کی معلومات؟"۔ ولید کا خیال تھا۔"اندر کی معلومات" صرف پاکستان جیسے ملکوں کے لئے relevant ہوتی ہیں۔!

"سب سے پہلے تو یہ کہ نیو یارک میں ہر سال تقریباً دوسو لوگ پیدل چلتے ہوئے مارے جاتے ہیں۔لہٰذا "safety tips" سب سے پہلے پتہ ہونی چاہئیں۔Manhatten کے آس پاس تقریباً 45 key traffic points ہیں۔نیو یارک سٹی کا سب وے کے بارے نقشہ تمہاری جیب میں ہر وقت ہونا چاہیئے۔rules معلوم کرنے پڑیں گے کہ mulitple-stop trips کیا ہیں۔آگے بیٹھ کے سفر کرنے کے کیا فائدے اور نقصانات ہیں۔metro cards کہاں سے ملتے ہیں اور پھر سب سے اہم۔سیکھنا پڑے گا کہ کہیں پہنچنے کا نقشہ کیسے تیار کرنا ہے۔رستے کیسے پوچھتے ہیں۔سب وے۔ A سے Z تک۔اور 1 سے 9 تک حفظ کرنا پڑے گا۔نمبر 2 ٹرین کے flasher کو کیسے avoid کرنا ہے۔اور۔اور"۔جیسیکا کو یاد آیا کہ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔

"تم نے رہنا کہاں ہے؟"۔جیسیکا نے کھانا شروع کرتے ہوئے پوچھا

"پہلے تو ایک صاحب کے پاس کچھ دن گذارنے ہیں۔ پھر نوکری ڈھونڈنی ہے۔ پھر کوئی کمرہ وغیرہ ڈھونڈیں گے"۔ ولید نے اپنی نوٹ بک بند کر کے جیب میں ڈال لی تھی۔

"ایک بہت ضروری tip۔ جب بھی نیویارک میں کوئی کمرہ یا فلیٹ کرائے پر لینا ہو تو احتیاط سے چیک کر لینا چاہیئے کہ اس کمرے کا پچھلے ماہ کا کرایہ دیا جا چکا ہے کہ نہیں۔ ایک کمرے کا اپارٹمنٹ بھی مل جاتا ہے۔ تھوڑا مہنگا لیں۔ لیکن اپنی تسلی کر کے۔ نیویارک سیدھے سادے لوگوں کے رہنے کی جگہ نہیں ہے۔ تم وہاں رہو گے تو سیکھ جاؤ گے۔ فی الحال تمہارے لئے یہ جاننا ہی کافی ہے کہ وہاں دو اور دو چار کم ہی ہوتے ہیں۔ کبھی تین اور کبھی چار سو"۔ جیسیکا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم نے مجھے ڈرا دیا امریکی مسافر"۔ ولید کو واقعی یہ سب نہیں پتہ تھا۔

"ارے نہیں۔ اب ایسا بھی نہیں۔ تمہیں مزہ آئے گا جب تم امریکہ اور کینیڈا دونوں کی نیاگرا فالز کو دیکھنے upstate New York فلائی کرو گے۔ یا Hudson River کے پاس لذیذ کھانے کھاؤ گے۔ یا پھر "ground zero" کے اوپر سے۔ ہیلی کاپٹر کا سفر کرو گے۔ اور Statue of Liberty کو قریب سے دیکھو گے"۔

"یہ Statue of Liberty دیکھنے کا کوئی زمینی طریقہ نہیں ہے"۔

"ہزاروں طریقے ہیں"۔ جیسیکا نے ہنسنا شروع کر دیا۔ اور بتایا کہ سب سے آسان اور سستا طریقہ یہ ہے کہ کوچ پر Hoslen سے Statue of Liberty دیکھنے جایا جائے۔ نیو یارک میں پہلی مرتبہ آنے والوں کے لئے سب سے اچھا مشورہ یہ ہے کہ ساڑھے پانچ گھنٹے کا نیویارک سٹی کا guided tour لیا جائے۔ تعارف کے بہت سے مراحل تو اسی ٹور میں طے ہو جاتے ہیں۔ امریکہ کے تمام شہروں میں نیو یارک سٹی اپنی لگ بھگ 80 لاکھ کی آبادی کی وجہ سے سب سے بڑا شہر۔ جہاں میکسیکو سے لے کر بیجنگ۔ اور ماریشس سے لاہور تک۔ سب ہی جگہوں سے لوگ۔ اپنے اپنے خواب لے کر آتے ہیں۔ یہ جانے بغیر کہ "پہلی دنیا" کے "نمبرون ملک" کے "نہایت اہم شہر" نیو یارک سٹی میں۔ غربت کی لکیر سے نیچے بسر کرنے والے تقریباً چھ فیصد لوگ کہیں اور نہ جا سکنے کے باعث۔ یہیں اپنی عمر۔ سڑکوں پر۔ گلیوں میں صفائی کے اصولوں سے نا واقف۔ گذار دیتے ہیں۔ ولید کو یہ سب معلوم تھا۔ لیکن اُس نے جیسیکا سے اس موضوع پر کوئی بات نہ کی۔ اُسے تو اتنی ڈھیر ساری معلومات۔ ایسے ہی۔ محض اتفاق سے۔ باتوں باتوں میں مل

CamScanner

گئیں۔ وہ معلومات۔ جو آگے چل کے اُس کے بہت کام آنی تھیں۔

"نیچے اتر کر مجھے ڈھونڈ لینا۔ یہ Beggage claim بھی ایک علیحدہ دنیا ہے۔ اکٹھے ۔ اپنے اپنے بیگ ڈھونڈیں گے۔ جیسیکا نے "ہم نیچے اترنے والے ہیں" والی اناؤنسمنٹ سُنی تو اپنی سیٹ کو سیدھا کرتے ہوئے کہا۔

"آپ تو آگے ورجینیا جائیں گی۔؟" ولید نے بھی اپنی کرسی کی پشت سیدھی کی۔ اور دل ہی دل میں "دیکھا۔ میں امریکہ آ گیا" کہا۔

"ہاں۔ اور تم اپنا خیال کرنا۔ .....and welcome to the States"۔

ﷲﷲﷲ

◎
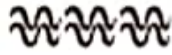
پروفیسر آرتھر اوڈانل ہارورڈ یونیورسٹی میں پچیس سال پڑھانے کے بعد اب ریٹائرمنٹ کی زندگی گذار رہے تھے۔ نیو یارک میں بسا اوقات ہمسائے بھی ایک دوسرے کو نہیں جانتے۔ لیکن پروفیسر آرتھر کو فزکس میں گراں قدر تحقیق کرنے کے باعث سائنس میں دلچسپی لینے والے اچھی طرح پہچانتے تھے۔ ولید کا پروفیسر آرتھر سے تعارف لاہور میں اُسکے پروفیسر سطوت میر نے کرایا۔ جو پروفیسر آرتھر کے ساتھ اپنے فزکس کے پی ایچ ڈی کے تھیسس کے دنوں مشورے لیا کرتے تھے۔

چندروز پروفیسر آرتھر کے چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں گذارنے کے بعد ولید نے ایک سیون الیون میں رات بھر کی نوکری کر لی تھی۔ اُس شب گذیدہ دکان کے سپروائزر جارج نے ولید کو دکان کے ساتھ ہی ایک چھوٹے سے کمرے میں رہائش دے دی تھی۔ ولید نے ضروریات زندگی کی کچھ اشیاء خریدنے۔ ماحول کو سمجھنے۔ اپنے لئے راستہ چننے اور مستقبل کی راہیں تلاش کرنے کے لئے شروع کے چند مہینے پڑھائی نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ویزا چونکہ ولید کے یونیورسٹی میں داخلہ سے منسلک تھا۔ لہٰذا ولید کو بقول نذرالاسلام بنگالی کے۔ "دوئی نمبر راستہ" تلاش کرنا تھا۔ پاسپورٹ گما کر اُسکی پولیس میں رپورٹ کرا کے۔ ایمبیسی سے نیا پاسپورٹ بنوانا تھا۔ اور پھر امریکہ میں لمبی مدت کے لئے رہنے کے لئے جواز تلاش کرنے تھے۔ نذرو بنگالی۔ ولید کی سیون الیون دکان کے ساتھ ایک موٹر مکینک کے ہاں کام کرتا تھا۔ ولید کو ماں کے ہاتھ سے بنائے پراٹھے جب بھی یاد آتے وہ نذرو بنگالی کے پاس چلا جاتا۔ جو چار اور بنگالیوں کے ساتھ ایک کمرے میں رہتا تھا۔ پانچ آدمیوں کے لئے ایک کمرہ بہت کم پڑتا تھا۔ لیکن وہاں چولہا پڑا ہوتا تھا۔ جس میں کبھی کبھی ڈھاکہ سٹائل کے پراٹھے بنتے۔ اور چھ نوجوان جو اپنے اپنے خوابوں کو لے کر اس بظاہر شاندار ملک میں آئے تھے۔ مزے لے لے کر چنوں اور آلو کے بھجیا کے ساتھ

کھاتے۔

سیون الیون میں پٹرول کے پیسے لیتے ہوئے ایک رات ولید کی ملاقات Jesus سے ہوئی۔ اُسکا اصلی نام تو کچھ اور تھا۔ لیکن بقول اُسکے Jesus اُسے سوٹ کرتا تھا۔ کلکولیٹر کی مدد لئے بغیر جب ولید نے Jesus کو گیارہ اشیاء کی مجموعی رقم ایک لمحے میں بتائی تو Jesus سے رہا نہیں گیا۔

"تمہیں یہاں پڑی ہر شے کی قیمت زبانی یاد ہے" Jesus نے جیب سے والٹ نکالتے ہوئے پوچھا "تقریباً"۔ ولید نے آہستگی سے کہا

"تمہارا حساب کرنے کا انداز مجھے اچھا لگا"۔ Jesus نے بقیہ ریزگاری سنبھالتے ہوئے کہا "مَیں کلکولیٹر کم ہی استعمال کرتا ہوں۔ رسید مانگنے والوں کے لئے دوبارہ حساب کرنا پڑتا ہے۔ تم کیا کرتے ہو۔؟" ولید نے پوچھا

"قسمت آزمارہا ہوں"۔ Jesus نے اپنا کارڈ ولید کے سامنے رکھا اور کبھی ملنے کا کہہ کر چلا گیا۔

1992 تک انٹرنیٹ کے ہوسٹس کی تعداد تقریباً 10 لاکھ کے قریب ہو چکی تھی۔ Jean Armour Polly "سرفنگ دی انٹرنیٹ" کی اصطلاح وجود میں لا چکا تھا۔ پہلا MBONE آڈیو ملٹی کاسٹ بن چکا تھا اور ویڈیو ملٹی کاسٹ کی طرف سفر رواں تھا۔

"تم تو حال ہی میں پاکستان سے آئے ہو۔ وہاں بھی ٹکنالوجی اتنی ہی ترقی کر رہی ہے"۔ Jesus نے دو ایک بار کی ملاقات کے بعد ولید کو گھر بلایا تھا۔

"نہیں۔ کمپیوٹر آ چکے ہیں۔ لیکن عام لوگوں کو معلومات اتنی زیادہ نہیں ہے"۔

"تم کمپیوٹر کے بارے میں اتنا کچھ کیسے جانتے ہو"۔

"شوق۔! مجھے ایک دوست کے ذریعے ماسکو سے آئے ہوئے Sputnik رسالے نے شوق ڈالا۔ تمہیں معلوم ہے ناروس نے 1957 میں Sputnik نام کا ایک سیٹلائٹ خلا میں چھوڑا تھا"۔

"ہوں۔ یاد ہے"

"انٹرنیٹ نئی ایجاد نہیں ہے۔ اسکا تعلق 1836 میں بنائے گئے ٹیلی گراف۔ 1876

میں ایجاد کئے گئے ٹیلی فون۔اور 1962۔میں سامنے آئے پیکٹ سوئچنگ سے ہے"۔
"تم پیکٹ سوئچنگ کے بارے میں بھی جانتے ہو"Jesus کی دلچسپی بڑھ رہی تھی۔
"اچھی طرح سے۔میرا خیال ہے کہ دو تین سالوں میں دنیا بھر کے لوگ انٹرنیٹ سے connect ہو جائیں گے۔Gates اور Paul Allen کی مائیکروسوفٹ۔ MS-DOS سے Excel اور Powerpoint تک پہنچ بھی گئی۔لیکن انٹرنیٹ کی طرف ان کی توجہ نہیں ہے۔ مجھے لگتا ہے انہیں Microsoft Office سے اب آگے بڑھنا چاہیئے"۔
"تمہاری معلومات حیران کن ہیں۔میرا خیال تھا کہ پاکستان میں لوگ اونٹوں پر سفر کرتے ہیں۔تنگ تنگ گلیوں میں رہتے ہیں۔عورتوں کو تعلیم نہیں دیتے۔اور اُن کا زیادہ تر وقت honour killing میں گذرتا ہے۔تم تو ٹکنالوجی میں مجھ سے زیادہ معلومات رکھتے ہو۔کیا تمہارے خاندان میں کسی نے honour killing کی ہے۔"
"میرا باپ پی ایچ ڈی تھا۔یہی ڈگری میرے نانا کی تھی۔میری ماں نے ایم اے کیا تھا۔میرے پاکستان میں ماں کے پیروں تلے جنت ہوتی ہے۔میرے خاندان تو کیا۔میں نے تو کبھی کسی کو honour killing کرتے ہوئے نہ دیکھا نہ سُنا۔ہاں۔پاکستان ایک بہت بڑا ملک ہے۔وہاں قبائلی رسم و رواج کے تحت غیرت کا تصور ابھرتا ہے۔انگریزی زبان میں" غیرت" کے لئے کوئی لفظ نہیں۔کسی اور دن بتاؤں گا۔فی الحال تو یہ بتاؤ کہ مجھے کسی ایسے شخص سے ملوا سکتے ہو جو microsoft میں کام کرتا ہو"۔ولید نے کام کی بات کی اور فضول بحث میں پڑنے سے احتراز کرنا چاہا۔
"ہاں یہ ممکن ہے۔میری الیکٹرانکس کی دکان میں ایک گاہک آیا کرتا ہے۔اگلی مرتبہ وہ ملا تو۔لیکن تم اُس سے کیوں ملنا چاہتے ہو"۔
"میں جہاز خریدنا چاہتا ہوں۔دو تین یا چار"۔ولید نے بے خیالی میں کہا۔
"مائیکروسوفٹ جہاز نہیں بناتا۔اور ویسے بھی جہاز خریدنے کے لئے تمہارے سیون الیون میں کام کرتے ہوئے تو پیسے نہ بن پائیں گے"۔
"میرے پاس علم ہے۔کچھ ideas ہیں۔اگلا دور۔سارے کا سارا دور۔کمپیوٹر کا ہے۔میں تمہارا یہ کمپیوٹر سارا کھول کر جوڑ سکتا ہوں۔مگر ابھی مجھے کچھ تحقیق کرنے کے لئے وقت

چاہئے۔ مجھے ایک کمپیوٹر چاہیے انٹرنیٹ سمیت۔ اور پھر چند مہینے۔ ! مجھے ملواؤ گے اپنے گاہک سے "۔ ولید نے سامنے پڑے کمپیوٹر پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا

"اب تو ملانا ہی پڑے گا۔ لیکن کمپیوٹر تو میرے پاس ہے۔ تم استعمال کر سکتے ہو۔ انٹر نیٹ نہیں ہے۔ وہ دیکھ لیتے ہیں کیسے لگے گا"۔ Jesus کی باتوں میں اخلاص کی خوشبو تھی۔

"مَیں پیسے دوں گا۔ انٹرنیٹ تم لگواؤ۔ پیسے مَیں دوں گا۔ اور مَیں تمہیں پراٹھے کھلانے نذرو بنگالی کے پاس بھی لے کر جاؤں گا"

"پراٹھے"؟

"ہاں۔ اِس کا honour killing سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ماں بناتی ہے۔ اور بچے کھاتے ہیں۔ یہاں ہم سب کی ماں۔ نذرو بنگالی ہے"۔ ولید نے کہا اور اگلی مرتبہ ملنے کا وقت طے کر کے اپنی بس پکڑنے گھر سے باہر آ گیا۔

ششش

◎

پروفیسر آرتھر سے ولید کی یہ ملاقات اتفاقیاً نہیں تھی۔ ولید نے خصوصی طور پر اصرار کر کے دو گھنٹے کا وقت لیا تھا۔ میامی سے آئے ہوئے ایک کیوبن سے اُس نے Cohiba سگار کا ایک پیکٹ خریدا۔ اور پروفیسر آرتھر کے گھر پہنچ گیا۔

" تمہیں کیسے پتہ لگا مجھے Cohiba سگار اچھے لگتے ہیں"۔ پروفیسر نے میلی سی پیکنگ کا موی کاغذ اتارتے ہوئے پوچھا" آپ نے ایک مرتبہ چے گیوارا کے سگار کا ذکر کیا تھا۔ انٹرنیٹ سے معلومات آسان ہیں۔ رومیو اینڈ جولیٹ۔ اور کوہیبا۔ یہ دو سگار کیوبا کے بہت مشہور ہیں۔ سگار بیچنے والے کے پاس صرف کوہیبا ہی تھے۔ سو لے لئے۔ مجھے خوشی ہوئی کہ آپ کو کوہیبا ہی اچھے لگتے ہیں"۔

"انٹرنیٹ اور پھر ای میل۔ خط لکھنے اور خط پڑھنے کا سارا مزا ہی لے گئے۔ ایک بٹن پر انگلی رکھی۔ اور سارے جذبات ہزاروں میل دور ایک چھوٹی سکرین میں منتقل ہو گئے۔ یو۔ این اور یو۔ ایس۔ اے۔ آن لائین آ گئے ہیں۔ کوہیبا پینے اور اُس کا لطف لینے کے لئے دنیا کے پاس اب وقت کم ہی بچے گا"۔ پروفیسر نے سگار سلگا لیا تھا۔

"ایک سال سے ریسرچ کر رہا ہوں۔ ایک سافٹ ویئر بنانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مجھے کوئی سپانسر چاہیئے۔ آپ میری مدد کریں گے۔؟ آپ کے جاننے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے"۔ ولید نے جھجکتے ہوئے کہا"اس fast paced زمانے میں اب جاننے والے کم ہی رہ گئے ہیں۔ آئندہ آنے والے برسوں میں یہ بھی معدوم ہو جائیں گے۔ کونسا سافٹ ویئر بنایا ہے؟"

" میرے لئے پندرہ بیس ہزار ڈالرز بھی بہت ہونگے۔ میں مزید ریسرچ کرنا چاہتا ہوں۔ میرا یہ سافٹ ویئر اتنے میں تو بک جانا چاہیئے۔ اور مجھے اپنے نام کے ساتھ نہیں بیچنا۔" ولید نے کہا اور ایک لفافہ پروفیسر آرتھر کے سامنے رکھ دیا۔

CS CamScanner

دو ماہ بعد جب ولید کو پچیس ھزار ڈالر کیش ایک لفافے میں دیتے ہوئے پروفیسر آرتھر نے " کچھ اور کرو" کہا تو ولید کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ امریکہ میں یہ اُسکی پہلی کامیابی تھی۔ اُس نے چند ثانیوں میں۔ ویزے کی توسیع۔ چھوٹے کمرے سے بڑے کمرے میں منتقلی۔ اپنا کمپیوٹر خریدنا اور ایک موٹر سائیکل خریدنے کا حساب لگالیا۔ اور پھر سدرہ کو ایک ھزار ڈالر بھیجتے ہوئے اُسے یاد آیا۔ کہ اباجی زندہ ہوتے تو باقی کے پیسے کی ٹکٹ خرید کر انہیں جہاز کی سیر کراتا۔ یا ماں کے کانوں اور گھٹنوں کا علاج کرادیتا۔ یا پھر حیدر ماموں کو سپین جانے کے لئے ٹکٹ بھجوادیتا۔ وہ سلواڈور دالی کے شہر جا کر خود وہ جگہ دیکھتے جہاں سلوادور دالی تتلیوں کی کئی پینٹنگز بنا چکا تھا۔ اُن پچیس ہزار ڈالروں میں ایک ڈالر بھی ایسا نہیں تھا۔ جس کی ڈاک ٹکٹ خرید کر صبا کو ولید نے خط لکھنا تھا۔ وہی صبا۔ جو Caltax کے مینیجر کو شائد ہاں کر بھی چکی تھی.....!!

◎

کرائے کے اس بڑے کمرے میں شفٹ ہوئے ولید کو لگ بھگ چھ ماہ ہو چکے تھے۔
حیدر ماموں کی دی ہوئی تتلی دیوار پہ ٹنگی تھی۔ تین ایش ٹرے۔ ایک صندوق اور ضرورت کی چند اشیاء کے ساتھ ساتھ کمرے میں ایک کمپیوٹر تھا جو اب انٹرنیٹ کی سہولت کے ساتھ مزین تھا۔ بے ترتیبی سے پڑے۔ انگریزی زبان میں ساٹھ ستر رسالے۔ سائنس۔ ٹکنالوجی۔ ریاضی۔ طبعیات اور اسی قماش کے بے شمار تازہ ترین مضامین سے لیس۔! کمپیوٹر کے پاس دیوار پر چپکا ہوا ایک بڑا سا کاغذ۔ جس پر مختلف رنگوں کے حاشیوں کے ساتھ تین چار رنگوں میں گراف۔ حساب کتاب۔ بلٹ پوائنٹس۔ اور نجانے کیا کیا بنا تھا۔ کامن پنوں اور پیلے رنگ کے سٹکنگ پیڈز سے اُس بڑے سے چارٹ نما کاغذ کی مجموعی حیثیت اور ہیئت کسی سائنسی تجربے کے دوران کام آنے والے ریفرنس پیپر سی لگ رہی تھی۔ اُس بڑے چارٹ کے نیچے ایک اور کاغذ چسپاں تھا۔ جس پر ولید نے اگلے دس برس میں جو بڑے بڑے کام سرانجام دینے تھے۔ انہیں نہائت صفائی کے ساتھ لکھا تھا۔ کاغذ کے نیچے سرخ قلم سے لکھی تحریر "پہلے اپنے لئے تو جی لو"۔ پڑھنے والے کو اس کمرے میں رہنے والے کی زندگی کے بنیادی مطمع نظر کی طرف توجہ دلا سکتی تھی۔

عارف کو ای میل دینے سے پہلے ولید نے چائے کا کپ بنایا۔ تھوڑی سی کافی کے ساتھ۔ خالی چائے اور خالی کافی۔ اُسے اتنا مزا نہ دیتی تھی۔

"پیارے عارف۔ انگریزی میں ون۔ ٹو۔ تھری سے 999 تک چلے جائیں تو لفظوں میں "A" نہیں آتا۔ جب Thousand آئے تو پہلی مرتبہ A کی شکل نظر آتی ہے۔ دیکھا جائے تو A ہر دوسرے تیسرے لفظ میں موجود ہوتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی اس کو ڈھونڈنے کے لئے 999 لفظوں کا سفر کاٹنا پڑتا ہے۔ مجھے زندگی میں A ابھی نہیں ملا۔ سفر جاری ہے۔ بیچ رستے میں پہنچنے کے بعد تھوڑا حوصلہ ہے کہ سفر رائیگاں نہیں۔ میری موٹر سائیکل آ گئی ہے۔ میرا جہاز آنے والا ہے۔

CS CamScanner

ایک پراجیکٹ پر کام کر رہا ہوں۔ایک وڈیو کمپنی کے لئے ایک نیا سافٹ وئیر۔!اور اگر یہ کامیابی سے ہمکنار ہوا تو اِس کمپنی سے ایک طرح کا معائدہ ہو جائے گا۔ اس ملک میں نیا کام کر کے دکھانے والوں کی بہت عزت ہے۔ پیسہ بھی خوب ملتا ہے۔جعلی پن سے کوئی آپ کی جینوئن شے کو چراتا بھی نہیں۔ کمپنی والے اِس بات پر حیران ہیں کہ مَیں اپنا نام کیوں منظرِ عام پر لانا نہیں چاہتا۔ میرا پہلا سافٹ وئیر اب مارکیٹ ہو چکا ہے۔کسی اور نام سے۔!اتنا جعلی پن۔ یہاں بہر حال ہے۔لیکن میرے کاغذات۔ امیگریشن۔اور دوسرے کئی حوالوں سے مَیں اپنے نام کو ابھی پوشیدہ ہی رکھنا چاہتا ہوں۔ پروفیسر آرتھر نے بہت مدد کی ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ مَیں خداداد صلاحیتوں کا مالک ہوں اور مجھے مواقع فراہم کئے جانے چاہیں۔بچپن اور لڑکپن کی پڑھائی کام آرہی ہے۔اور ہاں۔دو ایک پراجیکٹ فروخت ہو گئے تو تمہیں۔ یہاں بلوالوں گا۔سدرہ کا حال تم سے پتہ چلتا رہتا ہے۔اگلی مرتبہ اُسے یاد سے بتانا کہ ای میل اور انٹرنیٹ کتنا ضروری ہے۔ ایک وقت آنے والا ہے جب ساتھ بیٹھے ہوئے شخص سے آپ ای میل دے کر بات کیا کریں گے۔ ہر کمپنی کی ایک ویب سائٹ ہوگی۔اتے پتے گم ہو جائیں گے۔ویب سائٹس اور ای میل ایڈریس ہی سے کام چلایا جائے گا۔دنیا بھر کا کاروبار ایک جگہ بیٹھ کر نہیں۔ملکوں ملکوں گھوم کر بھی کیا جاسکے گا۔آپ اپنا کمپیوٹر اپنے ساتھ لے کر سفر کریں گے۔آپ کے تمام بزنس contacts آپ سے 24 گھنٹے رابطے میں رہ سکیں گے۔اور یہ وقت اب زیادہ دور نہیں۔سدرہ سے اُسکے میاں کا بنک اکاؤنٹ نمبر لے کر مجھے بتانا۔یاد سے۔!!

صبا کی شادی کی خبر تو تم کو سنا چکا ہوں۔ اُس نے اپنے آخری خط میں شدید طعنے دیئے۔اُس کا قصور نہیں ہے۔وہ میری باتوں کو مذاق سمجھتی رہی۔اور اپنی مرضی کی تشریحات کرتی رہی۔اُن تمام باتوں کی۔جو میں نے اُسے شادی کے سلسلے میں کہیں۔!میرا ضمیر مطمئن ہے۔میں نے اُس سے کہا تھا کہ میرے plans میں شادی ابھی فٹ نہیں بیٹھتی۔

عید والے دن ماں کی قبر پہ جا کر سرخ گلاب ضرور چڑھانا۔اُسے اچھے لگتے تھے۔ابا جی کی قبر تو پکی ہوگئی ہے۔طلحہ نے کہا ہے کہ وہ اگلی مرتبہ سیالکوٹ گیا تو ماں کی قبر بھی پکی کرا دے گا۔میری آنکھوں میں ماں کی قبر ابھی تک گیلی اور کچی ہے۔اور یہ قبر مَیں پکی نہیں کروانا چاہتا۔

تفصیل سے جواب دینا۔تمہارا ولید۔"

CamScanner

"send" پر کلک کر کے۔ ولید نے لاگ آف کیا۔ اور جوتے پہن کر نذرو بنگالی کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ نذرو کی ماں کے مرنے کی خبر اُسے آج ہی ملی تھی۔ کاغذات کے مسائل اور دو طرفہ ٹکٹ کے پیسے۔ نذرو اپنے جیسے ہزاروں لوگوں کی طرح۔ ماں کی میت نہ دیکھ سکا۔ نہ اُسے اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتار سکا۔ ولید نے موٹر سائیکل سٹارٹ کرتے ہوئے سوچا کہ اُسکے امریکہ ہوتے اگر ماں مرتی۔ تو کیا وہ جنازے میں شرکت کے لئے جاتا۔؟

"ہائی پوتھیٹک باتوں سے صرف وقت ضائع ہوتا ہے" ولید کو پروفیسر آرتھر کی بات یاد آئی اور اُس نے موٹر سائیکل کی رفتار تیز کر دی۔

ꕥꕥꕥ

◎
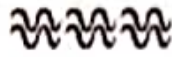
ستمبر 1999ء کی ایک شام ولید کو آخر کار وہ موقع مل ہی گیا۔ جس کی تلاش میں پچھلے کئی برسوں سے وہ محنت کی بھٹی اور لگن کی آگ میں سلگ رہا تھا۔ پروفیسر آرتھر کے گھر میں امریکہ کے پانچ مشہور لوگ اپنی اپنی کمپنیوں کے سی۔ای۔او۔ چند تکنیکی معاملات کو طے کرنے۔ کاروبار میں "مل بانٹ کر کھانے" اور ایک دوسرے کے تجربوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے روشن مستقبل کے لئے منصوبہ بندی کرنے اکٹھے ہوئے تھے۔ سب کا موضوع سخن۔ کمپیوٹر۔ انٹرنیٹ۔ اور نئی دریافتیں۔! پیسے والے لوگ تھے۔ پیسہ لگا کر مزید پیسہ حاصل کرنے کی سعی۔! ولید کی یہ بات کبھی بھی سمجھ نہ آسکی تھی کہ ایک خاص حد تک پیسہ کما لینے کے بعد لوگ مزید پیسے کی تلاش کی بجائے کچھ اور کیوں نہیں کرتے۔؟

" آپ سب ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ لیکن اِس نوجوان کو صرف مَیں جانتا ہوں۔ خدا نے اِس کو ایک تخلیقی اور انوکھا دماغ دیا ہے۔ اِسکے بنائے ہوئے۔ ڈیزائن کئے ہوئے۔ تین پروگرام مارکیٹ میں کامیابی سے چل رہے ہیں۔ حیران ہو گئے آپ؟ جی ہاں۔ مَیں پھر یہی کہوں گا کہ آپ اِس نوجوان کو نہیں جانتے۔ اس سے ملئے۔ یہ وا۔لِڈ ہے" ولید کو پروفیسر آرتھر باوجود کوشش کے وا۔لِڈ سے زیادہ بہتر طریقے سے نہیں بول سکتے تھے۔

کچھ دیر بعد۔ یہ بھول کر کہ کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ وہ پانچ لوگ۔ سوال کر رہے تھے اور ولید جواب دے رہا تھا۔ اگلے بیس برسوں میں ٹکنالوجی کہاں پہنچ جائے گی۔ کن کن ملکوں میں کس کس پراڈکٹ کی مانگ ہو سکتی ہے۔ ایک مستقل نوعیت کا خود بخود اپ ڈیٹ ہونے والا کمپیوٹر بنایا جا سکتا ہے کہ نہیں۔ ہندوستان میں کمپیوٹر ٹکنالوجی کا مستقبل کیوں اتنا روشن ہے۔ امریکہ میں بیٹھے کاروباری لوگ اور طالب علم۔ اپنے ٹیکسوں اور امتحانوں کے مسائل سنگاپور میں بیٹھے لوگوں سے کمپیوٹر کے ذریعے کیسے حل کروائیں گے۔ مِلوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی تعداد۔

CS CamScanner

کمپنیوں میں کام کرنے والوں کی تعداد۔ سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں۔ خاص طور پر۔ تیسری دنیا کی اتنی بڑی مارکیٹ میں۔ کام کرنے والوں کی تعداد۔ کس حیران کن حد تک کم کی جا سکتی ہے۔ آڈیو اور وڈیو۔ سی ڈی روم۔ انٹرنیٹ کے ذریعے ٹکنالوجی کا انقلاب۔ کس طرح اگلے پانچ برسوں میں سب کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ وہ پوچھ رہے تھے اور ولید اعداد وشمار کی مدد سے۔ تازہ ترین حوالوں کے ساتھ۔ جواب دے رہا تھا۔ اُن پانچ کاروباری لوگوں کے ساتھ ساتھ پروفیسر آرتھر بھی حیرانی سے اس پاکستانی نوجوان کی باتیں سُن رہے تھے۔ جسے چند برسوں میں ہی امریکہ کا اُن سے زیادہ علم ہو چکا تھا۔ تین نے ولید کو اپنے آفس میں " کسی دن" آنے کی دعوت دی۔ ایک نے اپنا وزیٹنگ کارڈ دیا کہ " کل آ سکتے ہو تو آ جانا"۔ اور ایک نے۔ کھانے کے دوران ولید کے گھر سے پک کرا کے اپنے آفس لانے کی پیشکش کے ساتھ ساتھ۔ اپنا ڈائریکٹ ٹیلی فون نمبر بھی دیا۔ ولید کے نئے پراجیکٹ پر بات کی۔ اور باقی باتیں " کل ہوں گی" کہہ کے ولید کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا" ڈیوڈ کو بھی کل بلا لوں گا۔ میرا بیٹا۔ مَیں چاہتا ہوں۔ تم دونوں مل کر کام کرو۔ سارے معاملات طے کئے جا سکتے ہیں"۔ ولید کو اچانک لگا جیسے ایک سے ایک ہزار تک کی گنتی پوری ہوگئی۔ اُسے A مل گیا۔! پانچ گھنٹوں کی اُس محفل میں اُس نے سوائے پانی کے۔ نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ اُسکی بھوک اُڑ چکی تھی۔ اُسے یقین سا ہو چلا تھا کہ کل کا سورج کسی نئی منزل کی نوید دے گا۔ اُسکی محنت رنگ لائے گی۔ "بعضے گمان گناہ بھی ہوتے ہیں"۔ اُس نے گمان کرنے کی بجائے یقین کے ساتھ سوچنا شروع کیا۔

خدا حافظ کہنے کے لئے پروفیسر آرتھر باہر آئے تو ایک ایک کر کے پانچ شوفر ڈرون گاڑیاں آگے پیچھے کھڑی تھیں۔ ولید کی 1977 ماڈل فورڈ اندھیرے میں کہیں دُور پارک تھی۔ پروفیسر آرتھر کا شکریہ ادا کر کے ولید نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سگریٹ نکالا۔ سلگاتے ہوئے۔ اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔ جہاں بادلوں میں گھرا چاند۔ اچانک سامنے آیا اور اُسے ایسے لگا جیسے اُس کے والدین نے اُسکا نام "ولید" اِسی لمحے کے لئے۔ رکھا تھا۔ "وا۔لڈ"۔ ولید نے مسکراتے ہوئے دھرایا اور گاڑی سٹارٹ کر دی۔

ﷲﷲﷲ

◎

"پیارے عارف۔ حکم کے بادشاہ نے آج مجھے بھی بادشاہ بنا دیا ہے۔ جانتے ہو نا کہ تاش کے چاروں بادشاہ۔ مشہور بادشاہوں کی تصویریں اور تصور لے کر بنائے گئے تھے۔ پان کا بادشاہ چیمبر لیس۔ چڑیا کا بادشاہ سکندر اعظم۔ اینٹ کا بادشاہ جولیس سیزر۔ اور حکم کا بادشاہ کنگ ڈیوڈ۔! ڈیوڈ۔ ہماری کمپنی کے مالک کا بیٹا ہے۔ پچھلے ایک سال سے ہم دونوں ساتھ کام کر رہے ہیں۔ ڈیوڈ نے نام اور پیسہ کمایا ہے۔ مَیں نے صرف پیسہ۔ یہی مجھے چاہیئے تھا۔ نام میں کیا رکھا ہے۔ جدو جہد آزادی میں بیس پچیس۔ نامور لوگوں۔ نے ہی تو پاکستان حاصل نہیں کیا تھا۔ بے شمار گمنام۔ مگر۔ اہم۔ لوگ اور بھی تھے۔ جو ہمیشہ گمنام ہی رہیں گے۔ خیر۔ سب سے پہلے تو اتنی دیر کے بعد ای میل دینے پر شرمندہ ہوں۔ وقت نہیں ملا۔ تمہاری کئی ای میلیں۔ اِن باکس میں پڑی ہیں۔ معافی۔!

تم اب یہاں آسکتے ہو۔ یہاں آ کے قسمت آزماؤ۔ میرے گھر میں بہت سے کمرے ہیں۔ دو گاڑیاں۔ اور ایک نیپالی ملازم بھی۔ جو پاکستانی کھانے خوب بناتا ہے۔ اگلے ماہ مَیں اور ڈیوڈ واشنگٹن جا رہے ہیں۔ ایک بہت اہم میٹنگ ہے۔ ملاقات کی نوعیت حساس ہے۔ بتا نہیں سکتا۔ آؤ گے تو مل کر باتیں کریں گے۔ تم اگست میں آنے کا پروگرام بنا لو۔ اِسی ای میل کی attachment دکھا کر تمہیں وزٹ ویزا حاصل کرنے میں آسانی ہوگی۔ سدرہ سے ملتے آنا۔ اور اُس سے بہت سی چیزوں کی لسٹ بھی بنوا لینا۔ جو اُسکے بیٹے اور اُس کو چاہییں۔ اور ہاں اُس کے پاس ماں کی ایک کالی شال ہے۔ جو وہ نماز پڑھتے وقت شانوں پر رکھتی تھیں۔ وہ ضرور لے آنا۔

باہر جینی انتظار کر رہی ہے۔ "جینی" کے بارے میں بعد میں کسی وقت بات کریں گے۔ جینی کے بال لمبے ہیں اور آنکھیں جھوٹ نہیں بولتیں۔ لو۔ دو باتیں تو تمہیں بتا دیں۔ اپنا خیال رکھنا۔ تمہارا۔ ولید"

یہاں سے آگے

ولید ای میل بمشکل بھیج سکا تھا کہ مین دروازے سے ہوتی ہوئی۔ اُسکی سٹڈی میں بغیر دستک دیتے ہوئے جینی آ گئی۔

"اور انتظار نہیں ہوتا" اوپرا" ہمارا انتظار نہیں کرے گا۔ مشکل سے دو سیٹیں ملی ہیں۔ اور راستہ بھی پورے ایک گھنٹے کا ہے"۔ جینی نے تقریباً ہانپتے ہوئے کہا" یہ وہی "اوپرا" ہے جو کل بھی چلا تھا۔ آج بھی چلے گا۔ اور کل بھی چلے گا"۔ ولید نے جوتوں کے تسمے باندھتے ہوئے کہا" کیا مطلب"۔؟

"فلم، اوپرا، میچ، ڈرامہ۔ یہ سب اچھی کمپنی میں دیکھنے کا مزا آتا ہے۔ ورنہ اچھا خاصہ ڈرامہ اکیلے دیکھیں۔ تو لگتا ہے امتحان کی تیاری کرنے کے لئے نوٹس بنانے آئے ہیں"

"میرا" اوپرا" تو یہیں شروع ہو گیا۔ اب چلو گے بھی۔"۔؟

"واپسی پر کھانا کہاں کھائیں گے۔" گاڑی سٹارٹ کرتے ہوئے ولید نے پوچھا

"پہلے۔ یہاں آئیں گے۔ مَیں اپنی گاڑی لوں گی۔ تم بیٹھو گے۔ اور آج کھانا۔ میرے گھر میں ہو گا"۔

"تم خود بناؤ گی"

"تمہارا حساب تو کمال کا ہے۔ کمپیوٹر کو باہر سے دیکھ کر ماؤس کی ایک کلک سے پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلے تک پہنچ جاتے ہو۔ تمہیں یاد ہے آج میری سالگرہ ہے۔"

"آئی۔ ایم۔ سو۔ سوری۔ لو بھئی معاف کر دو۔ تم نے بتایا کیوں نہیں"۔ ولید نے کہا اور کوٹ کی اندرونی جیب سے اچھی طرح پیک کیا ہوا ایک چھوٹا سا ڈبہ جینی کے ہاتھ میں دے دیا "ہپی۔ برتھ ڈے"۔ ولید نے مسکراتے ہوئے کہا" دیکھا۔ تمہیں یاد تھا۔ اور پھر بھی۔۔۔۔۔"

جینی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"ایک ریسٹورانٹ میں ڈیوڈ کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے۔ ڈیوڈ نے جینی سے ولید کا تعارف کرایا تھا۔ دو تین مرتبہ کافی۔ چائے۔ اور دوپہر کے کھانے کے بعد۔ ایک دن جینی اور ولید۔ ولید کے دفتر میں ملے تھے۔ جینی کے بال کالے اور بہت لمبے تھے۔ سکاٹش ماں اور ہندوستانی باپ کا حسین امتزاج۔ دو بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جینی کے باقی سارے خدوخال مغربی تھے۔ بنگلور جانے کا اُسے بہت شوق تھا۔ ڈیوڈ کے دفتر میں کام کرتے ہوئے اُسے دو سال ہی ہوئے تھے۔

CS CamScanner

ایک طویل۔خوامخواہ کی گفتگو کے بعد۔ولید نے اپنی جیب سے ایک کوارٹر نکال کر جینی کو دیا۔اور کہا کہ اگر۔دوستی کرنے کا خیال اُسکو آئے۔تو وہ یہ کوارٹر کسی ٹیلیفون بوتھ میں ڈال کر۔ولید کو فون کرے۔اور صرف یہ کہے کہ وہ ولید کا دیا ہوا کوارٹر استعمال کر کے فون کر رہی ہے۔ولید سمجھ جائے گا۔

اپنی سالگرہ والے دن۔ "اوپرا" دیکھنے کے بعد۔جینی کے گھر میں کھانا کھاتے ہوئے۔ولید نے ایک کوارٹر جینی کے گلے میں ایک سونے کی چین کے ساتھ لٹکتا ہوا دیکھا تو اُس سے رہا نہیں گیا۔

"یہ تمہارے گلے میں کوارٹر ہی ہے نا"؟

"ہوں"

"وہی والا ہے یا کوئی۔۔۔۔۔"

"وہی والا ہے"

"تو استعمال نہیں کروگی"

"موقع نہیں ملا۔کھانے کی طرف بھی دھیان دو"

"ذرا رکنا یہاں۔۔۔۔۔"ولید نے کانٹا میز پر رکھ دیا اور چاولوں کی پلیٹ تھوڑی سی پرے سرکا دی" کیا ہوا"۔جینی نے بھی کھانا روک دیا۔

"پاکستان میں دوستی۔محبت۔اور شادی کے تصورات کی خاص شکلیں ہیں۔لڑکے۔لڑکی کی دوستی۔عموماً شادی میں یا پھر عمر بھر شادی نہ کرنے کے فیصلے میں بدلتی ہے۔میں ابھی پورا امریکی نہیں ہوا۔پاسپورٹ بننے سے تہذیب نہیں بدلتی۔بہت ضروری ہے تمہیں بتانا کہ کسی قسم کی شادی وادی کا میں نے ابھی نہیں سوچا۔اور تمہیں کسی دھوکے میں رکھ کر کسی قسم کا فائدہ اٹھانا بھی نہیں چاہتا۔مجھے معلوم ہے تمہیں میری باتیں بری لگ رہی ہوں گی۔لیکن میں ایسا ہی ہوں۔ایب نارمل۔!"

"امریکہ میں رہتے ہو اور باتیں پتھر کے زمانے کی۔کیا تم وہی ہو جسے واشنگٹن میں اگلے ماہ اُس اہم میٹنگ میں بلایا گیا ہے؟ کیسی باتیں کر رہے ہو۔تم یقیناً مذاق کر رہے ہو"۔جینی تذبذب کا شکار تھی

"مذاق ہی تو کرنا آتا نہیں مجھے۔! بچپن سے حالات میرے ساتھ مذاق کرتے آئے ہیں۔ کسی ایک کو بھی اتنی چھوٹی سی بات نہیں سمجھا سکا۔ کہ مجھے شادی اُس وقت کرنی ہے جب شادی کا وقت آئے گا۔ میرے خواب پورے ہو چکے ہوں گے۔ اور مَیں دو ایک بچوں کو اُن کا مستقبل فراہم کرنے کے قابل۔ باپ۔ بن سکوں گا"۔ ولید کا لہجہ اچانک کچھ سخت ہو گیا تھا۔

"بچے تو اپنا مستقبل خود لاتے ہیں"۔

"نہیں۔ کچھ بچوں کو اپنا حال اور مستقبل خود تراشنا پڑتا ہے۔ نیکی اور برائی کے بیچ رہ کے"۔

"نیکی اور برائی کہاں سے آ گئے بیچ میں"۔

"یہ بیچ میں آئے نہیں۔ یہ شروع سے ساتھ تھے۔ آخر تک ساتھ رہے ہیں۔ ہم مانیں یا نہ مانیں۔ ہم ماننا چاہیں یا آنکھیں بند رکھنا چاہیں۔ سچ کا۔ اور وہ بھی۔ مکمل سچ کا سامنا کرنا انسان نے ابھی تک نہیں سیکھا۔ کچھ فیصد جھوٹ ضرور شامل کرنا پڑتا ہے۔ ورنہ رابن سن کروسو کی طرح ایک طوطا کندھے پر بٹھا کر کسی جزیرے کی طرف نکل جانا چاہیئے"۔

"آج میری سالگرہ ہے۔۔۔۔۔" جینی نے ولید کا ہاتھ پکڑ کر کہا" پچھلی سالگرہ بھی اسی دن کو تھی۔ اگلے سال بھی سالگرہ ہو گی۔ ہم اپنے آپ کو اِس طرح دہرانے کا عمل کب تک جاری رکھیں گے۔ معافی چاہتا ہوں اگر میری کسی بات سے تمہیں دکھ ہوا ہو۔ اور ہاں۔ صرف دوستی۔ کرنی ہو تو مجھے فون کر دینا۔ دوستی۔ جس میں ایک دوسرے کی باتیں ہوتی ہیں۔ دکھ سکھ۔ بانٹے اور تقسیم کئے جاتے ہیں۔ نیکی اور برائی کی لڑائیاں لڑی جاتی ہیں۔ پیسہ مل جانے پر جشن اور کھو جانے پر تسلی۔ وہی دوستی۔ جو تمہارے اکیلے پن اور میرے اکیلے پن کی راز داں بنے گی۔ امریکی دوستی نہیں۔ جو رات ختم ہو جانے کے بعد اگلی رات کا سوچتی ہے۔ جس میں دن نہیں آتا"۔

ولید نے جاتے ہوئے جینی کی بے چینی نہیں دیکھی۔ اور نہ ہی اُس نے جینی کو کوارٹر والا لاکٹ ایک جھٹکے سے توڑتے دیکھا۔ اُسے صبا یاد آ رہی تھی۔ جس نے "محبت" کی۔ نبھائی نہیں۔ جس نے شادی کی۔ سہاگن بنی۔ لیکن محبت کے اصلی معانی سمجھنے سے قاصر رہی۔ پاکستان کی صبا ہو یا امریکہ کی جینی۔ عورت ابھی مرد کی سمجھ میں نہیں آئی ہے۔ "اور نہ شائد آئے گی"۔ ولید نے سوچا اور گھر سے باہر آ گیا۔!

☙☙☙

◎

عارف جس دن امریکہ پہنچا۔ ولید نے چار دن کی چھٹی لی۔ دونوں نے نیو یارک۔ واشنگٹن۔ نیو جرسی۔ ورجینا اور پین سلوانیا۔ گاڑی کے ایک لمبے سفر میں دیکھے۔

"پانچ سٹیٹس چار دن میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ کسی ایک شہر کو پورا دیکھنے کے لئے ایک عمر بھی ناکافی ہوتی ہے۔ لیکن تم تو شاعر ہو بھئی۔ شاعر تو کسی جگہ کو دیکھے بغیر بھی دیکھ لیتے ہیں۔ بلکہ ہمارے ملک میں دو ایک مشہور سفر نامہ نگار۔ سفر کئے بغیر۔ بروشرز کی مدد سے سفر نامے لکھ لیتے ہیں"۔ ولید نے اپنی سنڈی میں پڑی ایک ایک چیز عارف کو دکھاتے ہوئے کہا

"اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ شاعر بھی ایک عام انسان ہوتا ہے۔ دل میں نئی جگہ کی۔ نئے شہر اور نئے ملک کو دیکھنے کی خواہش اور سوال پوچھنے کی لگن۔ شاعر کے دل میں بھی ہوتی ہے" عارف نے میلان کنڈیرا کا ناول سنڈی میں پڑی بہت سی کتابوں میں سے چنتے ہوئے جواب دیا۔

"تمہاری شاعری کیسی چل رہی ہے۔ تیسری کتاب چھپی کہ نہیں"

"پبلشر کو دی ہے۔ دیکھو چند مہینوں میں شائد چھپ جائے"

"شاعری۔ شادی۔ زندگی۔! کونسا قافیہ صحیح طور پر سمجھ میں آیا" ولید نے پوچھا

"اِن کو سمجھنے کے لئے روشنی۔ آگہی۔ اور تشنگی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ابھی تشنگی اور آگہی کے مراحل سے گذر رہا ہوں۔ روشنی ملے گی تو بات کریں گے"۔

"مہاتما بدھ بننے کا ارادہ ہے"۔؟

"اتنا حوصلہ کہاں"۔؟

"کیوں؟ شاعری کی حد تک تو۔۔۔۔۔ لیکن چھوڑو۔ یہ بتاؤ۔ تمہیں میرا گھر کیسا لگا"۔؟

"بڑا ہے۔ خوبصورت ہے۔ ماں زندہ ہوتی تو بہت خوش ہوتی۔ سدرہ نے کہا تھا کہ

Mir Zaheer Abass Rustmani
CamScanner

وہ۔ یہاں آ کے۔ تمہارے گھر کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی ہے۔ بڑے ناز سے تمہارا ذکر کرتی ہے"۔

"صبا کبھی نظر آئی"

"نہیں۔ تم بتاؤ جینی سے کب ملوا رہے ہو"

"اب شائد اسکی ضرورت نہیں رہی" ولید کیسے بتاتا کہ جینی کے ساتھ کیسے دوستی ہوئی۔ ٹوٹی۔ پھر ہوئی اور اب.....

"کیوں"

"کاسموس اور سلی کان ویلی کو سمجھ چکا ہوں۔ لیکن اپنے بچپن کے چند خوف۔ کچھ اقوال زریں۔ ابا کی باتیں۔ ماں کی امنگیں۔ بہت سے سائے ہیں عارف۔ مَیں آزادانہ طریقے سے نہیں سوچ سکتا۔ میرا سائیکالوجسٹ کہتا ہے کہ مجھے ہر بات کا۔ ہر چیز کا ناسٹلجیا ہے"۔

"تم۔ تمہارا کوئی سائیکالوجسٹ بھی ہے۔ یہ کب ہوا؟"

"یہ امریکہ ہے۔ یہاں سائیکالوجسٹ کے پاس۔ ضروری نہیں کہ بیماری ہو تو آدمی جاتا ہے۔ ٹینس کا ہر بڑا کھلاڑی۔ ہر اہم میچ سے پہلے۔ ایک تفصیلی گفتگو اپنے سائیکالوجسٹ سے کرتا ہے۔ جو اُسے بتاتا ہے بلکہ یقین دلاتا ہے کہ تم ہی دنیا کے نمبر ایک کھلاڑی ہو۔ اور تمہیں کوئی ہرا نہیں سکتا۔ اس سے فرق پڑتا ہے"۔

"پڑتا ہوگا۔ مجھے تو اتنا پتہ ہے کہ دنیا بھر کے سائیکالوجسٹ میری بیوی کو عقل کی کوئی بات نہیں سمجھا سکتے تھے"۔

"عقل کی بات بچوں کو سمجھائی جاتی ہے۔ بڑوں کو سمجھا جاتا ہے۔ اور عورت کو بحیثیت مجموئی تو بڑے بڑے دانا بھی نہ سمجھے۔ تم اور مَیں کیا سمجھیں گے"۔

ابا جی۔ ماں کو نہ سمجھ سکے۔ پی ایچ ڈی کام نہ آئی۔ اور ماں نے ابا جی کو اپنا ایم۔ اے استعمال کئے بغیر سمجھ لیا تھا۔ صبا مجھے سمجھ نہ آسکی۔ لیکن جینی نے دومنٹ میں مجھے پورا سمجھ لیا۔ یار یہ مرد لوگ۔ ہم لوگ۔ اپنے آپ کو اتنا ارسطو اور طرم خان کیوں سمجھتے ہیں۔؟"

"اپنے سائیکالوجسٹ سے پوچھنا"۔

"ہوں۔ چلو۔ تم کل کی تیاری کرو۔ کل تمہاری نوکری کا پہلا دن ہوگا۔ مجھے بھی کل کی

CamScanner

تیاری کرنی ہے۔ اور ہاں۔ میرے گھر واپسی کے امکانات یا اوقات نہیں ہوتے۔ اکثر۔ اپنی روٹین میں میرے آنے کا انتظار وغیرہ شامل نہ کرنا۔ اسی لئے تمہاری entrance بالکل independent ہے۔ جب مرضی آؤ۔ جب مرضی جاؤ۔ تم آئے ہو تو اچھا لگا ہے"۔

"سٹڈی میں داخلہ فری ہے"۔؟

"اگر میں نہ ہوں تو بالکل فری۔ ویسے تمہارے کام کی کتابیں یہاں کم ہی ملیں گی"

"تم نے شادی کب کرنی ہے؟"

"ارے۔ یہ شادی کہاں سے یاد آ گئی"

"سائے تو ہمیشہ ساتھ رہیں گے۔ بچپن بھی ساتھ جڑا رہے گا۔ پیسہ بھی خوب بنالیا ہے۔ گھر بھی ہے۔ اب تم اپنے بچوں کو مستقبل کا تحفہ دینے کے قابل بھی ہو گئے ہو....."

"شادی بھی کر لیں گے۔ اس ملینیم میں ابھی بہت سے سال باقی ہیں۔ ابھی تو شروع ہوا ہے۔ اور تم نے میری شادی کروا کے کیا کرنا ہے۔؟"

"امریکہ۔ شادی کے بغیر۔ کسی بھی قسم کی کوئی بھی عورت۔ نہ کسی عورت کا سایہ۔ شادی نہ سہی کچھ "شادی نما" ہی کوئی کام کرلو"۔

"شادی نما"۔ یہ بھی اچھا ہے۔ جہاں نما تو سنا تھا۔ یہ شادی نما پہلی بار سنا ہے"

"میرا مطلب ہے۔ ذہن۔ دل۔ اور روح کے ساتھ ساتھ بدن کی کچھ ضروریات بھی ہوتی ہیں"۔

" کیا بے تکا سوال ہے "

عارف نے اپنے ذہن میں مختلف انداز سے تجزیے کئے۔ لیکن اُسے سمجھ نہ آ سکا کہ ولید اپنی کچھ ضروریات آخر کہاں سے پوری کرتا ہوگا۔ زیادہ کریدولید کو اچھی نہیں لگتی تھی۔ لہٰذا عارف نے بحث کو آگے بڑھانے کی بجائے بات ہی بدل دی "بارسلونا کب جاؤ گے۔؟ اور پھر پاکستان کب چلنا ہے بھئی"۔

"حیدر ماموں کے دوست کا پتہ ڈھونڈ لیا ہے۔ بارسلونا کے ساتھ Figueres بھی جانا ہے۔ جہاں سلواڈور ڈالی پیدا ہوا اور پھر اُس کا انتقال بھی وہیں ہُوا۔ ذرا وقت ملے تو چکر لگاؤں گا۔ غرناطہ اور قرطبہ بھی جانا ہے۔ سپین پورا ہی دیکھنے والا ملک ہے۔ لیکن وقت کم ہوگا۔ اور پاکستان۔

CamScanner

پاکستان ابھی نہیں۔تم آگئے ہو۔آدھا پاکستان تو میرے پاس آگیا ہے"۔

"اور باقی کا آدھا۔؟"

"ہمارے ہاں آدھا پاکستان ہی اب پورا ہے"۔اور ولید نے سیل فون کی گھنٹی۔اُس پر آئے نمبر کو دیکھ کر۔بند کردی۔

ﷳﷳﷳ

CamScanner

◎

"سیسنا C-421 خریدیں گے۔ جہاز بہت قسم کے ہوتے ہیں۔ سب سے ضروری فیصلوں میں ایک یہ ہوتا ہے کہ کونسا جہاز خریدنا ہے۔ سیکنڈ ہینڈ یا برینڈ نیو۔ اس بارے میں ایک 90% رُول ہوتا ہے" ولید اپنے ڈرائینگ روم میں سامنے رکھی میز پر کچھ کاغذات اور سکیچیز بچھائے عارف کا اپنا ذاتی جہاز خریدنے کے بارے تفصیل بتا رہا تھا۔

"90% رؤل۔ یہ کیا ہوتا ہے"۔ عارف نے سیسنا C-421 کی ایک بڑی سی تصویر پر نظریں لگا رکھی تھیں۔ جس کے interior میں ڈرائینگ روم کی طرح کی چار صوفہ چیرز ایک ساتھ۔ آمنے سامنے پیوستہ تھیں۔

"یعنی۔ اس جہاز کا 90 فیصد استعمال کیسے ہونا ہے۔ 4 سیٹوں والا۔ 5 سیٹوں والا۔ یا پھر اس سے بڑا جہاز۔ اسی کلیے پر خریدا جاتا ہے۔ اور پھر یہ کہ نیا جہاز خریدنا چاہیئے۔ گاڑیوں کی انشورنس کے بالکل الٹ۔ نئے جہاز کی انشورنس پرانے جہاز کی انشورنس سے کم ہوتی ہے۔ پھر پرانے جہاز کی maintenance اور خواہ مخواہ کے خرچے"۔

"اتنے پیسے آ گئے کہ اب پورے کا پورا جہاز ہی خریدلو گے"

"سارے نہیں۔ اس سلسلے میں اگر خریدنے والے کی کریڈٹ ہسٹری اچھی ہو۔ اور پچھلے دو سال کی ٹیکس ریٹرنز بھری ہوں تو بنک بقیہ رقم دے دیتا ہے۔ میری Debt ratio بیالیس فیصد سے کم ہے۔ لہٰذا بنک نے حامی بھر لی ہے۔ ایف۔ اے۔ اے کے قوانین بھی پڑھ لئے۔ بس ایک زبردست اکاؤنٹنٹ کی ضرورت ہے۔ جسے میں کچھ باتیں سمجھا دوں گا۔ اور ہوم ڈیلیوری سے ایک ہفتہ پہلے تمہیں فون آئے گا۔ محترم۔ آپکا جہاز ڈیلیوری کے لئے تیار ہے۔ تمہیں یاد ہے عارف۔ کانٹلے پارک۔ میں نے تمہیں کہا تھا کہ ایک جہاز تو ضرور خریدوں گا۔ والد صاحب کو جہاز میں بیٹھنے کا بہت شوق تھا"۔ ولید نے سامنے رکھی ایک لمبی چوڑی۔ بڑی سی۔ تصویروں سے بھری

CS CamScanner

کتاب بند کر دی۔ جس کے اندر ہیلی کاپٹرز۔ ٹربو پراپس۔ ٹوِن لیسٹنز۔ ایگزیکٹو جیٹس اور نجانے کن کن قسموں کے ایئر کرافٹ قید تھے۔

"تو اس جہاز کا کرو گے کیا۔ خود اڑاؤ گے؟" عارف نے پوچھا

"چار سے چھ مسافر اس میں بیٹھ سکیں گے۔ ایک پائلٹ کی سروسز حاصل کریں گے۔ اور اس جہاز کی۔ اس کے حساب کتاب کی ساری ذمہ داری۔ تمہاری ہوگی"۔ ولید نے عارف سے بہت پہلے کی ہوئی کسی بات کو پورا کرتے ہوئے کہا

"میں جہازوں کے بارے اتنا ہی جانتا ہوں جتنا جہاز بحر اوقیانوس کے بارے میں جانتے ہیں۔ بھائی لوگ۔ مجھ سے کوئی غزل کہلواؤ۔ نظم لکھواؤ۔ ہجو لکھواؤ۔ یہ کس بکھیڑے میں مجھے ڈالنے لگے ہو"۔ عارف کو دیر لگی۔ ولید کی بات پوری سمجھنے میں۔!

"The airport Owners and Pilots Association" میں ایک شخص سے واقفیت نکالی ہے۔ تمہیں سب سمجھا دے گا۔ فکر کو کوئی بات نہیں۔ جو منافع ہوا۔ تمہارا لیکن اس کی ساری maintenance بھی تمہاری ذمہ داری ہوگی" ولید نے جیسے ساری شرائط ایک ساتھ بتا دیں۔ ظاہر ہے۔ بیوی کو طلاق دے کر۔ کسی معقول نوکری کے نہ ہونے اور امریکہ دوست کے پاس چلے آنے والے۔ عارف کا کوئی ذریعہء معاش تو ہونا چاہیئے تھا۔ شائد ایک نئی زندگی شروع کرنے کے لئے۔ یا زندگی کو پرانی روش پر ہی چلانے کے لئے۔!

"بچپن میں بھی تم آگے تھے۔ اور آج بھی آگے ہو۔ حسرت ہی رہی کہ میرا بھی کوئی ارادہ ایسا ہو جو پکا ہو۔ متزلزل نہ ہو۔ اور منزل کے آنے تک مسافت کو کسی ایک ہی سمت میں چلانے کے فن جانتا ہو"۔ عارف کا لہجہ کچھ آزردہ سا ہو گیا تھا۔

"بچپن میں ہم آگے پیچھے نہیں۔ ساتھ ساتھ تھے۔ اور آج بھی دیکھو۔ بالکل ساتھ ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تم اچھے لوگوں میں سے ہو۔ مرضی کا ماضی نہ ہو تو بھول سکتے ہو۔ مرضی کا کوئی وعدہ نہ ہو تو دلیل ڈھونڈ کر زندگی کو نئے راستے پر گامزن کر سکتے ہو۔ میں تو تم سے ہزاروں میل پیچھے ہوں۔ مجھ سے تو صبا کے ساتھ ایک وعدہ کرنا نصیب نہ ہوا۔ اسے کہتے ہیں بد قسمتی"۔ ولید بھی کچھ اداس لگ رہا تھا۔

"اور اسے کہتے ہیں آدمی کا بڑا پن"۔ عارف نے آگے بڑھ کے ولید کو گلے لگا لیا۔ اور

چند لمحوں تک دونوں ماضی ۔ حال ۔ مستقبل کے کئی جھروکوں سے ۔ اکیلے اکیلے ۔ گذرے ۔ باہر بجنے والی گھنٹی اور کار کا ہارن ۔ دونوں کچھ ساعتوں کے فرق سے سنائی دیئے ۔

"چلتا ہوں ۔ ایک بہت ضروری میٹنگ کے لئے ڈی ۔ سی جانا ہے ۔ تیاری کرنی ہے ۔ ماں ہوتی تو اُسے دعا کے لئے کہتا ۔ اِسی میٹنگ کے بعد میرا خواب پورا ہونے کی راہ کُھلے گی" ۔ ولید نے کہا اور اپنا بریف کیس پکڑ کر جلدی سے باہر نکل گیا ۔ عارف نے دل ہی دل میں اپنے دوست کی کامیابی کی دعا مانگی ۔ اور سوچنے لگا کی یہ شخص ۔ جو اِس کا اتنا قریبی دوست ہے ۔ بالکل اکیلا ہے ۔ لیکن اکیلا ہوتے ہوئے بھی ۔ ایک کارواں کی طرح ہے ۔ جو ادھر اُدھر سے آتے ہوئے ۔ بے نام ۔ گمنام ۔ مسافروں کو اپنے وجود کے اندر بھری وسعتوں میں سمیٹ لیتا ہے ۔ اپنے دکھ درد سے عاری ۔ اپنی تکلیفوں سے بے نیاز ۔ کارواں ۔ جس کی روانی ہی میں زندگی ہے ۔ اور جسکی زندگی ہی روانی ہے ۔

ﷻﷻﷻ

◎

"تمہیں پتہ ہے شگفتہ۔ مجھے تیرنا بہت اچھا لگتا تھا۔ میں کم گہرے پانی میں دور تک تیر سکتی تھی۔ پانی میں شرابور جب اگلے سرے تک پہنچتی۔ تو میری ماں وہاں خاموش کھڑی ہوتی تھی۔ اُسے پانی سے ڈر لگتا تھا۔ جتنی دیر میں پانی میں رہتی وہ خدا سے مجھے مانگتی رہتی۔ پانی میں سبز کائی کے چھوٹے چھوٹے جزیرے میرے پاس سے گذرتے۔ تہہ کی باریک ریت دکھائی دیتی۔ اور کبھی کبھی میرے بازوؤں سے کوئی چھوٹی سی مچھلی چھو کر گذر جاتی۔ اور مجھے خوش کر جاتی۔ مجھے اپنی ماں کے ڈر کا اندازہ تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ دونوں کناروں کے درمیان میرے ہاتھ پاؤں سُن ہو گئے تو میں سطح سے اُتر کے نیچے تہوں میں چلی جاؤں گی تو وہ کیا کرے گی۔؟ میں اس لمحے دونوں کناروں کے بیچ ہوں۔ میرے ہاتھ پاؤں سُن ہو چکے ہیں ٹھنڈے پانی کی تیز لہریں ایک جال بنا کر مجھے گھیرے میں لئے ہیں۔ میرا وجود سطح کو چھوڑ کر تہوں کا حصہ بننے والا ہے اور کنارے پر خدا کے سامنے کھڑی میری ماں ساری دعائیں بھول چکی ہے.....!" صبا کی آنکھوں میں کسی جھیل کا سناٹا تھا۔

"یہاں شادی کی ساری تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں۔ اتنے مہنگے جوڑے مجھے بنوانے پڑے ہیں۔ اتنی مشکل سے اجازت لے کر ایک ہفتہ کے لئے۔ یہاں آئی ہوں۔ اور تمہیں دیکھو۔ اور ویسے بھی مجھے اتنی مشکل مشکل باتیں سمجھ نہیں آتیں" شگفتہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اور وہ اپنی دوست کا دکھ سمجھ رہی تھی۔!

"میری کتاب میں سے کوئی ضروری صفحہ پھٹ گیا ہے شگفتہ۔ کہانی بے ربط ہو گئی ہے۔ اب سوچتی ہوں تو خیال آتا ہے کہ ولید نے میرے پاس سوائے سوالوں کے اور کیا چھوڑا ہے۔ آسان سے سوالات۔ مشکل سوالات۔ محض سوالات"۔ صبا نے بستر سے اٹھ کے کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا تھا۔

CamScanner

"میں اُسے کیسے بھولوں گی ۔!وہ تو میرے اندر بس رہا ہے۔اور میں نے بھی اُسکی یادوں کو سنبھال کر۔اندر ایک اکیلے گوشے میں رکھ چھوڑ تا ہے۔دل کے بہت گہرے سے تہہ خانے میں۔ جہاں یہ سونا۔ایک دن کندن بنے گا۔ پھر اس کی چمک میرے وجود کو طلائی کرنوں میں ڈھالتی رہے گی۔ دکھ ہی ہو گا ناں! دل کی رگیں ہی کھنچیں گی ناں؟ زیادہ سے زیادہ کیا ہو گا شگفتہ۔؟"

" تمہارے بچے ہوں گے۔جن کی تم اماں بنوگی۔وہ مجھے خالہ کہیں گے۔اور میں انہیں خوب ڈانٹوں گی۔اُن میں سے کسی ایک کو بھی ریاضی میں زیادہ نمبر نہ لینے دینا۔حسابی کتابی نہیں بنا ٹھمیں"۔شگفتہ سنبھل چکی تھی۔

" مجھے بولنے دو۔پلیز۔مجھے آج نہ روکو"۔صبا نے کہا۔

"بولو بھئی۔اور میرا خیال ہے۔سارا کچھ بول دو۔یہ کچھ بہتری ہی لائے گا۔شگفتہ نے صبا کو کاندھوں سے پکڑ کر دوبارہ بستر پر بٹھا دیا۔

" مجھے یوں لگتا ہے کہ سردیوں کی شامیں۔اب ھمیشہ اداس رہیں گی۔ننگی شاخوں سے ٹوٹے ہوئے پتوں اور تیز چلتی دکھی ہوا کا یہ منظر جم جائے گا۔اندھیرا دریچوں میں سرائت کر گیا ہے۔آ سماں سسکاریاں لے رہا ہے۔دریا کے دو پاٹ ہو گئے ہیں۔دورخی زندگی۔کیسے گذرے گی۔؟"

"اور وہ سرخ گلابوں والے خواب۔جو تم نے ابھی دیکھنے ہیں۔؟ اُن کا کیا ہوگا"۔

"زرد پتوں کے مُردہ شہر میں۔ ہرے اور سرخ رنگ کہاں۔؟ میں آنکھوں میں روشنی بھر جانے کا انتظار ہی کرتی رہی۔ بہت وقت گذر گیا۔اُسے اپنا آپ۔اپنا خیال۔اپنا وجود۔روح۔دل۔سونپتے ہوئے مجھے کیوں خیال نہ آیا کہ اُسے میری طرح کی محبت۔میرے ساتھ نہیں تھی۔کیوں خیال نہ آیا"۔صبا نے پھوٹ پھوٹ کے رونا شروع کر دیا۔شگفتہ نے اُسے گلے لگا لیا۔کچھ دیر تک دونوں روتی رہیں۔ اس بات سے بے خبر۔کہ گہری محبتوں کے دکھ۔رو کر منائے جا سکتے ہیں نہ بھلائے جا سکتے ہیں۔ یہ دکھ تو بتائے بھی نہیں جا سکتے۔ ان دکھوں کی حدیں دور دراز کی سرحدوں سے ملی ہوتی ہیں۔ بارش کی چاہ میں سوکھ کر بے آس ہونے والی مٹی کا دکھ۔کون لکھ سکا ہے؟ کون پورا بیان کر سکا ہے۔؟لفظوں کی کم مائیگی کا احساس شدید ہو جاتا ہے۔اندر کہیں ایک گمنام سی ہلچل ہوتی ہے۔ جسے ہم "درد" کہہ کر آگے نکل جاتے ہیں۔ یا "تکلیف" "دکھ" یا پھر

CS CamScanner

"ردِعمل" ۔لیکن روح تو جسم سے نکلتی کسی کو بھی نظر نہیں آتی ۔ بدن بے جان ہو جائے تو پتہ چلتا ہے! محبت کی تکلیف' دکھ' درد اور ردِعمل ۔ بدن کو بے جان نہیں کرتے ۔گمان گذرتا ہے کہ ہم زندہ ہیں ۔مگر ۔ضروری تو نہیں کہ محبت کی روح محبت والے جسم سے نکلے تو واقعی جان چلی جائے ۔محبت ظالم تو ہوتی ہے ۔لیکن اتنی بھی نہیں ۔اور یوں صبا جیسے لوگ ۔ پیارے لوگ ۔ دہلیز پر قدم رکھتے ہیں ۔اور اگلی زمینوں میں کتنے سانپ اُن کا انتظار کر رہے ہیں ۔ اس کی پروا کئے بغیر ۔قدم اٹھاتے ہیں اور چل پڑتے ہیں ۔ایک بات طے ہے ۔محبت کے بدن رکھنے والے لوگوں میں سے جس دن محبت کی روح نکل جاتی ہے ۔تو وہ واپسی کے سارے راستے بھی اپنے ساتھ لے جاتی ہے ۔ایک گہرا خلا چھوڑ کے ۔ایک اتھاہ تنہائی بو کر ۔ایک مہیب سناٹا بخش کے ۔!

☙☙☙☙

◎

"مجھے تم سے محبت ہے" یہ الفاظ ولید کے حلق سے کبھی نہ نکلے۔ اُسے صبا سے محبت تھی۔ لیکن وہ اتنا عرصہ اُسکے ساتھ رہنے۔ کئی مواقع ملنے۔ اور صبا کے بار بار اصرار کے باوجود وہ یہ "عام سی بات" نہ کہہ سکا۔ جینی اُسے اچھی لگتی تھی وہ اُسے سمجھتی تھی۔ آدھی ساؤتھ ایشیئن ہونے کے ناطے وہ ولید کے کئی رویّوں کو آسانی سے قبول کر لیتی تھی۔ چھوٹی چھوٹی اور طویل۔ دونوں طرح کی ملاقاتوں میں جینی کئی مرتبہ یہ الفاظ ولید سے کہہ چکی تھی۔ اور ہر مرتبہ ولید اپنے آپ کو ایک عجیب کیفیت میں دیکھتا۔ خاموش رہتا۔ چہرے کے تاثرات بدل جاتے۔ مگر بات "Me too" تک بھی نہ پہنچ سکی۔

جینی کی لگاوٹ میں ایک شدت تھی۔ اُس کی آنکھیں۔ گال۔ ہاتھ۔ ماتھا۔ ہونٹ۔ زبان کے ساتھ مل کر پکار پکار کر کہتے کہ ولید تم سے ہمیں محبت ہے۔ تم اقرار کیوں نہیں کرتے۔

دفتر کے کسی کام سے جینی بنکاک جانے لگی تو ولید سے نہائت گرمجوشی سے گلے ملی۔ "تین ہفتے یوں گذر جائیں گے۔ یہیں۔ ائرپورٹ پر مجھے ملنا"۔ کہتے ہوئے اُسکی آنکھوں میں آنسوؤں کی ہلکی سی نمی تھی۔ ای میل نے خط کی جگہ تو لینے کی کوشش کی ہے۔ لیکن خط کی بات کچھ خاص ہی ہے۔ ولید کے سامنے جینی کا خط تھا۔ جسے وہ چار مرتبہ پڑھ چکا تھا۔ اور ایک مرتبہ پھر پڑھنا چاہتا تھا۔

Dearest_

Beneath me is Thailand and the country is throwing up thermal blasts which are buffeting this strange cigar shaped object in which I am suspended with you- I hope you like being here-! We are about to land so forgive me for leaving

you to your own devices briefly.

There is a man who wrote strange notes on a small, efficient pad throughout his opulent three course lunch. I hope he was writing a love letter to someone. I hope he was sharing his meal and wine with someone who made his pulse quicken and a blush of desire paint his cheeks.........!

Waleed- why am I so happy and content? This is such a lovely feeling - - - you know what, I don't think you are perfect and I don't think you are the most god-like creature I have ever met, but I know I would like to wake up besides you every morning and face each day with you. I hardly slept at all last night, and I am glad, because every conscious thought was flooded with you. I know you might not be with me always. But miracles happen- don't they? Who knows? How consistent the world is! Pain, pain, pain and then joy so sweet that you have no choice but to wash it in your tows- I love you !

I don't know why, but at this point in time, 7:44 p.m, I am compelled to tell you that I love you. I have said it to you so many times before- but this is the first time I am jotting this down.

I love you!

I am sad that you don't realize how much I care about you- and I really believe that the one part of our love which I can't be party to has begun to blend you to all the rest that I am

holding on to. Such is life- Still I wish I could convince you that I love you deeply despite the constrictions that you have unilaterally placed on that love.

I know that cassette would be lying somewhere in your study- but take some time and listen to Sin ead O' Conner tape (which you would never do- I know)- but one day when you do, you will be able to understand what she is singing.

See you soon.

I do love you!

Jenney

امریکہ میں اتنی مدت رہنے کے بعد۔ فلموں میں محبت کے سین دیکھنے کے بعد۔ صبا سے محبت کے ادھورے تجربے سے گذرنے کے بعد۔ "I love you" کے تین الفاظ کا اثر اتنا شدید ہوگا۔ ولید کو اِسکا اندازہ نہ تھا۔ جینی نے یہ الفاظ کئی مرتبہ۔ کبھی مذاق میں۔ اور کبھی سنجیدگی سے۔ اُس سے کہے تھے۔ تو کیا لکھے ہوئے میں کوئی اور طرح کی طاقت ہوتی ہے۔ کوئی اور طلسم ہوتا ہے۔ کسی اور طرح کا اثر ہوتا ہے۔؟ کمپیوٹر کے بادشاہ کو اپنے گونگے ہونے کا احساس ہو رہا تھا۔ اُسے یوں لگا جیسے اِن الفاظ نے برگد کی شاخوں کا روپ دھار لیا ہے اور اِن شاخوں نے اُسکا سارا وجود جکڑ دیا ہے۔ کسی پرانی نسبت کی رگیں جاگتی آنکھوں میں ایک جھناکے سے نوٹیں۔ ذرا دیر کو کمرے کی ساری فضا کرچیوں سے بھر گئی۔ "میں نے صبا کے ساتھ زیادتی کی۔ مجھے اتنی لمبی مدت تک اُسے یوں لٹکا کے نہیں رکھنا چاہیئے تھا۔ لیکن اب کیا ہوسکتا ہے؟ اُس کی تو شادی ہو گئی۔'' ولید کو اپنا آپ بُرا لگا۔ اندر کی سچائی نے اُس کے دل و دماغ کو رگید کے رکھ دیا تھا۔ ولید کو پہلی بار احساس ہوا کہ کسی لڑکی کو "ہاں" اور "ناں" کے بیچ معلق رکھنا۔ کتنا گھناؤنا ہوتا ہے۔!

فون پر جینی کا بنکاک کے ہوٹل میں نمبر ملاتے ہوئے اُس کی انگلیاں کانپ رہی تھیں۔ جینی نے دو دن بعد آ جانا تھا۔ مگر اُسکی موجودہ حالت ایک لمحہ بھی مذید انتظار نہ کر سکتی تھی۔ اتفاق سے جینی اپنے کمرے میں ہی تھی۔ "what a pleasant surprise"۔ جینی کی آواز میں

CamScanner

بے حساب خوشی تھی۔

"جینی"۔ولید اپنی سانسیں درست کررہا تھا

"یس۔سب خیر تو ہے نا۔ولید۔آر یو او کے"۔جینی نے ولید کی آواز میں چھپی وہ عجب بے چینی شائد بھانپ لی تھی۔

"مجھ سے شادی کرلو جینی۔کروگی"۔ولید نے یہ الفاظ اتنی تیزی میں کہے کہ اُسے خود بھی حیرانی ہوئی۔

"تم سے نہیں کروں گی تو اور کس سے کروں گی؟ آئی لو یو ولید۔آئی لو یو" جینی کو یقین نہ آرہا تھا کہ وہ کیا سُن رہی ہے۔

"ہوں۔تم دو دن بعد آرہی ہو نا"۔

" کہو نا ولید۔کہو کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے"

"شادی بہت جلد ہونی چاہیئے۔لیکن نیو یارک میں نہیں۔تم آجاؤ تو بات کریں گے۔ ابھی کسی سے بات نہ کرنا۔کسی سے بھی نہیں"۔

"نہیں کروں گی۔کسی سے بھی نہیں۔میرے خدا۔مَیں کتنی خوش ہوں۔تم۔یہاں ہوتے تو مَیں۔تو مَیں۔!"

"اپنا خیال رکھنا جینی" ولید نے کہا اور جینی کا آئی لو یو پورا سنے بغیر فون رکھ دیا۔اُس کے ہاتھ ابھی تک کانپ رہے تھے۔دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔لیکن کہیں اندر اُسے کچھ اطمینان سا محسوس ہو رہا تھا ایسے جیسے اُس نے اپنے دل کا کوئی بوجھ اتار کے پھینک دیا۔ایسے جیسے کسی کا دیرینہ قرضہ اتار دیا۔ایسے جیسے اپنے کسی ناپسندیدہ رویے پر قابو پالیا ہو۔یا پھر بھری دلدل میں پاؤں اچانک کسی کنکریٹ کے ٹکڑے سے ٹکرایا ہو اور امید بندھ جائے کہ شائد اِس دلدل سے اب نکلنا۔اتنا مشکل بھی نہیں ہے۔!

ꙮꙮꙮ

◎

25 جون 2001۔ساڑھے گیارہ بجے صبح۔ نیویارک سے جہاز واشنگٹن ڈی سی کی طرف رواں دواں تھا۔ ولید واشنگٹن پوسٹ میں چھپا ایک دلچسپ آرٹیکل "How to derail Free Trade" پڑھ رہا تھا۔ "The U.S. Senate, that grandest of debating chambers, last week held hearings on how to promote trade. Don't yawn: this matters" عین اُس وقت ولید کو ایک جمائی آئی۔ چائے یا کافی پینے کے لئے اُس نے سر اونچا کر کے کسی ائر ہوسٹس کو تلاش کیا اور ناکامی کی صورت میں اُسے بلانے والا بٹن دبا دیا۔

"The truth is that Trade Promotion Authority would greatly improve the chances of serious new trade deals; and the only break through achieved without it proves why". "Can I get you something"? ۔یہ آواز بٹن والی ائر ہوسٹس کی تھی۔

"Yes please-tea or coffee- whichever is strong" ولید نے کہا اور اخبار تہہ کر کے اپنے سامنے والی سیٹ کی پاکٹ میں اڑس دیا۔کافی ختم کرنے کے بعد اُس نے اپنی سیٹ سے اٹھ کے۔اوپر والے خانے میں سے اپنا بریف کیس نکالا اور ایک موٹی سی فائیل پڑھنے لگا۔

"میٹنگ میں بڑے بڑے لوگ ہوں گے۔ بڑے حساس موضوع پر گفتگو ہوگی۔تم نے اُس وقت تک نہیں بولنا جب تک تمہیں مخاطب کر کے کچھ پوچھا نہ جائے۔ کمپنی کو تمہاری اس میٹنگ میں مفید باتیں کر کے واپس آنے سے فائدہ ہوگا۔ اور ہاں۔ کسی بھی شخص سے وہاں visiting cards exchange نہیں کرنا۔ کوئی بھی تمہاری qualification میں دلچسپی

نہیں رکھتا ہوگا۔تم بس کسی سوال کا۔ جو تم سے پوچھا جائے۔ مناسب مگر مختصر جواب دے کر خاموش ہو جانا"۔ ولید کو ڈیوڈ کی ائیرپورٹ پر جہاز اترنے سے ذرا پہلے دی گئی ساری ہدایات یاد تھیں۔

" تھوڑی دیر میں ہم اتر جائیں گے۔ یہاں کا درجہ حرارت..... "اناؤنسمنٹ ہو رہی تھی اور ولید سوچ رہا تھا۔ سوالات کی نوعیت کیا ہوگی۔؟ کتنا اچھا ہو۔ میری باری ہی نہ آئے۔ کسی کو ریاضی اور کمپیوٹر کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔ وہ کچھ حیران بھی تھا۔ ایک ایسی میٹنگ میں شرکت کرنے کے لئے اُسے جانا تھا جس کے ایجنڈے۔ شرکاء کے نام۔ حتیٰ کہ میٹنگ کس جگہ ہونی ہے۔ اُسے کچھ پتہ نہ تھا۔ ولید کو کہا گیا تھا کہ اُسے آؤٹ گیٹ سے " کوئی" پک کر کے میٹنگ کے لئے لے جائیگا۔ بچپن میں پڑھے ہوئے جاسوسی ناول ولید کو یاد آرہے تھے۔ انہونے واقعات۔ اور آج ایک ملتی جلتی کیفیت میں اپنے آپ کو دیکھ کر اُس کے لبوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔

"To be or not to be- that is the question" ولید نے دل ہی دل میں کہا اور جہاز کے دروازے سے باہر نکلنے والے مسافروں کی لائین میں اپنا بریف کیس تھامے ہلکے قدموں سے چلنے لگا۔

چھ گھنٹوں کی اُس میٹنگ میں دو وقفے ہوئے۔ یہی وہ وقفے تھے جو ولید کو سگریٹ پینے اور بوریت سے نکلنے میں مددگار ثابت ہوئے۔ بڑی بڑی پاور پوائنٹ presentations۔ بڑی بڑی عمارتوں کے نقشے۔ اندرونی کیمرے۔ بیرونی کیمرے۔ دنیا جہان کی سیکورٹی فورسز کے قصے۔ تجارت میں اتار چڑھاؤ۔ گاڑیوں کی قیمتیں۔ اگر کوئی حادثہ ہو تو کرائسس مینجمنٹ کیسے کی جائے۔ ولید تھک سا گیا تھا۔ کوئی سر پیر۔ کوئی سرا اُسے نہ ملا۔ آخر یہ کس نتیجے پر پہنچنے کے لئے میٹنگ بلائی گئی ہے۔ اور اِس میں اتنی "پراسراریت" کیوں ڈالی گئی۔ ایسی کونسی بات ہے حساس اور سیکرٹ۔! سب سے زیادہ حیرانی اُسے اُس سوال پر ہوئی جو ایک شریکِ گفتگو صاحب نے کسی native لہجے میں کیا" کنکریٹ والی عمارتوں میں بہت بڑے بڑے سوراخ ہو جائیں تو ہوا کے دباؤ سے اندر رکھی ہوئی چیزیں کس زاویے سے باہر اڑیں گی"۔ بھلا یہ کوئی سوال تھا۔ ولید کو اِس سوال کے جواب میں ریاضی کی مدد لینے کی ضرورت تھی نہ کسی کمپیوٹر کی۔ اُس کے ذہن میں جو پہلے آ گیا وہ اُس نے ہدایات کے عین مطابق " مختصراً" بتا دیا۔ جس وقت وسط ایشیا کے کسی ملک میں

تیل اور گیس کے ذخائر پر بات ختم ہونے کے بعد انشورنس کمپنیوں اور جہازوں کے کرایوں پر بات شروع ہوئی تو ولید کے ساتھ بہت سے اور لوگوں کو باہر جانے کا کہا گیا۔ میٹنگ میں اب صرف پانچ اشخاص رہ گئے تھے۔ چار کے لب و لہجے سے عیاں تھا کہ انگریزی اُن کی مادری زبان نہیں ہے۔ پانچواں اپنے انداز اور لب ولہجہ سے۔ ولید کو ماہر انگریزی ماہر علم نجوم ماہر فلکیات ماہر حساب کتاب اور نجانے کیا کیا لگا۔ کمرے سے باہر جاتے ہوئے ولید کے کانوں نے کچھ بے ربط سے فقرے سنے۔ ''دن مقرر کرنا باقی ہے۔ تین مہینے۔ مذہبی تہوار...اُڑانیں۔'' اور کچھ اس طرح کے ملتے جلتے الفاظ!

واشنگٹن کے ساتھ Dulles ائر پورٹ سے نیو یارک کا جہاز پکڑنے اور اُسی ہوا میں تیرنے کے تجربے تک۔ ولید کو محسوس ہوا جیسے دنیا بھر میں "اہم میٹنگز" ساری کی ساری۔ شائد ایسی ہی ہوتی ہوں گی۔ بے مقصد۔ بے سمت۔ اور شرکاء گفتگو اس یقین سے گفتگو کرتے ہوئے۔ جیسے اُن کے بولنے یا خاموش رہنے سے دنیا بھر کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ جیسے وہ آج نہ بولے تو اُن کی نوکری۔ اُن کی پوزیشن۔ سب خطرے میں پڑ جائیں گی۔ جیسے اپنے آپ کو یقین دلاتا ہو کہ ہم بھی کتنی بے وقوفی سے بلا تکان۔ چھ گھنٹے۔ بول اور سُن سکتے ہیں۔

"پورے چھ گھنٹے"۔ ولید نے اپنے تھکے ہوئے سر کو جہاز کی سیٹ سے لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن اُس کا دماغ جاگ رہا تھا۔ ''تین مہینے'' ''دن مقرر کرنا باقی ہے۔'' اور اُس کے تھکے ہوئے وجود سے اُس ساری میٹنگ کے تانے بانے نہیں مل رہے تھے۔ ایک اندیشہ بہر حال کہیں سے در آیا تھا۔ ''مفروضے اور حقیقت میں فاصلہ نہ رہا تو ''واقعہ'' ایک'' حادثہ'' بن کر سامنے آ سکتا ہے۔''

☆☆☆

◎

انسانی دماغ پوری طرح سے ابھی سمجھ میں نہیں آیا۔ پلک جھپکتے ۔ایک لمحے میں اسکی پرواز لاکھوں میل کا سفر طے کر لیتی ہے۔ ماضی کے جھروکے لمحہ بھر میں ایک ایک کر کے وا ہو جاتے ہیں اور فضا میں یادوں کی ہزاروں تتلیاں گردش کرنے لگتی ہیں۔ کمپیوٹر سائنٹسٹس نے ایسا کوئی ماؤس ایجاد نہیں کیا جس کے right کلک کرنے سے ماضی کی کوئی یاد delete کی جا سکے۔ ایسا ہو جائے تو شائد ہم اپنی مرضی کی یادیں ہی اپنے پاس رکھیں۔ ناپسندیدہ سوچوں اور یادوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے آپ سے دور کر دیں۔ دماغ کے صحن میں ہمیشہ رنگ برنگے گلاب ہی کھلے رہیں۔ لیکن۔ایسے میں دماغ۔ جو پورا سمجھ میں نہیں آیا۔ اگر کوئی سوال کر بیٹھے۔؟ کوئی ایسا سوال جس کا تعلق کسی deleted یاد سے ہو۔ تو پھر۔؟ تو کیا ہم deleted یادوں سے واپس رشتہ جوڑنے کی صلاحیت حاصل کر سکیں گے؟"۔ ولید تھوڑی دیر کے لئے رُکا اور اپنے سامنے بیٹھے عارف کو حیرانی سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے زیرلب مُسکرایا۔

"بور ہو رہے ہو"۔ ولید نے چائے کا مگ میز سے اٹھا کر پوچھا" تمہاری باتیں کبھی بھی بور نہیں ہونے دیتیں۔ مجھے تو غالبؔ یاد آرہا ہے۔

رگ و پے میں جب اترے زہرِ غم، تب دیکھئے کیا ہو
ابھی تو تلخیٔ کام و دہن کی آزمائش ہے

تلخیٔ کام و دہن۔! یار یہ غالبؔ بھی قیامت شاعر تھا۔ والد صاحب کو غالبؔ کے اردو اور فارسی۔ دونوں کے بے شمار شعر حفظ تھے۔ لیکن تمہیں کیوں غالبؔ یاد آرہا ہے"۔ ولید نے چائے ختم کرتے ہوئے پوچھا" یہی کہ جس طرح انگریز غزل کو سمجھے بغیر ہی فوت ہو جائے گا۔ ہم سب بھی دماغ کے بارے میں پورا جانے بغیر چل بسیں گے۔ اور ذرا طرفہ تماشا ملاحظہ ہو۔ کہ ہر کوئی یہ سمجھ رہا ہے کہ جو اُسکی عقل میں آیا وہی "اصل" اور وہی "سچ" ہے۔ دوسرا اپنی دلیلیں لئے۔

CS CamScanner

یہاں سے آگے
بالکل ایسا ہی سوچتا ہے۔ حقیقتاً کیا سچ ہے اسکا شائد کبھی بھی علم نہ ہو سکے۔ لیکن۔ جب سے نیناں زندگی سے نکلی ہے۔ میں کچھ پر سکون ضرور ہوا ہوں۔ معلوم نہیں تمہاری ریاضی اس موضوع پر کیا کہتی ہے؟" عارف نے "پر سکون" لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا "lesser evil والی بات لگتی ہے۔ ساتھی پاس تھا۔ تو evil اور دور ہوا تو lesser evil۔ کیوں؟" ولید کو نیناں سے کی ہوئی بے شمار باتیں یاد آگئیں۔

گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اُسے غارت کرتا

وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر۔ سو ہے

"تم ابھی تک غالبؔ سے نکلے نہیں؟ ویسے ایک بات بتاؤ۔ نیناں نے کہا تھا تم اُسے مارتے تھے۔ ذلیل کرتے تھے۔ میں نے کبھی پہلے یہ بات تم سے نہیں کی۔ لیکن اب تو معاملات طے پا چکے ہیں۔ اس لئے....."

"درست۔ مارتا بھی تھا اور ذلیل بھی کرتا تھا۔ سچ ہے"

"تم تو اتنے پر اعتماد طریقے سے بتا رہے ہو جیسے مارنا اور ذلیل کرنا کوئی فخر کی بات ہے۔ عورت پر ہاتھ اٹھانا....."

"تمہارا کسی ایسی عورت سے واسطہ پڑے گا تو خود ہی سمجھ جاؤ گے۔ ابھی تو عورت کے concepts کو صرف philosophise کرتے ہو۔ جب ایک عورت تمہارے ساتھ دن رات رہے گی۔ تمہاری بیوی ہوگی۔ اور طرح طرح سے تمہیں تنگ کر کے اپنی باتیں منوائے گی۔ دوسروں کو اپنے چہرے کے صرف زخم دکھائے گی۔ یہ نہیں بتائے گی کہ کتنی دلیلوں۔ کتنی منتوں۔ کتنے کٹھن مراحل سے گذر کے۔ کتنے مواقع دے کر۔ کتنی مرتبہ معاف کر کے۔ اُسکے میاں نے آخر تنگ آکر ہاتھ اُٹھایا۔ تم نے بات چھیڑ ہی دی ہے تو اب سُن لو۔ فیصلہ خود کرنا"۔ عارف کو معلوم تھا کہ اگلے کچھ گھنٹوں تک ولید بالکل فارغ ہے۔ اُسے بات پوری کرنے کا وقت مل سکتا تھا۔ اُسے حیرانی بھی ہو رہی تھی کہ ولید نے یہ بات پہلے اُس سے کیوں نہ کی۔ پھر اُسے یہ خیال بھی آیا کہ نیناں نے تو زہر بھری اور باتیں بھی ولید سے کی ہونگی۔ اُسے محسوس ہوا کہ دوست کا دل اس معاملے میں ذرا میلا ہے۔ وضاحت کرنی پڑے گی۔

"یہی کہ وہ بات نہ مانتی تھی اور تنگ آکر تمہیں ہاتھ اٹھانا پڑا" ولید بھی کچھ معلومات کرنا

CamScanner

چاہتا تھا" دو تین سین دیکھتے ہیں ۔ تمہاری بیوی تمہارے ماں باپ کی عزت نہیں کرتی ۔ اس لئے بھی کہ تم اپنی ماں کو درجۂ اول میں رکھتے ہو ۔ دوسری طرف ۔ وہ اپنے گھر والوں کی کوئی بات تمہیں نہیں بتاتی ۔ اور اپنی سہیلیوں اور دوستوں سے تمہاری برائی کرتی ہے ۔ سامنے کچھ ۔ پیچھے کچھ ۔ تم اُسے سمجھاتے ہو ۔ جھوٹ نہ بولو ۔ اِس سے رشتہ کمزور پڑ جاتا ہے اور پھر ٹوٹ بھی جاتا ہے ۔ وہ وعدہ کرتی ہے ۔ کہ کبھی جھوٹ نہ بولے گی ۔ تمہیں بیٹی کا خیال کرنے کا کہہ کر دفتر کسی مسٹر ایکس وائے زیڈ کے ساتھ میٹنگ کرنے جاتی ہے ۔ تین گھنٹے کے بعد اُس ایکس وائے زیڈ کا تمہیں فون آتا ہے کہ اُسے کہیں اور جانا پڑ گیا ۔ لہٰذا اپنی بیگم سے کہہ دو کہ آج کی میٹنگ نہ ہو سکنے پر معافی ۔! پانچ گھنٹوں کے بعد تمہاری بیوی گھر آئے ۔ اور " میٹنگ سے تھک گئی ہوں ۔ ذرا چائے پلواؤ" کہے تو تم کیا کرو گے ۔ تمہارے پوچھنے پر کہ ایکس وائی زیڈ کے ساتھ میٹنگ کیسی رہی ۔ وہ تمہیں جھوٹ پر جھوٹ بولے ۔ حتیٰ کہ تمہارے پوچھنے پر وہ یہ بھی بتائے کہ ایکس وائی زیڈ نے کونسے کپڑے پہنے تھے ۔ اور تمہیں جھوٹ کے مکمل ہونے کا یقین ہو جائے تو تم کیا کرو گے ۔ آج ہی تو اِس نے سچ بولنے کا وعدہ کیا تھا ۔ اور یہی وعدہ کر کے وہ میٹنگ کے لئے گئی تھی ۔ اور اتنی " تھکی ہوئی " کہاں سے واپس آئی ہے اور پھر بڑے صاحب ۔ اگر اِس طرح کے چھوٹے بڑے واقعات روزانہ پیش آئیں تو تم کیا کرو گے ۔؟"

" لیکن وہ پانچ گھنٹے رہی کہاں ۔ تم نے سچ جاننے کی کوشش نہ کی " ۔

" سچ بھی عجیب ہے ۔ خود سامنے آجاتا ہے ۔ کوئی ولید ۔ مقصود ۔ سلیم ۔ ندیم ۔ کچھ دنوں بعد تمہیں بتاتا ہے کہ اُس دن نیناں ۔ مسٹر اے بی سی کے ساتھ تھیٹر سے نکل کر اُس کی گاڑی میں بیٹھ کر جاتے ہوئے اُس نے دیکھا..... اور پھر تم اپنی بیوی سے تمام اعداد و شمار کے ساتھ بات کر کے پوچھو کہ جھوٹ کیوں بولا ۔ اور وہ تم سے کہے کہ تم اُسکی نوکری سے jealous ہو ۔ خود نوکری نہیں کرتے ۔ بیوی کے ٹکڑوں پر پل رہے ہو تو تم کیا کرو گے ۔ یہ پہلا دن تھا جب مَیں نے ۔ معلوم نہیں کیسے اور کیوں ۔ نیناں پر ہاتھ اٹھایا ۔ میرا دماغ گھوم گیا تھا ۔ اور پھر نیناں کی " تھکی ہوئی " گھر واپسی کو تم کیا نام دو گے؟

" نیناں ایسی لگتی تو نہیں ۔ وہ تو..... "

" یہی تو ۔ عورت کا ایک روپ وہ جو ابھی تمہیں دکھایا ۔ دوسرا وہ جو وہ تمہارے

جیسے "ہمدرد کانوں والے" لوگوں کو دکھاتی ہے۔ تیسرا وہ جو وہ بچوں کے سامنے نہائت صفائی سے اُن کے باپ کی کوئی برائی کرتی ہے۔ چوتھا وہ جو وہ اپنے ماں باپ کے پاس جا کر روتے دھوتے اور اپنے دکھڑے سناتے ہوئے دکھاتی ہے۔ پانچواں وہ....."

"بس کرو۔ اتنا کافی ہے۔ تو پتہ یہ چلا کہ جھوٹ کی وجہ سے یہ رشتہ نہ نبھ سکا۔ کوئی اور وجہ بھی تھی"۔

"ویسے تو یہ ایک وجہ ہی کافی ہے۔ نیناں جیسی کسی بھی لڑکی کو دس بارہ طلاقیں دینے اور سو بار پینے کی۔ لیکن اپنے ماں باپ کی عزت۔ معاشرہ۔ اور دوسری کئی باتوں کے ساتھ ساتھ "بچہ" تمہیں کوئی فیصلہ کرنے سے روکتا ہے۔ بچہ ہماری بہت بڑی کمزوری ہے۔ کئی لحاظ سے۔ اور نیناں جیسی عورتیں اِس ٹرپ کے پتے کو استعمال کرنا خوب جانتی ہیں"۔

"اور وہ جو چیچوں پر نشان لگانے والی بات۔ اور وہ بچی کو کبھی گود میں نہ اٹھانے والا قصہ۔ وہ سب کیا تھا"۔ ولید کو نیناں کا یہ رُخ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ مکمل تسلی کرنا چاہتا تھا۔

"اُس نے تھرمامیٹر والی بات بھی بتائی ہوگی۔ اُسکی کہانی میں لگے بندھے چند ہی موڑ تھے۔ جو وہ ہر ایک کو سُنا کر ہمدردی بٹور لیتی تھی۔ کی تھی نا۔ اُس نے۔ تھرمامیٹر والی بات"" ہاں"

"دیکھا۔ تو اِس کے بارے بھی سُن لو۔ سب پاکستانی مردوں کی طرح مرا دل بھی چاہتا تھا کہ چائے بیوی بنائے۔ کھانے کا خیال کرے۔ جب کئی مرتبہ کہنے پر۔ میری پسند کی چائے۔ اُس سے نہ بنی تو مجھ سے ایک غلطی ہوگئی۔ مَیں نے کتاب سے ایک اقتباس سنا دیا کہ چائے میں پتی کس وقت ڈالی جاتی ہے۔ رنگ نکلنے تک کتنی دیر انتظار کرنا چاہیئے۔ چینک میں ایک چمچہ چینی کا ڈال کر اچھی طرح ہلا لینا چاہیئے۔ اور چائے کا کتنا درجۂ حرارت ہوتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اگلے دن وہ بازار سے دس تھرمامیٹر لے آئی۔ اور پھر مہینوں مَیں نے اپنے آپ کو کڑھتے دیکھا۔ جب وہ چائے بناتی اور میرے سامنے تھرمامیٹر ڈال کر درجہ حرارت ماپتی۔ مجھے بتاتی اور ایک زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ۔ کمرے کے باہر نکل جاتی۔

وہ سارے تھرمامیٹر نیناں نے خود خریدے تھے۔! اور وہ بچی کو نہ اٹھانے والی بات۔! مَیں ہمیشہ کہتا کہ صبح اٹھو۔ اور خاص طور پر چھٹی کے دن تو پہلے بچی کو دودھ وغیرہ دیا کرو۔ لیکن وہ ہر مرتبہ اپنے لئے چائے پہلے بناتی۔ ناشتہ کرتی۔ پھر اِدھر اُدھر بھٹکتی بچی اور میری باری آتی۔ جس دن

Mir Zaheer Abass Rustmani

CamScanner

میرا کوئی جاننے والا آتا ہوتا گھر میں۔ تو ڈھونڈ کر ایسے کپڑے پہنتی جو کہیں سے پھٹے ہوئے یا بہت پرانے ہوتے۔ اور پھر بچی کو ہمیشہ اٹھائے اٹھائے پھرتی۔ وہ یہ بھول جاتی کہ مہمان پر کیا اثر پڑے گا۔ وہ کیا سوچے گا۔ اور دوستِ من۔ ہمیشہ جیت اُسی کی ہوئی۔ جب بھی وہ کسی سے کہتی کہ عارف تو بچی کو کبھی گود میں نہیں اٹھاتا۔ میرا خیال نہیں کرتا۔ تو سب یقین کر لیتے۔ وہ سارے لوگ جو ان باتوں کو سچ سمجھتے وہ اُس وقت کہاں ہوتے جب۔ گھنٹوں۔ پہروں۔ میری بچی میری گود میں۔ میرے کاندھوں پر۔ میرے ساتھ کھیلتی۔ ! عورت کو دلیل سے مرد پچھاڑ سکتا ہے۔ لیکن اُسکے پاس جو غیر مرئی ہتھیار ہیں۔ اُن کا توڑ مرد کے پاس نہیں ہے۔ ایک مرتبہ۔ بچی نے زمین پر گرا نیناں کا بُندہ منہ میں ڈال لیا۔ حلق میں پھنس گیا۔ بچی خوب تڑپی۔ ڈاکٹر آیا۔ بُندہ بڑی مشکل سے نکالا گیا۔ حالت سنبھلنے کے بعد مَیں نے صرف اتنا کہا کہ بچی سے اپنے بُندے ذرا دور رکھو۔ اور پھر ولید۔ اُس نے وطیرہ ہی بنالیا۔ جب بھی گھر ہوتی۔ کار میں بیٹھتی۔ اپنا بندہ اتار کر بچی کے ہاتھ میں پکڑا دیتی۔ اور ایسے میں تم کیا کرلو گے اپنی بیوی کا! تمہارے پاس کوئی دلیل بچتی ہے؟ کوئی راستہ ہے؟ اور پھر ایک وقت آیا کہ جب بھی اُس نے کوئی ایسی بات کی۔ میری زبان کی بجائے۔ میرا ہاتھ چلا۔ اور اُسے دنیا بھر کو یہ یقین دلانے میں آسانی ہوئی۔ کہ اُس کا میاں اُسے زدوکوب کرتا ہے۔ ہاں ولید۔ مَیں نے مارا۔ کئی مرتبہ مارا۔ اور خدا کی قسم۔ مَیں شرمندہ نہیں ہوں۔ ایسی عورت کو تو جان سے مار دینا چاہیئے"۔ عارف کو اب غصہ آ چکا تھا۔!

"وہ کیا کہا تمہارے غالب نے۔ رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پتہ نہیں کب تھمتا۔ سناؤ ذرا"۔ ولید شائد بات بدلنا چاہتا تھا" جسے غم سمجھ رہے ہو۔ ہاں۔ رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا۔ جسے غم سمجھ رہے ہو۔ یہ اگر شرار ہوتا۔ مجھے لگتا ہے تم اب بور ہو رہے ہو۔ لیکن یار۔ وہ کسی بڑے آدمی کا قول ہے کہ عورت ایک فتنہ ہے۔ لیکن اس سے بھی بڑا فتنہ یہ ہے کہ اسکے بغیر گذارا نہیں۔ چلو کھانا کھاتے ہیں۔ مجھے تو اچانک بھوک لگ گئی ہے"

"ہاں۔ یہ ٹھیک ہے۔ یاد آیا۔ آج 10 تاریخ ہے نا"۔ ولید نے دل ہی دل میں" گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے" کا مصرعہ اولی ڈھونڈنے کی ناکام کوشش کی۔

"جی ہاں۔ 10 ستمبر۔ کوئی خاص بات۔؟" کچن کی طرف جاتے ہوئے عارف نے غیر ارادی طور پر تاریخ بتائی اور دونوں دوستوں نے کھانے کے بعد کرائے پر لائی گئی فلم" The

"Dead Poets Society" لگائی۔ یہ دونوں دوستوں کی مشترکہ فیورٹ مووی تھی۔ اور اِس مرتبہ فیصلہ یہ ہوا کہ یہ فلم خرید ہی لی جائے تو اچھا ہے۔ ہر مرتبہ اِس فلم میں کوئی نہ کوئی بات۔ کسی نئے خیال کو جنم دیتی۔ دو سوچنے والے دماغ۔ اِس بات سے اب لاتعلق ہو چکے تھے کہ انسانی دماغ پوری طرح انسان کو ابھی سمجھ نہیں آ سکا۔

ಌಌಌ

◎
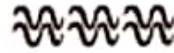
دنیا بھر کے اخباروں ۔ ٹیلی ویژن ۔ اور ریڈیو پر اگلے دن کا بڑا احسان تھا۔ ایسی خبریں روز روز جنم نہیں لیتیں۔ گھر۔ شہر۔ ملک۔ اور پھر اُس دلدوز خبر نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ولید کے دماغ میں بھی کئی تصورات ایک ساتھ۔ لفظوں کا روپ دھارتے۔ گہرے اور مدھم ہوتے۔ اور پھر صرف ایک گونج باقی رہ جاتی۔ ۱۱ ستمبر۔ ورلڈ سینٹر۔ جہاز۔ بلا کتیں۔ ہیلی کاپٹرز۔ لوگ۔ بچے۔ کھلبلی۔ ٹی وی کیمرے۔ اخبار نویس۔ رپورٹرز۔ باکس کٹر چاقو۔ سان فرانسسکو۔ Dulles ائر پورٹ۔ پینٹا گون۔ یونائیٹڈ ائر لائین فلائٹ نمبر 175۔ سینکڑوں لوگ۔ دھواں۔ دھماکے۔ Rescue کرنے والے۔ Rescue ہونے والے۔ دہشت گردی۔ سپر پاور۔ زیر اثر پاورز۔ 110 فلورز۔ کچھ ہی دیر میں فلک بوس۔ کچھ ہی دیر میں زمیں بوس۔ بون اور ٹشو کمپلو۔ ہیٹ کرائمز۔ سازش۔ ملی بھگت۔ ہائی جیکرز۔ کروڑوں اربوں کا نقصان۔ انشورنس کمپنیاں۔ جہاز کمپنیوں کا مستقبل۔ دنیا کا کاروبار۔ سیاسی اور معاشی تجزیئے۔! ولید اتنی شدت سے پہلے۔ صرف ایک بار۔ پورے وجود کے ساتھ۔ کانپا تھا۔ ماں کی سفید لٹھے میں لپٹی مورتی بابل شہید کے قبرستان میں نئی کھدی قبر میں آہستگی سے اتارتے ہوئے۔! اُسے یوں لگا جیسے دنیا بھر کی کسی نے کوئی خوبصورت مورتی بنائی ہو۔ اور پھر سفید لٹھے میں لپٹا کر ۱۱ ستمبر کے مدفن میں بڑی بے دردی سے پھینک دی ہو۔! امریکہ۔ دی لینڈ آف اپر چیونٹی۔ اُسکے خوابوں کو پایۂ تکمیل پہنچانے والی زمین۔ آج بابل شہید قبرستان سے بھی زیادہ ویران نظر آ رہی تھی۔ پچھلے کئی گھنٹوں سے اُسکے دونوں فون۔ اپنی گھنٹیوں میں پورے گھر کو لپیٹے ہوئے تھے۔ اور پچھلے کئی گھنٹوں سے اُس نے ایک مرتبہ بھی فون اٹھانے کی زحمت نہ کی تھی۔ عارف کئی مرتبہ کوشش کر چکا تھا۔ "فون اٹھالوں"۔ "ہوسکتا ہے کوئی ضروری کال ہو"۔ "ہوا کیا آخر۔ لگتا ہے نون ناورز نہیں گرے۔ تمہارا کوئی قریبی رشتہ دار انتقال کر گیا ہے"۔ لیکن ہر مرتبہ ولید کی وہی۔ لمبی خاموشی۔! جہازوں کے بارے علم نے اور کچھ عرصے

پہلے کی اُس "پراسرار" چھ گھنٹوں کی میٹنگ اور اُس سوال نے۔ ولید کو جکڑ رکھا تھا۔ اُسکا ریاضی کا علم الگ کچو کے لگا رہا تھا۔ "علموں بس کریں او یار"۔ عارف نے اونچی آواز میں کہا اور پتہ نہیں کیوں۔ اِس مصرعے میں کیا طاقت تھی۔ ولید کو احساس ہوا کہ وہ اپنے گھر میں ہے اور رات کافی بیت چکی ہے۔ اُسے اچانک زوروں کی بھوک بھی لگی۔ "عارف۔ کھانے کو کچھ ہے۔ کہہ کر اُس نے باتھ روم کا رُخ کیا۔ نیم گرم پانی سے شاور لیتے ہوئے ولید کے دماغ میں اب مختلف طرح کے سوال اور ایک پرانی۔ مانوس گونج تھی۔

"گمان نہیں کرتے۔ بعضے گمان گناہ ہوتے ہیں"۔ "دوسروں کے لئے جئو"۔ "جھوٹ گناہِ کبیرہ ہے"۔ "نیکی قوت ہے"۔

"تتلی کو خبر ہو جاتی ہے کہ موت قریب آ گئی۔ وہ اُس طرف واپس اڑتی ہے۔ جہاں اُس نے جنم لیا تھا"۔

"اور تم اللہ کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے"۔ "جہاز پر بیٹھنا نہیں۔ جہاز خریدنے ہیں"۔ "جانور ذبح کرنے سے پہلے اُسکو پیٹ بھر کے کھانا اور خوب پانی پلانا چاہیئے۔ بے زبان جو ہوا"۔

"میز پر آجاؤ۔ کھانا گرم کر دیا ہے"۔ عارف کی آواز نے ایک مرتبہ پھر اُسے احساس دلایا کہ وہ ابھی زندہ ہے۔

"اب ہوگا کیا۔؟ مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آ رہا"۔ عارف نے چاول کی ڈش ولید کر طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا

"تمہارے سینما کا تو خوب بزنس ہوگا"۔ ولید نے بے خیالی میں جواب دیا۔

"مَیں سینما کی نہیں۔ امریکہ۔ پاکستان۔ تمہارے بارے۔ اپنے بارے۔ اور دنیا کے بارے پوچھ رہا ہوں"۔ عارف کو ولید کا جواب نہائت بے تکا لگا۔

"فی الحال تو کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ تفصیلات سامنے آئیں گی۔ تو کچھ کہنے سننے کی پوزیشن بنے گی"

"یہ تو خاصا سرکاری نوعیت کا جواب ہُوا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ جہنم کا کوئی دروازہ جان بوجھ کے کھول دیا گیا ہے۔ اب یہ آگ بہت پھیلے گی۔ تباہی دیکھ رہا ہوں۔ اور پھر دھوئیں میں رہیں

گے تو خواب کالے پڑ جائیں گے"۔ عارف نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا" شاعری اور زندگی میں بہت فرق ہے۔ پانی ڈالنا ذرا۔ یہ جگ تم نے اپنے پاس کیوں رکھا ہوا ہے"۔ ولید اس موضوع پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔

" مجھے کیوں ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے تم کچھ جانتے ہو اور مجھے بتا نہیں رہے۔ میں تمہیں بچپن سے جانتا ہوں۔ اتنے گریس مارکس تو مجھے دو"۔ عارف نے ڈائننگ ٹیبل کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر بیٹھے بیٹھے اپنی کرسی نزدیک کرتے ہوئے کہا" غیب کا علم تو صرف اللہ کے پاس ہے۔ وہ تمام facts جو مجھے پتہ ہیں۔ تمہارے بھی سامنے ہیں۔ اور میں کونسا ولی ہوں کہ اچانک معاملات کی تہہ میں پہنچ کر۔ حقیقت آشکار کر دوں گا"۔ ولید نے کھانا ختم کرتے ہوئے یا شائد بات ختم کرتے ہوئے بے زاری سے جواب دیا" بڑے آدمی۔ بڑی باتیں۔ ! چلو بھئی۔ نہیں بات کرتے۔ تمہارے زرّیں خیالات کو کچھ وقت لگے گا زمینی شکل اختیار کرنے میں۔ بہر حال۔ مجھے ضرور بتانا۔ اپنے ساتھ۔ مجھے تمہاری بھی فکر ہے۔ مسلمان اور پھر دو پاکستانی۔ یہ تو سیدھا سیدھا نسخہء کیمیا ہے پریشان ہونے کا۔ اور میں نے تو ابھی تقابل کرنے کیلیئے۔ ایک اور شادی بھی کرنی ہے۔ ساڈا کیہہ بنوں گا سوہنیا"۔

" کس چیز کا تقابل۔؟ اور پھر دوسری شادی ناکام ہوئی تو تیسری کرو گے۔ تقابل کے لئے۔ اور پھر " تقابل" ایک دن" مقابلہ" بن جائے گا۔ پھر کیا مقابلوں کا تقابل کرو گے"۔

" جناب میں اچانک شوپن ہائیر کی روح کہیں سے حلول کرتی نظر آئی۔ بڑے دنوں کے بعد۔ پاکستان والا ولید بولا۔ یار۔ تم اِس طرح کی باتیں کہاں سے ڈھونڈتے ہو۔ شاعر میں ہوں۔ شاعری تم کرتے ہو"۔

" تمہارا وہم ہے۔ اور وہم کا علاج میرے پاس نہیں۔ مجھے شاعری اچھی نہیں لگتی۔ میں انسانوں میں۔ زمین پر پاؤں جمائے۔ آسمانوں کا خواب دیکھتا ہوں۔ شاعری زمین اور آسمان کے بیچ پھیلی کوئی ادھوری فضا ہے۔ ادھورا پن مجھے اچھا نہیں لگتا۔ خیال ہو کہ خواب۔ پورا ہونا چاہیئے یا پھر عمر گذر جائے۔ اُسی خیال اور خواب کو پورا کرتے۔ صرف خواب دیکھنا۔ اور وہ بھی exaggerated یہ شاعری تم ہی کرو۔ مجھے تو نیند آرہی ہے"۔ ولید نے اچانک گفتگو کو ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔

عارف بھی دن بھر کی خوفناک خبروں اور ولید کی لمبی خاموشی کے بعد اُسکے کچھ نہ بتانے والے روّیے سے تھک چکا تھا۔ اُس نے بھی گفتگو کو مزید بڑھانے کی بجائے ایک مرتبہ پھر غالبؔ کا سہارا لیا۔

گو نہ سمجھوں اُس کی باتیں گو نہ پاؤں اُس کا بھید
پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھلا

بستر پر لیٹنے اور بتی بجھانے سے پہلے عارف کسی عجیب الجھن کا شکار تھا۔ وہ ولید کو بچپن سے جانتا تھا۔ ولید کا پورے دن خاموش رہنا۔ ٹیلی فون کی گھنٹیوں کا بجنا۔ ولید کا فون اٹھانے سے انکار کر دینا۔ پھر آج کے اتنے اہم واقعہ پر ایک بھی تبصرہ ندارد۔ ولید تو اڑتی چڑیا کے پر گن کر۔ دو سے ضرب دے کر۔ پانچ سے تقسیم کر کے۔ چار مرتبہ جزر نکال کر سامنے رکھ دیتا تھا۔ اتنی لمبی خاموشی۔ عارف کی الجھن بڑھتی جا رہی تھی۔ اتنا اصرار کیا۔ اتنے طریقوں سے پوچھا۔ لیکن ولید نے پکڑائی نہ دی۔" کہیں ولید کسی مشکل میں تو نہیں۔ اس لئے کہ اُس نے اپنی پریشانیاں آج تک شائد کسی کو نہیں بتائی تھیں۔ ہو سکتا ہے وہ کوئی نہائت اہم بات چھپا رہا ہے۔ لیکن مجھ سے کیوں چھپائے گا۔ اور پھر کیا وجہ تھی۔؟ کیوں؟ سارا دن۔ اتنی رات گئے تک۔ ولید کا روّیہ۔ عارف کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ اُس نے سوچا" ہوگا کچھ ایسا اہم۔ جو وہ مجھے بتانا نہیں چاہتا تھا"۔ یوں اُسے تھوڑی تسلّی ہوئی۔ اُس نے بتی بجھائی۔ بستر پر لیٹنے سے پہلے اُس کو اچانک ولید کا گذری کل میں کیا وہ سوال یاد آیا۔" آج دس ستمبر ہے ناں"۔ ولید کو تو پچھلے برسوں۔ آنے والے برسوں کے دن۔ راتیں۔ شکلیں سب یاد ہوتی ہیں۔ اُسکا دماغ تو ایک کمپیوٹر ہے۔ کیا واقعی اُسے تاریخ بھول گئی تھی۔؟ نہیں۔ ولید کو تاریخ نہیں بھول سکتی۔ تو پھر اُس نے کل تاریخ کیوں پوچھی۔ اور آج۔ یہ اتنا بڑا واقعہ پیش آ گیا۔! کسی انجانے خوف کی وجہ سے عارف کے ماتھے پر پسینے کی ایک لکیر ابھری۔ اور پھر بتی جلا کر۔ وہ کافی دیر تک بستر پر ہی بیٹھا رہا۔ نیند اُس سے کوسوں دور جا چکی تھی۔!!

ꕥꕥꕥ

CamScanner

◎

سیدھے راستے پر چلنے والے ۔ اپنے اندر ۔ بہت آسانی سے ۔ رستہ بھولنے کی صلاحیت رکھتے ہیں ۔کوئی بات ذرا سی اصول کے خلاف ہو جائے ۔کسی جگہ جھوٹ' فریب یا عیاری کی کوئی بھی کنکری ۔ دیانت دار قدموں کو بآسانی زمین سے اکھیڑ دیتی ہے۔ آسمان سے گرتے ہوئے ۔ بالکل سفید ۔ روئی جیسے ۔ برف کے گالوں نے اگر اپنی معصومیت' حُسن اور لمس ۔ اپنی اصل حالت میں برقرار رکھنا ہو تو جہاں گرنا ہو ۔ اُس زمین کا کسی بھی قسم کی بدصورتی سے پاک ہونا ۔ پہلی شرط ہو گی ۔ اصول بنانے والے بھی کمال کے انسان تھے ۔ ایسے ایسے اصول بنائے جو بسا اوقات ۔ اپنی معنویت میں ۔ ایک دوسرے سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتے ہیں ۔ "جلدی کا کام شیطان کا" کا کہہ کر اگلے ہی صفحے پر جلی حروف میں لکھ دیا ۔ "آج کا کام کل پر نہ چھوڑو" ۔ مناسب متن نہ ہونے کی وجہ سے سوچنے والے دماغ کیسی کیسی تاریک راہوں پر بھٹکتے ہیں ۔ اصول بنانے والے نے شائد نہ سوچا تھا ۔ دوسری طرف اُن اصولوں پر سادہ دلی اور سچائی سے عمل کر کے سیدھے راستے پر چلنے والے ۔ نادانستگی میں ۔ اپنے ماحول اور دوسرے لوگوں کو بھی سیدھا چلتا ہوا دیکھتے ہیں ۔ یا پھر دیکھنا چاہتے ہیں ۔ یا پھر اس طرح دیکھنا اُن کی مجبوری بن جاتا ہے ۔

جھوٹ اپنی تمام شکلوں میں توانا نظر آتا دیکھ کر ۔ قوی سے قوی تر ۔ ہوتا دیکھ کر ۔ غلط راستوں پر چل کر ۔ جلد منزل پہ پہنچتا دیکھ کر ۔ سچ کے کٹھن راستوں پر چلنے والے ۔ ٹھٹھک کے رہ جاتے ہیں ۔ مبہوت ہو جاتے ہیں ۔ گُم سُم ہو جاتے ہیں ۔ اپنی گویائی' بینائی اور آگہی پر شک کرنے لگتے ہیں ۔ کئی نامانوس سوالوں میں گھِر کے اپنی خود اعتمادی ۔ اپنی کامیابیوں ۔ بلکہ اپنے آپ سے مشکوک ہوتے ۔ سیدھے لوگ ۔ اپنے آپ کو ایک دوراہے پر کھڑے دیکھتے ہیں ۔ ! ایک طرف اصولوں میں جکڑا دماغ' دل اور روح ۔ دوسری طرف بے اصولوں کی دنیا میں جشن ۔ ! ایمان مضبوط رکھیں ۔ یا جھوٹ کو جیتنے دیں ۔ یا پھر "آخر کار جیت سچ کی ہوگی" کا ورد کرتے ہوئے ۔ کچھ

دل اور متزلزل دماغ سے سیدھے راستے پر چلتے رہیں؟ یا پھر۔ زندگی بھر کے اپنائے۔ سچائی اور دیانت داری کے اصولوں کے بھاری پتھر ایک جھٹکے سے اپنے کاندھوں سے گرا کر۔ دوسری طرف ہوتے جشن میں شمولیت کی راہ نکالیں؟ مگر کیا کریں کہ کمپیوٹر نے ایسی کوئی کمانڈ ایجاد نہیں کی۔ جو جشن میں شمولیت کے بعد۔ اصولوں سے بغاوت کرنے کے بعد۔ صحیح خوشی دلانے کے لئے۔ اصولوں میں بِتائی زندگی کو یک جنبشِ ماؤس۔ delete کر دے۔ اُس ماضی کا کیا کریں گے۔؟ جہاں والدین اور ماحول نے بہت بچپن میں ہی سچ کی میخیں آنکھوں۔ دل۔ روح۔ سینے۔ اور وجود کے ہر سینٹی میٹر پر گاڑ دی تھیں۔ جھوٹ کی دنیا میں سچ کی آمد؟ کیا مہمان کو خوش آمدید کہنے والے سچ بول رہے ہوں گے؟ یا پھر جھوٹ کی دنیا میں آنے کے بعد۔ چاروں طرف صرف جھوٹ ہوگا۔ اور سچائی کے سارے معیار تنزلی کی آخری تہوں میں بھی نظر نہ آئیں گے؟

ولید کئی مہینے اپنے دفتر نہیں گیا۔ دفتر والے بُلا بُلا کر تنگ آ گئے۔ طرح طرح کے ڈیزائنر سوٹ۔ وارڈ روب میں پڑے گرد اکٹھی کر رہے تھے۔ عارف کے اصرار پر ولید دن میں ایک آدھ بار کچھ کھا لیتا۔ ایک برس پہلے جس نے ولید کو دیکھا ہوگا وہ اب اُسے پہچان نہیں سکتا تھا۔ کھدر کی شلوار قمیض۔ پشاوری چپل۔ اور سر پر اپنے والدِ محترم۔ شرف الدین صدیقی کی طرح کی سفید ٹوپی۔! شیو بڑھی تھی یا ولید نے داڑھی رکھ لی تھی۔ وہ پہلے والا ولید نہ رہا تھا۔ اُس نے باتیں بہت ہی کم کر دی تھیں۔ دن میں دو ایک بار۔ کسی فون کو اٹینڈ کرتے ہوئے۔ اپنے بنک مینیجر سے بات کرتے ہوئے۔ عارف کے ساتھ۔ یا پھر سدرہ کا کبھی فون آ جاتا تو۔ ولید کی باتیں ختم ہو رہی تھیں۔ بالکل ویسے ہی جیسے۔ عارف کی بیٹی نے ایک دن بیٹری کمزور پڑ جانے کے باعث بولنے والی گڑیا کو ہاتھ میں پکڑے۔ عارف سے کہا تھا "بابا۔ میری گڑیا کی باتیں ختم ہو رہی ہیں"۔

مغرب کی نماز ولید نے کبھی نہ چھوڑی تھی۔ اب وہ پانچ وقت کی نماز نہایت باقاعدگی سے پڑھنے لگا تھا۔ زیادہ تر وقت اپنی سٹڈی میں گذارتا۔ جہاں چاروں طرف بکھرے کاغذ۔ کتابیں۔ اور درمیان میں بیس پچیس درازوں والی کمپیوٹر ٹیبل۔ جس پر رکھا جدید ترین کمپیوٹر۔ اپنے مالک کے ہر اشارے کو سمجھتا تھا۔

عارف کے لاکھ پوچھنے پر بھی ولید نے اتنے بڑے "ذاتی انقلاب" کی وجوہات نہ بتائی تھیں۔ کچھ نہ کچھ اِدھر اُدھر کی بات کر کے۔ یا پھر سیدھا سادا خاموش رہ کے۔ ولید ہر بار ٹال

CamScanner

دیتا تھا۔

"تم نے ایک مرتبہ سپین جانے کی بات کی تھی۔ چلو اکٹھے چلتے ہیں۔ میرا بھی دل چاہتا ہے غرناطہ اور قرطبہ دیکھنے کو۔ اور پھر میں قرطبہ کی اُس مسجد میں جا کر وہ جگہ دیکھنا چاہتا ہوں جہاں علامہ اقبال نے اپنی مشہور و معروف نظم لکھی تھی"۔ عارف نے ناشتے کی میز پر اچانک سوال کیا۔

"ضرور جاؤ۔ کب جانا چاہتے ہو؟" ولید نے بے دھیانی سے کہا۔

"میں تمہارے جانے کی بھی بات کر رہا تھا"۔

"نہیں۔ اب دل نہیں ہے۔ ضروری تو نہیں کہ ہر بات جو کی جائے وہ پوری بھی کی جائے"۔ ولید کے لہجے میں تلخی سی تھی۔

"تو چلو پاکستان چلتے ہیں۔ سدرہ سے ملتے ہیں۔ طلحہ اور حمزہ سے ملتے ہیں۔ اپنے محلّے چلتے ہیں۔ یقین کرو۔ بڑا مزا آئے گا۔ اور کتنا عجیب عجیب لگے گا۔ جن گلیوں میں ہم کھیل کر بڑے ہوئے۔ جہاں خواب دیکھنے شروع کئے۔ وہاں خواب پورے کر کے جائیں گے تو کتنا اچھا لگے گا۔ تم نے اور کسی حد تک میں نے بھی۔ اتنا پیسہ بنا لیا ہے جو لوگ اپنی عمریں گذار دینے کے بعد بھی نہیں بنا سکتے۔ چلتے ہو۔؟"

" کونسے خواب پورے ہوئے۔ وہ جو پورے ہوئے۔ وہ بھی اب خواب ہو چکے ہیں"۔

"واہ۔ میں تو ابھی بھی کہتا ہوں۔ تم شاعری شروع کرو۔ ایمان سے۔ سب کو پیچھے چھوڑ دو گے"۔ عارف خوش تھا کہ ایک مدت کے بعد ولید " گفتگو" کر رہا تھا۔!

"سب کو پیچھے چھوڑ دیں تو آدمی آگے نکل جاتا ہے۔ اور پھر آگے نکل جانے والے۔ تنہا رہ جاتے ہیں۔ سب کو پیچھے چھوڑ کر ہی تو یہاں آیا تھا۔ اور یہاں بھی..... " ولید نے بات ادھوری چھوڑ دی اور چپکے سے اپنی کرسی کھسکا کر "excuse me" کہتا ہوا اپنی سٹڈی کی طرف چلنے لگا۔

عارف نے روکنا مناسب نہ سمجھا۔ اُسے ایک عجیب سا اطمینان تھا۔ ولید نے مہینوں بعد ہی سہی۔ تھوڑی گفتگو تو کی۔ اپنی چائے ختم کرتے ہوئے اُسے خالہ مریم۔ شرف الدین صدیقی۔ طلحہ۔ حمزہ۔ سدرہ۔ صبا۔ اور ولید کے ساتھ منسلک سارے لوگ یاد آ رہے تھے۔ آج خالہ مریم زندہ ہوتی تو کتنی خوش ہوتی۔ لیکن ولید تو خالہ مریم کی کالی چادر کا ہی پیچھا نہیں چھوڑتا۔ جب

CamScanner

دیکھو۔ کاندھوں پر اوڑھے پھرتا رہتا ہے۔ اور پھر صبا نے بھی ولید کو نہ سمجھا۔ کیا تھا۔ کچھ دیر اور انتظار کا جوا کھیل لیتی۔ ولید جیسے ہیرے تو نصیب والوں کو ملتے ہیں۔ اُسے بھی "ہاں" اگلوانے کی رٹ لگی تھی۔ وہ یہ سمجھ ہی نہ سکی کہ ولید۔ ایک عام آدمی نہیں ہے۔ عام آدمی۔ جو اکثر ہاں یا ناں ذرا سی سوچ میں ڈوبنے کے بعد کہہ دیتے ہیں۔ پھر "ہاں" "ناں" میں بدلتی ہے تو وہ عام سی کوئی دلیل ڈھونڈ کر اِس میں تبدیلی کی سچائی ثابت کرنے لگتے ہیں۔ پچھلے لگ بھگ تین برسوں کی مسلسل رفاقت نے عارف کو ولید کے بارے بہت کچھ سمجھنے میں مدد دی تھی۔ پورا تو آج تک اپنا آپ سمجھ میں نہیں آ سکا۔ لیکن ولید کے اندر ایک غیر معمولی انسان کی ٹھوس موجودگی کو عارف نے پورا سمجھ لیا تھا۔ اُسے دکھ اِس بات کا تو تھا ہی کہ ولید بہت اکیلا ہے۔ لیکن اصلی دکھ اُس کو اِس بات کا تھا کہ ولید سب کچھ ہوتے ہوئے بھی۔ کسی انجانی۔ پراسرار۔ تکلیف میں مبتلا تھا۔ کوئی ایسا دُکھ جو کسی کو بتایا جا سکتا ہے نہ سمجھا جا سکتا ہے۔ لکھا جا سکتا ہے نہ لکھوایا جا سکتا ہے۔ فقط محسوس کیا جا سکتا ہے۔ کاش۔ میں ولید کے کسی کام آ سکوں۔ کاش میں اُسے زندگی کی طرف واپس لا سکوں۔ "یاد تھیں جتنی دعائیں۔ صرفِ درباں ہوں گئیں"۔ اور عارف نے ملازم کو آواز دی کہ آ کر برتن اٹھا لے۔

ꙮꙮꙮꙮ

CamScanner

◎

تقریباً سارا دن ہی بنک میں گذار کے ولید گھر لوٹا تھا۔انشورنس کے کاغذ۔مکان کے کاغذ۔نئے مکان کی ڈاؤن پے منٹ کے کاغذ۔پرانے مکان کو بنک کے حوالے کرنے کے کاغذ۔ گاڑی کی lease کے کاغذ۔لاکر کی چابی۔اور اِسی طرح کی نجانے کتنی دستاویزات۔اشیاء۔ولید کے بڑے سے بریف کیس میں قید تھیں۔عارف کو ولید نے تقریباً بارہ بجے دوپہر دفتر سے بنک بلوا کر کچھ دستخط کروائے تھے۔نیا مکان عارف کے نام تھا۔موجودہ مکان سے چھوٹا۔ٹاؤن ہاؤس۔ لیکن عارف کے رہنے کے لئے مناسب۔!"ولید کیا چاہتا ہے۔؟کیا کر رہا ہے۔؟یہ سب کیا ہو رہا ہے"۔عارف کو کوئی اندازہ لگانے میں بھی مشکل پیش آ رہی تھی۔" کیا ولید امریکہ چھوڑ کر جا رہا ہے؟کسی دوسرے ملک۔یا پھر کسی دوسری سٹیٹ میں۔لیکن کیوں۔؟اِس" کیوں" کا جواب بھی اُس کے پاس نہیں تھا۔شام کو گھر لوٹتے ہوئے اُسکے ذہن میں اِسکے علاوہ بھی بہت سے سوالات تھے۔ڈھیر سارے ڈالر ولید نے ایک ہفتے کے اندر اندر یہاں سے وہاں کر دیے تھے۔ہمسائے میں برسوں سے رہنے والے اُس بڑی عمر کے میاں بیوی کے لئے۔پچیس ہزار ڈالر کا چیک۔لو بھلا۔اِن سے ہمارا کیا رشتہ ہے۔انہوں نے تو کبھی ہمارے گھر کی دہلیز بھی نہیں پار کی۔!نذر بنگالی اور اپنے سیون الیون کے دنوں کے چند ساتھیوں کے لئے ہزاروں ڈالروں کے چیک اور کیش۔! کھڑے کھڑے شوروم سے خریدی۔بی ایم ڈبلیو۔ضد کر کے پروفیسر آرتھر کو دے دی۔خود عارف کے نام ایک ٹاؤن ہاؤس۔ڈاؤن پے منٹ اور آسان مارگیج ماہانہ۔اور پھر سسینا کو بیچنے اور وہ چھوٹا سا دفتر خود چلانے کے تمام حقوق۔عارف کے نام۔

"یہ شخص بانٹ رہا ہے یا سمیٹ رہا ہے"۔عارف کو کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا۔اور پھر بریف کیس بھر کے کیش ڈالرز۔کریڈٹ کارڈز کے زمانے میں اتنے ڈالرز۔!ولید نے اپنے ایک کریڈٹ کارڈ کو چھوڑ کے سب کا آپریشن بند کرا دیا تھا۔اور مجال ہے ڈیوڈ یا عارف کو کچھ خبر ہو کہ یہ

سب کیا ہو رہا تھا۔

" کہیں جا رہے ہو ولید۔؟ میں کچھ دنوں سے یہ سب دیکھ رہا ہوں۔ تم مجھے ساتھ بھی رکھتے ہو۔ دوست بھی سمجھتے ہو۔ اور پھر اتنا کچھ کرنے کی۔ اور وہ بھی اچانک۔ کوئی واضح وجہ بھی نہیں بتاتے۔ یعنی لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے والی صورت حال ہے۔ یار۔ کچھ تو بتا دو۔ میرا دماغ الٹ جائیگا"۔ عارف ولید کی سٹڈی کے دروازے پر کھڑا بولتا جا رہا تھا۔ ولید کمپیوٹر پر مسلسل کچھ ٹائپ کر رہا تھا۔

"ولید۔ میں تم سے بات کر رہا ہوں۔ !Heavens "۔ کوئی جواب تو دو۔ اِس طرح کی خاموشی کی مار تو ناراض ہو کر دی جاتی ہے۔ کیا مَیں نے کچھ کیا ہے؟ میری کوئی بات بُری لگ گئی ہے؟ اور کم از کم۔ مجھے اندر آنے کے لئے ہی کہہ دو۔ اتنی دیر سے دروازے پر ہی کھڑا ہوں۔۔۔۔۔"

" آ جاؤ۔ بلکہ اُسے کہو ایک سٹرانگ سی چائے بھی بنائے۔ کرتے ہیں بات"۔ ولید نے کمپیوٹر سے نظریں ہٹائے بغیر نہائت ملائمت سے کہا۔

"شکر ہے۔ کفر تو ٹوٹا۔ پانچ منٹ بعد اِس حیرت کدے سے باہر تشریف لے آیئے گا۔ چائے تیار ملے گی"۔ واپس مڑتے ہوئے عارف کو خیال آیا کہ سٹڈی میں پڑے اُس نئے سوٹ کیس کا بھی ضرور پوچھنا ہے۔ اُسے ابھی جواب نہیں ملے تھے۔ لیکن سوٹ کیس کو دیکھ کر اُسے کچھ کچھ یقین ہو چلا تھا کہ ولید کہیں جا رہا ہے۔ ملازم کو جلدی۔ گرم گرم اور سٹرانگ چائے بنانے کا کہہ کر عارف ڈائننگ روم کے طرف مڑ گیا۔ اُسے ولید کے حالیہ ارادوں کے بارے معلومات کرنے کی ایک عجیب سی بے چینی نے گھیر رکھا تھا۔ کسی ایک جگہ ٹک کے بیٹھنا اُس کے لئے ممکن نظر نہ آ رہا تھا۔ " مجھے لگتا ہے ولید کسی دوسری سٹیٹ میں شفٹ ہو رہا ہے۔ ڈیوڈ کا بھی یہی خیال ہے۔ اور کچھ دنوں سے یہ جو اجنبی اجنبی سے بہت سارے فون ولید کو آئے۔ ان کا تعلق بھی یقیناً موجودہ صورت حال سے ہے۔ کوئی لڑکی۔؟ نہیں ولید کو کسی بات سے ڈرنے کی کیا ضرورت؟ کوئی لڑکی ہوتی۔ تو۔ کاش کوئی لڑکی ہی ہو! تو کیا کوئی نیا مشن۔؟ لو۔ پرانے مشن کا تو آج تک پتہ نہ چل سکا۔ نئے کا کیا چلے گا"۔ عارف اُس کھلے اور بڑے ڈائننگ روم میں کونے ماپ رہا تھا۔

"ولید نے دل کی بات آج تک کسی کو نہیں بتائی۔ اتنے لوگوں کے دل میں بستا ہے۔

CamScanner

اتنے لوگوں سے۔ ایسے اچھے طریقے سے برتاؤ کرتا ہے۔ اور پھر ہر کسی کے دل کا حال۔ پلک جھپکتے جان لیتا ہے۔ دوستوں کو کرید کرید کر۔ سارے احوال اگل دینے پر مجبور کر دیتا ہے۔ مسئلوں کا حل نکالنے میں جت جاتا ہے۔ اور کئی مسائل حل بھی کر دیتا ہے۔ لیکن اپنے بارے کچھ نہیں بتاتا۔ کیا ولید کو آج تک ایسا کوئی مسئلہ ہی پیش نہیں آیا۔ جو وہ کسی کو بتا سکے۔ سدرہ بھی یہی کہتی ہے۔ خالہ مریم بھی یہی کہتی تھیں "اس کا دل اور دماغ دونوں اتھاہ ہیں"۔ تو کیا اتنے اتھاہ ہیں! اسکے دل اور دماغ کہ ہر مسئلہ خود بخود یا تو دب کر ختم ہو جاتا ہے یا پھر کوئی magic wand ہے اسکے پاس۔! شادی کرنے کا نام نہیں لیتا۔ لڑکیوں میں اتنا interested نہیں ہے۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ کرنے میں۔ کام۔ کام۔ اور بس کام۔ بھئی یہ تو ہمارے قائداعظم تھے۔ جنہوں نے پاکستان بنانا تھا۔ اس نے کون سا نیا ملک دریافت کرنا ہے یا۔ یا پھر اسکی بھی کوئی اپنی ہی two nations تھیوری ہو گی۔ جس کا علم۔ شائد۔ سب کو بعد میں ہو گا۔ یا پھر ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔ عارف کے خیالات کا سلسلہ۔ "چائے بن گئی؟" کے الفاظ سارے میں گونجنے سے ٹوٹ گیا۔

"یہاں حضور۔ درباری یہاں ہیں"۔ عارف نے بلند آواز میں کہا "یار یہ چائے اور سگریٹ نہ ہوتے تو زندگی کتنی بے ذائقہ۔ بے بو۔ بے لحاظ اور بدمزہ ہوتی"۔ ولید نے چائے کا پہلا گھونٹ لیتے ہی سگریٹ سلگا لیا تھا۔

"پوری سٹیٹ میں یہ شائد واحد گھر ہے۔ جس کے اندر سگریٹ پیے جاتے ہیں۔ اور اب تو لوگ گھروں سے باہر بھی سگریٹ پیتے ہوئے شرمندہ شرمندہ محسوس کرتے ہیں۔ اور تم کہہ رہے ہو کہ اسکے بغیر زندگی بدمزہ ہو جائے گی"

"تو کیا یہ بچاری سگریٹ ہی دنیا بھر کی شرمندگیوں کا باعث ہے"

"بے چاری کہ بے چارا سگریٹ؟"

"تم اردو دان ہو۔ زیادہ جانتے ہو۔ مجھے تو "بے چاری" میں زیادہ مزا آتا ہے"

"اور یاد ہے ایک دن فون پر تم کسی سے کہہ رہے تھے کہ داڑھی مونث ہے۔ اسلئے رکھی ہوئی ہے"۔ عارف نے قہقہ لگاتے ہوئے کہا۔

"ہاں تم کچھ پوچھ رہے تھے۔ مجھے اندازہ ہے کہ تمہارے پاس بے شمار سوالات ہوں گے۔ میرے پاس اتنے جوابات شائد نہ ہوں"۔ ولید نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لیتے

ہوئے کہا۔

"بھئی۔ سیدھا سادا سا معاملہ ہے۔ کہ ہر بات سمجھنی ہے۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔؟ سوٹ کیس۔ ڈالرز۔ نیا مکان۔ پرانی چیزیں۔ یہاں وہاں۔ تم کہیں جا رہے ہو"۔

"ابھی ابھی ایک ای میل لکھی ہے۔ چار دن بعد اپنے میل باکس میں دیکھ لینا۔ فی الحال اتنا ہی کافی ہے۔ اور ویسے بھی ہر سوال کا جواب ہونا ضروری نہیں"۔

" مگر اس بنیادی سوال کا جواب تو ملے کہ ہو کیا رہا ہے"

" تمہیں کس نے کہا کہ یہ سوال۔ بنیادی۔ ہے؟"

"مطلب؟"

"مطلب یہ کہ سوال میرے متعلق ہیں اور فیصلہ تم کر رہے ہو کہ یہ سوال بنیادی ہے اور وہ بنیادی نہیں ہے"

"بحث میں تم سے جیتنا۔ کم از کم۔ تمہارے ہوش و حواس میں ہوتے ہوئے۔ میرے لئے خارج از امکان ہے۔ لہٰذا درخواست سمجھ کر ہی جواب دے دو"

" کہا تو ہے کہ ای میل پڑھ لینا۔ تمہاری طرح چند ایک اور لوگوں کو بھی کاپی کر دی ہے۔ تمہارے علاوہ چند اور لوگ بھی ہیں جن کے لئے چند "بنیادی سوالوں" کے جوابات ملنا شائد بنیادی اہمیت رکھتے ہوں" ولید نے "بنیادی سوالوں" پر زور دیتے ہوئے کہا

"یہ ای میل آج کیوں نہیں بھیجی اور پڑھی جا سکتی۔؟ کیا اس میں بھی کوئی سٹیٹ سیکریٹ ہے کہ آج کیوں نہیں اور کچھ دنوں بعد کیوں"

"سٹیٹ سیکریٹ۔؟ طنز کر رہے ہو۔؟"

"نہیں۔ اپنی کسمپرسی تم تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ جنیاں تن میرے تے لگیاں۔ تینوں اک لگے تُوں جانیں۔! حد ہو گئی۔ اور اب یہ اگلے چند دن۔ آپ کے دوست احباب۔ دنیا والے۔ کیا کریں گے یہ بھی بتا دیجئے"۔

"تم میری سے شادی کر لینا۔ اچھی لڑکی ہے۔ لیکن اپنے پچھلے تجربے کو قانون نہ بنانا۔

کیوں؟"

"یہ میری کہاں سے آ گئی بیچ میں؟ اور تم نے کب کرنی ہے شادی؟ کیا اس قماش کا کوئی

ارادہ ہے تمہارا۔؟ چلے ہیں صاحب مشورے دینے۔!"

"عارف۔تم میرے واحد دوست ہو۔اور یہ بات مجھے ثابت کرنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے اِس وقت مجبور نہ کرو۔اور....."

"او کے۔او کے۔ جہاں اتنے مہینے۔سال۔انتظار میں گذر گئے۔وہاں چند دن اور سہی۔!تم بس ٹھیک رہنا اور خیر سے رہنا۔ٹھہرو۔مَیں کھانا لگواتا ہوں"۔

بچپن سے جوانی اور جوانی سے آگے تک۔دوستی۔کی عمر جتنی لمبی ہوتی ہے۔اعتبار اتنا ہی گہرا ہوتا جاتا ہے۔دوسری طرف۔اِس طرح کی سچی۔اصلی۔گہری اور بے غرض دوستیاں۔ہر دو کو۔گا ہے بگا ہے۔پُل صراط پر بھی چلاتی ہیں۔ذرا سی چوٹ۔ذرا سی غلط فہمی۔ہلکا سا کوئی غیر ضروری جملہ۔ذرا سی کوئی بات۔لمبی لمبی دوستیوں کو ایک لمحے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم بھی کر دیتی ہے۔ولید اور عارف کی دوستی۔کچھ ایسی ہی تھی۔صرف ایک فرق تھا۔!اور یہ فرق عارف کو پوری رات۔جگائے رکھنے کے لئے کافی تھا۔ولید کو عارف کے بچپن سے لے کر آج تک۔سب حالات کا بخوبی علم تھا۔اور عارف۔اپنے جگری دوست کے بارے میں اُس تناسب سے نہیں جانتا تھا۔اُسے ولید نے اپنے "اندروں اندری واگدے" رہتے۔درد حیاتی کے۔پانی میں سے کبھی ایک بوند بھی سمجھنے میں مدد نہ دی تھی۔"اندر" کی کوئی بات عارف نہیں جانتا تھا۔اور شائد اِس بھری پُری دنیا میں۔خود ولید کے علاوہ۔ولید کے "اندر" کے حالات۔کسی کو بھی معلوم نہیں تھے۔

☆☆☆☆

◎

اگلے دن گھر سے تین چیزیں غائب تھیں۔ایک درمیانے سائز کا سوٹ کیس۔ایک بریف کیس۔اور گھر کا مالک۔!ملازم معمول کے مطابق سات بجے دروازہ باہر سے کھول کر اندر آیا تو پہلا خیال اُسکو چوری کا آیا۔سٹڈی کا دروازہ کُھلا تھا۔!اتنے برسوں کی اس گھر کی ملازمت کرتے ہوئے سٹڈی کا کُھلا دروازہ اُسکے لئے حیرانی کی بات تھی۔"یہ بھی تو ہوسکتا ہے ولید صاحب کو دروازہ لاک کرنا بھول گیا ہو۔میرا خیال ہے عارف صاحب کو اٹھانا چاہیئے"۔

سٹڈی کی بے ترتیبی ویسی کی ویسی تھی۔کمپیوٹر کُھلا تھا۔اُس خوبصورت۔بہت سی درازوں والی کمپیوٹر ٹیبل کے ساتھ رکھا سیاہ رنگ کا بریف کیس وہاں نہیں تھا۔رات عارف کو جو سوٹ کیس نظر آیا تھا وہ بھی اپنی جگہ پر نہیں تھا۔دیوار پر اُس بڑے چارٹ پر۔جس میں لفظوں اور گرافوں سے کسی پیچیدہ مستقبل کے بارے اشارے درج تھے۔ایک بہت بڑے کراس لگنے سے بیچ میں سے پھٹ گیا تھا۔ایسے جیسے کسی نے کسی تیز دھار والے آلے سے غصے میں چارٹ کے چاروں کونوں سے وسط میں آ کر لکیروں کو جوڑا ہو۔چارٹ کے وسط میں موٹے حروف سے "Life" لکھا اب صحیح طور پر نظر نہیں آ رہا تھا۔"Life" کے نیچے پانچ تیروں کے نشانات ویسے ہی تھے۔

"Live for others" کے بڑے سے خانے میں لکھے ہر لفظ کو انڈر لائین کیا گیا تھا۔سُرخ روشنائی سے۔!عارف کو لگا کہ ولید نے چارٹ پر نہیں اُس کے دل پر "کاٹے" مار دیئے ہیں۔"چلا گیا"۔"کہاں جا سکتا ہے"۔"واپس آئے گا"۔"شائد کوئی فون آ جائے"۔"پولیس میں خبر کروں"۔"نہیں۔کہیں مشکل بڑھ نہ جائے"۔اس طرح کے خیالات سے گھرا عارف۔تقریباً پاگلوں کی طرح۔کمرے کے ہر طرف بکھرے کاغذوں کو الٹ پلٹ رہا تھا۔"شائد ولید نے کوئی پیغام چھوڑا ہو"۔!

گھنٹہ بھر کی بے سود تلاش نے عارف کو تھکا دیا۔ سٹڈی میں پڑی ہلکے براؤن رنگ کی ایزی چیئر پر بیٹھ کو اُس نے سوچنا شروع کیا۔ کیا کیا جا سکتا ہے؟ سدرہ کو فون کروں تو کیا بتاؤں؟ وہ خواہ مخواہ پریشان ہو گی۔ اتنی دور پاکستان میں بیٹھی وہ کر بھی کیا سکتی ہے؟ ڈیوڈ۔؟ پروفیسر آرتھر۔؟ ہمسائے کے لوگ۔؟ لیکن کسی کو بھی تو ولید کے بارے کچھ پتہ نہ ہو گا۔ یہ امریکہ ہے۔ سب سے پہلے لوگ اپنی جان بچاتے ہیں۔ سب کہیں گے کہ پولیس کو فون کرو۔ اور پولیس کو فون کرنے سے معاملہ مذید پیچیدہ ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ ولید کے سفر میں۔ کوئی رکاوٹ آ جائے۔ کچھ بھی ہو۔ مجھے پولیس کو involve نہیں کرنا۔!

" کیا کریں صاحب" ملازم کب سے سٹڈی کے دروازے پہ کھڑا تھا۔ عارف کو کچھ احساس نہ رہا تھا۔

" کس کا کیا کریں" عارف ایک دم محتاط ہو کر بولا

"اپنے صاب کہاں گئے صاب؟"

" کل مجھے بتا رہے تھے کہ کسی دوسری سٹیٹ میں چند دنوں کے لئے جانا ہے۔ دیکھو۔ فون کی گھنٹی بج رہی ہے۔ کہیں ولید صاحب کا فون ہی نہ ہو"۔ عارف نے جھوٹ بولا اور ساتھ ہی ملازم کا دھیان بٹانے کے لئے بھی کوشش کی۔ فون پر دوسری طرف سے کوئی آواز نہ آئی تو ملازم نے تین چار مرتبہ ہیلو۔ ہیلو کر کے فون بند کر دیا۔

میَری کو فون کرنے اور اُسکو عارف کے پاس گھر آنے میں یہی کوئی پچاس منٹ لگے۔ عارف نے بہت سی تفصیل چھپا کر۔ بتانے والی باتیں میَری کو بتائیں اور اُسکی رائے طلب کی۔

"اگر پولیس کو نہیں بتانا تو پھر سوائے اس کے کہ ولید کی ای میل کا انتظار کیا جائے۔ میرے خیال میں کچھ نہیں کیا جا سکتا"

"اور تمہارے خیال میں۔ تین دن۔ جب تک ای میل ہم تک پہنچے گی۔ گذریں گے کیسے۔؟ اور پھر وہ ای میل سرے سے ملی ہی نہ تو۔"

" فکر نہ کرو۔ مل جائے گی۔ تم نے کوئی ناشتہ وغیرہ کیا کہ نہیں"

"ارے۔ دیکھو۔ مَیں تو تمہیں کچھ پوچھنا بھول ہی گیا۔ کیا کھاؤ گی۔؟ یا پھر چائے پئیں"۔ عارف جیسے کسی نتیجے پر پہنچ گیا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ ای میل کا انتظار ہی واحد راستہ تھا۔

CamScanner

ولید کے بارے معلوم کرنے کا۔لیکن میَری نے بھی وہی بات کی۔تو اُسے تسلی ہوگئی۔انسان بہت کمزور ہوتا ہے۔پورے یقین سے بھی کوئی بات کہی ہو تو بے یقینی کی کوئی چھوٹی سی کھڑکی کھلی رہ جاتی ہے۔ایسے ہی موقع پر کسی دوست کی ذرا سی "ہاں" اُس کھڑکی کو ھمیشہ ھمیشہ کے لئے بند کر دیتی ہے۔اپنے ہی کئے گئے فیصلے کی توثیق۔چاہے وہ کسی معمولی بات سے متعلق ہی کیوں نہ ہو۔کمزور لمحوں میں بہت کام آتی ہے۔ناشتہ کرتے ہوئے عارف کو تسلی تھی۔اب اُس ای میل کا انتظار کرنے والا وہ اکیلا نہیں تھا۔میَری بھی ساتھ تھی۔جس نے ضد کر کے عارف کو تیار ہونے اور دفتر جانے کا کہا۔"وقت جلدی گذر جائے گا۔دفتر ضرور جانا۔پھر شام کو ملیں گے۔آج ایک ضروری میٹنگ ہے۔ ورنہ میں تمہارے ساتھ۔ تمہارے دفتر چلتی۔ اور آج Mexican ریسٹورانٹ چلیں گے۔ٹھیک۔" اور گاڑی کی چابی پرس سے نکال کر میَری مین دروازے سے باہر نکل گئی۔

ဆဆဆ

◎

1969 میں سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کو۔اور 1989 میں آسٹریلیا کے ایک نوجوان طالبعلم کو شائد انٹرنیٹ کے پورے استعمال کا اندازہ نہیں تھا۔ بالکل ویسے ہی جیسے نوبل کو ڈائنامائیٹ ایجاد کرتے ہوئے اِس کی تباہ کاریوں کا اندازہ نہیں تھا۔ یا پھر ویسے ہی جیسے میرے والد صاحب کو دیانت داری کے مستحکم اور مستقل بیج ہمارے وجود میں بوتے وقت یہ خیال نہیں تھا۔ کہ یک طرفہ دیانت داری۔ کیسے ایک نو کیلے ہتھیار کی شکل بھی اختیار کر سکتی ہے۔جو۔فرینکنسٹائن کی شکل اختیار کر کے۔آدمی کی اپنی موت کا سبب بن سکتی ہے۔!

Manhatten میں "24 hours computer services" کے کاؤنٹر پر مستقبل کے خواب لیکر۔ پراٹھوں پر گذارا کرنے والا اندرو بنگالی ہو۔یا پھر میری طرح نئی زمینیں تلاش کر کے۔ نئے شجر اگانے۔اور نئے پھل ایجاد کرنے والا۔کوئی ولید۔انجام ملتا جلتا ہی ہوگا۔! ابھی بھی میری آنکھوں میں۔میرے دل پر وہ رستے لکھے ہیں۔8th ایونیو اور 9th ایونیو کے درمیان قریب ترین ٹرانزٹ۔8th ایونیو۔42nd سٹریٹ۔! بروک لین کی A-I System Corp یا فارسٹ ہلز کی ACE International Inc۔یا پھر وہ KWIK E MART۔ جہاں رات بھر مجھے جاگ کر۔اپنے قدموں پر کھڑے رہتے ہوئے۔دودو۔تین تین ڈالروں کا حساب کرنا پڑتا تھا۔کمر کے کڑاکے نکلتے۔اور میں صبح ہوتے ہی خوش ہو جاتا۔جیسے میری ملازمت کے اوقات ختم نہیں ہوئے۔زندگی کی گہری۔تاریک شب ختم ہوگئی ہے۔بچپن کے پہاڑوں سے ریاضی کے کلیات اور پھر ٹکنالوجی کے روشن مگر گہرے غاروں کا سفر کرتے ہوئے۔مجھے کوئی مشکل۔کبھی مشکل نہ لگی۔کسی انجانے ہاتھ نے ہمیشہ میرے سر پر سایہ رکھا۔ Solid State Devices میں تبدیلیاں لانے والا۔کسی "انجانے ہاتھ" کی مہربانی اور شفقت کی بات کرتا عجیب لگتا ہے۔Sandisk Co کو مشورے دینے والا۔بچپن کے کسی "گمان" میں الجھا ہوا

ہے۔ یہ تو Lebrynth Network سے لیکر پروفیسر آرتھر تک اور پھر ڈیوڈ یا پھر تم تک۔ کسی کو خبر نہ ہو سکی۔ مَیں کچھ معاملات میں بہت کمزور ہوں۔ بدقسمتی سے یہ " کچھ معاملات "ماں کے لئے کچھ نہ کر سکنے کی کسک میں لپٹے تو بگڑ گئے۔ کیا تھا اگر ماں کچھ برس اور زندہ رہتی۔ (بدقسمتی۔ یعنی سوفٹ وئیر کی دنیا میں انقلاب لانے والا۔ ابھی بھی قسمت پر یقین رکھتا ہے۔ حیرانی کی بات ہے نا) کانلے پارک میں تمہارے ساتھ گذاری وہ شام مجھے یاد آرہی ہے۔ جب مَیں نے سوچا تھا۔ اور تمہیں بتایا نہیں تھا۔ کہ میرے خواب کی تکمیل کے لئے۔ پیسہ۔ سیڑھی بنے گا۔ مَیں شائد غلط تھا۔ پیسہ کسی بھی سچے خواب کی تکمیل کے لئے ضروری نہیں ہوتا۔ مَیں شائد پھر غلط کہہ رہا ہوں۔ مگر اپنی سوچ میں اِس قدر درست مَیں ھمیشہ رہا۔ بہت سا پیسہ اکٹھا کرنا سرے سے کوئی خواب ہے ہی نہیں۔!

جولیس سیزر۔ تمہیں یاد ہے ماں نے مجھے سمجھایا تھا۔ اور پھر تمہارے امتحان کی تیاری۔! تو تمہیں یہ بھی یاد ہو گا جب ایک تقریبا مجنوں شخص نے جولیس سیزر سے کہا کہ Ides of March سے ہوشیار رہنا۔ تو کیا ہوا تھا۔ 15 مارچ کو ہی سیزر کی موت واقع ہوئی۔ لیکن وہ اُس پاگل شخص کو اس سچی پیش گوئی کرنے پر مبارک باد نہ دے سکا۔ مرے ہوئے۔ بول نہیں سکتے۔!

مجھے بھی۔ بس کے ایک مختصر سفر میں۔ میرے ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر۔ کسی نے بتایا تھا کہ میں بہت اونچا اڑوں گا۔ اُسکی ایک پیش گوئی تو سچی ہوئی۔ اس سے پہلے کہ دوسری بھی سچی ہو۔ مَیں اُسکو ڈھونڈ کے۔ اُسکو مبارک باد دینا چاہتا ہوں۔ چلو تمہیں بتا دوں۔ مَیں سب سے پہلے امرتسر جاؤں گا۔ وہاں کے سارے گردواروں میں تلاش کروں گا۔ اُس اجنبی شخص کو۔ جس نے کچھ سچی باتیں کیں۔ اور مَیں نے انہیں سنجیدگی سے نہ لیا۔ بعد میں کہاں جانا ہے۔ یہ مجھے فی الحال پتہ نہیں۔!

صبا نے ایک دن کہا تھا۔ " تمہارے امریکہ جانے کی بات پوری طرح محسوس کرتے ہی مجھے ایک پینک اٹیک ہوتا ہے۔ اور میرا دل میرے کان میں آجاتا ہے"۔

پچھلے دو برس میں جو کچھ ہوا۔ جو کچھ مجھے دیکھنا پڑا۔ جن جن مراحل سے میں گذرا۔ میرے دل نے میرے کان میں ہی رہنا شروع کر دیا۔ ابھی بھی میرے کان دھڑکتے ہیں۔ دل کی جگہ یوں لگتا ہے کسی نے کوئی مقدس بات جلی حروف میں لکھ کر۔ ایک ٹھوس پتھر رکھ دیا ہے۔ جس

کے اندر کے حالات۔ میں خود بھی نہیں جانتا۔! بہر حال اتنا پتہ ہے کہ سلوادور کی The Persistence of Memory میں سکھائے جانے والے انداز میں پینٹ کی ہوئی چند گھڑیاں۔ اُس پتھر پر پڑی ہیں۔ اور تیز بارش میں اِن گھڑیوں پر لگے رنگ۔ شائد زیادہ دیر تک جے نہیں رہیں گے۔ سپین جا کر ماموں حیدر کے بارے چند سوالوں کا جواب تلاش کرنا اب مشکل لگتا ہے۔ جس حقیقت سے اب دو چار ہوا ہوں۔ اُس سے نبرد آزما ہونے اور پھر کسی منزل تک پہنچنے میں۔ سپین کا سفر فٹ نہیں بیٹھتا۔ تم کبھی اگر میڈرڈ جاؤ۔ اور final suete supreme میں بُل فائٹر۔ Muleta کا سرخ رنگ بُل کو دکھائے۔ تو مجھے یاد کرنا۔ امریکہ آنا۔ یہاں اتنی ترقی کرنا۔ مجھے لگتا ہے کہ میری آنکھوں کے سامنے بھی کوئی Muleta آ گیا تھا۔ اور میں سوچنے سمجھنے کی کسی بھی صلاحیت سے عاری۔ اُس پاگل مگر طاقتور بُل کی طرح۔ اندھا دھند۔ اپنے شکار کی تلاش میں ناچتا رہا۔ تلوار کی آخری ضرب اپنی گردن اور سر کے درمیان۔ پڑنے سے پہلے ہی میں یہاں سے جا رہا ہوں۔ ذرا رکتا ہوں۔ تم چائے تیار کروا کے میرا کب سے انتظار کر رہے ہو۔ ویسے بھی چائے کی طلب کچھ ضرورت سے زیادہ ہی بڑھ گئی ہے۔!

ہاں۔ میں واپس آ گیا۔ صبح جلدی نکلنا ہے۔ لہٰذا اِس میل کو اب ختم کروں گا۔ ویسے۔ تتلی کو اگر خبر ہو جاتی ہے کہ اُس کا آخری وقت آ گیا ہے۔ اور وہ اُس جگہ کی طرف واپس اڑتی ہے جہاں اُس نے جنم لیا تھا۔ تو انسان کو کوئی ایسی اطلاع کیوں نہیں ملتی۔ تسلی رکھو۔ میرا ابھی مرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ اور ہاں یاد آیا۔ وہ دوسرا بریف کیس۔ جس میں کچھ کھلونے تھے۔ میرے بیٹے کے لئے تھا۔ وہ اُسے پہنچاتا ہوا جاؤں گا۔ حیران ہو گئے۔؟ کوئی لے پالک نہیں میرا اپنا بیٹا۔ خالد۔! کچھ عرصہ پہلے دو ماہ کے لئے کیلفورنیا رہتے ہوئے میں نے اور جینی نے شادی کی تھی۔ اس سارے عرصے میں اکثر اوقات وہاں جانا پڑتا تھا۔ ماں کے بعد جینی دوسری عورت ہے۔ جس نے مجھے کسی حد تک سمجھ لیا اور معاف کر دیا ہے۔ اُسے مسلمان تو نہیں کر سکا۔ لیکن اپنے بیٹے کا نام میں نے خود رکھا ہے۔ وہ شرف الدین صدیقی کی نسل میں سے ہے۔ "اُس کا کیا ہوگا"۔ تم نے یقیناً سوچا ہوگا کہ میرے چلے جانے سے میرے بیٹے اور بیوی کا کیا ہوگا۔؟ جینی سینی ٹوریم میں ہے۔ ڈاکٹروں کے مطابق چند ماہ اور زندہ رہے گی۔ اُسے شادی کے دو ماہ بعد ہی پھیپھڑوں کا کینسر ہو گیا تھا۔ خالد کے لئے بندوبست کر دیا ہے۔ اُسکے گارڈین کو تمہارا نام اور پتہ بھی بتا دیا

CamScanner

ہے۔ شائد تمہیں کبھی اُس طرف سے کوئی فون آئے۔! امریکہ اگر واپس آیا تو جینی یا خالد کے بلانے پر ہی آؤں گا۔ بچپن میں والد صاحب کے ڈر کی وجہ سے مذہب کی تعلیمات پر زور دیا۔ بڑے ہو کر قرآن پاک ترجمے کے ساتھ۔ اور تفسیر کے ساتھ پڑھا۔ لیکن اُس وقت تک خاصی دیر ہو چکی تھی۔ آدھی مسافت طے کر چکا تھا۔ اب سوچتا ہوں۔ ٹھیک ہی کیا جو راستہ نہ بدلا۔ اب دیکھو نا۔ ایک شخص جس کے پاس کار تو کیا سائیکل بھی نہ ہو۔ اور وہ دفتر پیدل جاتا ہو۔ یہ پوچھنے پر کہ وہ گاڑی کیوں نہیں لیتا۔ اگر وہ یہ جواب دے کہ مجھے "پیدل چلنا اچھا لگتا ہے"۔ تو کتنی معیوب بات ہوگی۔ گاڑی گیراج میں کھڑی ہو تو پیدل چلنے والا۔ اپنی ساری تو جیہیں۔ دلیلیں ساتھ لے کر سیر کرتا ہے۔ ویسے ایسے شخص کو کوئی سوال کرنے والا بھی نہیں ملتا۔!

صبا کو ایک کارڈ پر میں نے ایک مرتبہ Dearest کہہ کر سالگرہ مبارک کہا تھا۔ بہت مدت بعد۔ میری آخری "ناں" سننے کے بعد۔ اُس نے ایک بات کی تھی۔ "وہ ایک لمحہ جب تم نے مجھے Dearest لکھا تھا۔ وہ میرا تھا۔ میرے لئے تھا۔ میں اُس ایک لمحے کی حدّت اوڑھ کر زندگی کی ساری سردیاں گذار سکتی ہوں"۔ میں نے بھی کوشش کرنی ہے۔ سچ کی جو جھلک مجھے ابھی نظر آئی ہے۔ اسکے چکاچوند کر دینے والے عکس کو اوڑھ کر۔ مَیں اپنی زندگی کے باقی سال۔ روشنی میں گذار سکتا ہوں کہ نہیں۔؟ کہا گیا کہ دنیا ایک کھیل ہے۔ ایک Passing delight۔ ایک خوبصورت تماشہ۔ یہ شیکسپیئر سے بہت پہلے قرآن میں کہا جا چکا تھا۔ ہم لوگ تحقیق بھی تو نہیں کرتے۔ کسی کے پاس اتنا وقت ہے بھی کہاں۔؟ تو اِس خوبصورت تماشے کو مَیں بھی نہیں سمجھ نہیں سکا۔ بقول سقراط کے میں کچھ نہیں جانتا۔ لیکن یہ جانتا ہوں کہ کچھ نہیں جانتا۔ سراب کے کیسا رہے گا۔ میرے اندر کے خلا بھریں گے کہ نہیں۔ کسی جگہ سکون ملے گا کہ نہیں؟ واپس آؤں گا کہ نہیں۔ مجھے کچھ نہیں معلوم۔

"True , there is for you by day prolonged occupations with ordinary duties"

مَیری سے شادی کر لینا۔

تمہارا دوست۔ ولید

P.S. اگر کچھ دن اور امریکہ میں رہوں گا تو جو کچھ اب سوچ رہا ہوں۔ نہیں کر پاؤں

CamScanner

گا۔ اتنا اہم نہیں سمجھتا اپنے آپ کو۔ جو کہوں کہ مجھے مار دینے کے لئے ایک پوری حکومت بے قرار
ہے۔ لیکن تم تو جانتے ہو۔ کبھی کبھی۔ شطرنج کے کھیل میں۔ پیادہ۔ بادشاہ کے عین سامنے کھڑا نظر
آئے تو بساط۔ ساری کی ساری اُس پیادے کی طرف پھر جاتی ہے۔ (یوں مَیں اپنے یہاں سے
جانے کی exact تاریخ کسی کو بھی نہیں بتا سکتا۔ اور نہ ہی اِس ای میل میں لکھ سکتا ہوں۔ سب کو لگتا
ہے کہ ای میل میں لکھا پیغام صرف وہی پڑھ سکتا ہے جس کے میل باکس میں یہ بھیجی گئی ہے۔ لیکن
ایسا نہیں ہے۔ دنیا میں کسی جگہ سے بھیجی ہوئی۔ کوئی بھی ای میل۔ "پڑھنے والے"۔ پڑھ سکتے
ہیں۔ لہٰذا احتیاط کر رہا ہوں۔!) انٹرنیٹ اِس موجودہ دور کی سب سے خوبصورت ایجاد ہے۔ اور
انٹرنیٹ اِس موجودہ دور کی سب سے بھیانک ایجاد بھی ہے۔

CS CamScanner

◎

بے چینی میں اگر ذرا سا اطمینان بھی ملا ہو۔تو پریشانی کی شدت کم ہو جاتی ہے۔ولید کی ای میل کو کئی مرتبہ پڑھنے کے بعد۔ضروری باتیں ذہن نشین کرتے ہوئے عارف نے ای میل ڈیلیٹ کر دی۔"ولید ہوش و حواس میں ہے اور خیر سے ہے"۔اِس اطمینان نے اس کی بے چینی میں جیسے صبر کی چینی ملا دی تھی۔ای میل میں کچھ ایسی باتوں کی طرف اشارے بھی تھے جسے کسی اور کو بتانا شائد مناسب نہ تھا۔عارف نے مَیری کو صرف یہ بتایا کہ ولید خیریت سے ہے اور ہو سکتا ہے مستقبل میں کبھی امریکہ واپس بھی آئے۔مَیری نے بھی زیادہ نہیں کریدا کہ تفصیل کیا تھی۔

"ولید سے بات کرائیں عارف بھائی۔مجھے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں"۔سدرہ فون پر خاصی خوش محسوس ہو رہی تھی۔

"ولید تو نہیں ہے بہن۔شہر سے باہر گیا ہے۔مجھے بتائیں"۔عارف کئی طرح کے بہانے سوچنے میں مصروف تھا۔

" کوئی فون نمبر۔؟ میری پچھلی دو ای میلوں کا جواب بھی نہیں آیا۔عارف بھائی۔میرا بھائی خیریت سے ہے نا"۔آواز میں خوشی برقرار تھی۔مگر کچھ کچھ بے چینی کے آثار بھی تھے۔

"بالکل۔بالکل خیریت ہے۔آپکو تو پتہ ہے اُسکے کام حساس نوعیت کے ہیں۔فون پر آپ کو تفصیل نہیں بتا سکتا۔آپ نے کوئی پیغام دینا ہو تو بولئے۔مَیں پہنچانے کی کوشش کروں گا"۔

"ٹھیک ہے۔بس اُسے کہیے گا کہ اُسکا چیک مل گیا ہے۔اور اتنے ڈھیر سارے ڈالر۔اور اُس نے طلحہ۔حمزہ اور جس جس کو جتنے جتنے روپے بھیجنے کا کہا تھا۔وہ سب ہو گیا ہے۔لیکن عارف بھائی۔میرا بھائی ٹھیک تو ہے نا"۔بہن کی تسلی نہیں ہو رہی تھی۔

"قسم ہے شاعری کے دیوتا کی۔میرا دوست بالکل خیریت سے ہے۔اور دیکھئے۔ایک شاعر۔اِس سے بڑی قسم کا تو سوچ بھی نہیں سکتا"۔عارف نے بات مذاق کی طرف لے جانے کی

کوشش کی۔

"آپ کو پتہ ہے۔ دو ماہ پہلے۔ ولید نے مجھے اپنی کچھ نظمیں بھیجی تھیں۔ پابند شاعری تو نہیں۔ لیکن۔ نظمیں ہیں۔ مجھے تو اچھی لگیں۔ آپ کو کیسی لگیں"۔

"مجھے بھی بہت اچھی لگیں۔ وہ تو کوئی بھی کام کرے گا اعلیٰ پائے کا کرے گا۔ ویسے اگر وہ نظمیں آپ مجھے بھجوا دیں۔ آپ بھجوا سکتی ہیں؟۔ اُس نے بس ایک مرتبہ ہی سنائی تھیں۔ پھر سے پڑھنے کو دل چاہ رہا ہے"۔ عارف نے صریحاً جھوٹ بولا۔ "اُس نے تو اپنی شادی کی بات۔ میرے پاس رہتے ہوئے۔ مجھے نہ بتائی۔ یہ تو نظمیں ہیں۔ اچھا سرکار۔ جیسے آپکی مرضی۔ اتنے بڑے شاعر کو نہیں سنائی گئیں۔ ولید۔ ہر کسی کو۔ اپنی مرضی سے۔ چُن کر۔ باتیں بتاتا ہے۔ اِسی لئے سب کو اُس کے بارے میں مختلف زاویوں سے خبریں ملتی ہیں"۔ عارف نے سوچا" کوشش کروں گی۔ اپنا ای میل ایڈریس دے دیں۔ اور۔ جونہی ولید سے بات ہو۔ اُسے کہیں مجھ سے بات کرے۔ اور ہاں۔ اُسے یہ بھی کہنا کہ پچھلے دنوں۔ ایک لڑکی دیکھی ہے مَیں نے۔ میرا دل ہے ولید اُسے ایک مرتبہ دیکھ لے۔ اور اب اُسکی شادی ہو جانی چاہیئے"۔

"واہ میرے دوست۔ شادی کی بات مجھے بتائی۔ اور وہ بھی برسوں بعد۔ اپنی بہن کو معلوم ہی نہیں۔ اِس ریاضی کے علم سے مجھے مزید نفرت ہو گئی ہے۔ معلوم نہیں کونسے کلیئے میں ایسا روّیہ روا ہوتا ہوگا"۔ عارف نے سوچا اور سدرہ کو اپنا ایڈریس لکھوا دیا۔ اُس نے ولید کی شادی کی بات بہن کو نہ بتائی۔ خواہ مخواہ اُس کا دل بُرا ہوتا۔

اپنے بہن بھائیوں۔ عزیز رشتہ داروں۔ یہاں وہاں۔ ولید نے بے شمار رقمیں بانٹ دیں۔ وہ جس خواب کی تکمیل کے لئے۔ امریکی ڈالر اکھٹے کر رہا تھا۔ شائد ادھورا رہ گیا ہے۔ ورنہ اپنے ہاتھوں سے یہ "سیڑھی" وہ بھلا کیوں توڑتا۔ اور ایسا لگتا ہے جو فیصلہ اُس نے اب کیا ہے۔ اُس کو نبھانے کے لئے بے شمار پیسہ شائد درکار نہیں ہے۔ اِس طرح کی۔ دولت کی تقسیم۔ عارف کی سمجھ اور سوچ کے قافیئے ردیفوں سے بالاتر تھی۔ ایسی بانٹ تو ایک بوڑھا شخص اپنے مرنے سے ذرا پہلے۔ یا پھر وصیت نامہ میں درج کر کے کرتا ہے۔ ایک توانا ذہن اور بدن کا مالک۔ جوان جہان شخص بہ ہوش وحواسِ خمسہ۔ آخر کیوں کرے گا؟۔ اُس شب کاغذ قلم لے کر عارف نے بہت کوشش کی کہ اندر کا الاؤ۔ ذرا ٹھنڈا ہو۔ ذرا شاعری ہی کر لی جائے۔ گھنٹوں اپنے بستر پر پہلو

CS CamScanner

بدلے۔ چائے کے چار کپ۔ لیکن۔ اُسکا دماغ ولید کے روّیوں۔ سلوک۔ اور زندگی کے اتار چڑھاؤ میں ہی الجھا رہا۔ بس ایک شعر ہوا۔ جو صبح اٹھ کے اُس نے دوبارہ پڑھا تو کہا۔ "لو بھئی۔ ولید۔ یہ شعر تو لگتا ہے تمہارے لئے کہا گیا ہے۔ مگر یہ شعر تمہیں کیسے سنایا جائے؟"

لوگوں میں بانٹ دی جو محبت ہمیں ملی
اک تیرا درد ہم نے حفاظت سے رکھ لیا

☆☆☆☆

◎

بڑی بڑی عمارتوں۔ بڑے بڑے ہوٹلوں اور بڑے بڑے لوگوں کا شہر۔ نیو یارک۔
وہی نیو یارک جہاں اٹھارہ سال کا ہوتا ہی بیٹا اپنے باپ سے گھر کا کوئی کام بھی کرنے کے پیسے مانگتا ہے۔اور جلد ہی باہر کی گلیوں اور سڑکوں کا حصہ بن جاتا ہے۔ جہاں باپ بچوں کو ڈانٹ بھی نہیں سکتا۔ بیوی کو اونچی آواز میں کچھ کہہ بھی نہیں سکتا۔اس لئے کہ بچہ یا بیوی 911 پر فون کر دیں گے۔پولیس آ جائے گی۔اور شدید سردی میں باپ کو گھر سے باہر تین کپڑوں میں بھیج دیا جائے گا Restraint Order۔! اور پھر بات کبھی کبھی عدالت تک پہنچے گی۔ جہاں باپ۔اچھے برتاؤ کی قسم کھائے گا۔اور بیوی کی زہریلی مسکراہٹ۔اور بچے کی گھومتی پتلیوں میں چھپے طنز کے تیر کھانے کے باوجود۔ واپس گھر آئے گا۔ وہی نیو یارک۔ جہاں خاندان کی کُل عمر اٹھارہ سال ہے۔اس لئے کہ اٹھارہویں سال میں بچہ سگریٹ خرید کر پی سکتا ہے۔بیئر کی بوتلیں کار کی ڈکی میں رکھ سکتا ہے۔اور اب اُسے ماں باپ کی اتنی ضرورت نہیں۔وہ خود باپ بن سکتا ہے۔نوکری کر سکتا ہے۔شام میں کسی گرل فرینڈ کا ہاتھ پکڑ کر کسی بھی نائٹ کلب میں باآسانی گھوم سکتا ہے۔وہی نیو یارک۔ جہاں ہندوستان۔ پاکستان اور دیگر ممالک سے۔آئی ہوئی۔اکثر غریب اوران پڑھ۔ بیویاں۔ چند ہفتوں میں ہی اپنے خاوندوں کے لئے وبال جان بن جاتی ہیں۔ 911 اور Restraint Order یعنی آرڈر آف پروٹیکشن سے لیکر بچوں کی پرورش کے لئے سٹیٹ سروس کے دفتروں تک۔اور پھر ٹرانسپورٹ اور ٹیلی فون کا نظام سمجھ آتے ہی۔بقول عارف۔ان غریب۔ان پڑھ۔نیک پروینوں کے پر نکل آتے ہیں۔امریکی لہجے میں انگریزی بولنے کی کوشش۔اپنے ماضی پر مکمل پردہ ڈال کر۔ہیومن رائٹس۔بچوں اور بیوی کے حقوق۔خاوند کی ذمہ داریاں۔طلاق کے بعد میاں کی دولت میں آدھا حصہ۔اور بچوں کی پرورش کے لئے ماہانہ الگ۔! خاوند اکثر اپنے جیسے "بیویوں کے ستائے" دوستوں سے ملنے کی اجازت لیکر جاتا

CamScanner

ہے۔اور پھر سارے "مرد" دنیا جہان کی باتیں کرتے ہیں۔ سیاست۔ مذہب۔ شوبز۔ نوکریاں۔ مارگیجز۔ کہاں سے پٹرول سستا ملتا ہے۔ کس کے گیراج میں کون سا نیا اوزار آیا ہے۔ کس ٹام نے کس ڈک کے ساتھ مل کر کس ہیری کے پاس کام کرنے والی لڑکی کو تھوڑے زیادہ پیسوں کا لالچ دے کر۔ کس طرح اپنی دکان کے لئے کام پر رکھا۔ اور پھر آخر میں سب کا محبوب موضوع۔ اگر ہندوستان سے آئے ہیں تو دہلی اور ممبئی میں ہونے والے کرائمز اور گندگی کی باتیں۔ اگر پاکستان سے آئے ہیں تو کراچی۔ اسلام آباد۔ لاہور کی برائیاں۔ "پاکستان میں اب کوئی محفوظ نہیں ہے۔ وہاں تو پولیس والوں کے گھر ڈاکے پڑتے ہیں۔ کسی کی عزت محفوظ نہیں ہے۔ میں گیا تھا پچھلے دنوں۔ کچھ نہ پوچھو۔ سڑکوں پر اتنا دھواں۔ بجلی غائب۔ اتنی غربت۔ اتنی مہنگائی۔ اور ہر طرف غلاظت کے ڈھیر"۔ اور یوں وہ نفسیاتی طور پر اپنے آپ کو تسلیاں دیتے ہیں کہ "واپس جا کر کیا کریں گے۔ یہیں ٹھیک ہیں"۔ عجیب بات ہے۔ ان میں سے کوئی بھی یہ بات نہیں کہے گا کہ "بھائی صاحب۔ آپ اپنے ملک کی بات کر رہے ہیں۔ وہ ملک جس نے آپ کے باپ۔ ماں۔ اور آپ کو اپنی گود میں سنبھالا۔ جہاں آزادی کی بدولت آپ اس قابل ہوئے کہ پاسپورٹ بنوا کر امریکہ آ سکیں۔ آپ اُسی ملک کی خرابیاں گنوا رہے ہیں؟"۔ سب سے حیران کن بات یہ ان میں سے کوئی بھی اپنی اپنی "بیویوں کے ظلم" یا "بچوں کی بدتمیزیوں" یا اپنے اپنے علاقوں میں گورے امریکیوں کے ہاتھوں ہوئی "زیادتیوں" اور "Discriminatory behaviour" کی باتیں نہیں کرتا۔ آج اکے اپنے ملک کی برائیاں۔ !وہی نیویارک جہاں سیمینار کیا جائے تو ناز کیا جاتا ہے کہ پاکستان جیسے ملک میں تو بوڑھے لوگوں۔ بوڑھے ماں باپ کے رہنے کے لئے کوئی old peoples homes نہیں ہیں۔ وہاں کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔ یہاں دیکھئے۔ جب بوڑھے ہوئے ایک گھر تیار۔ جہاں آپ۔ اپنے جیسے کئی بوڑھوں۔ اور بڑھیاؤں کے ساتھ زندگی کے آخری ایام بہت سہولت سے گذار سکتے ہیں۔ پاکستان کے لوگ کریں بھی کیا۔ وہ تو بچارے ابھی غربت کے مسائل سے نہیں نکل پائے۔ اپنے elders کا کیا خیال کریں گے۔؟

اُسی سیمینار میں کوئی سر پھرا پاکستانی۔ اپنے ملک کی محبت میں ڈوبا ہوا۔ اُٹھتا ہے اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جاتا ہے۔ "ہمارے ہاں ایسے گھر واقعی نہیں ہیں جہاں حکومت بوڑھے لوگوں کو۔ ایک سسٹم کے تحت۔ آخری دن گذار سکنے کی سہولت فراہم کریں۔ لیکن ذرا

رکیئے۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ ایسا کیوں ہے؟ کیا حکومت کے پاس پیسے نہیں یا اچھی پلاننگ کی کمی ہے۔؟ نہیں۔ دونوں میں سے کوئی بھی وجہ نہیں۔ بات حقیقت میں یہ ہے کہ پاکستان میں بوڑھے شخص کو اپنے پاس۔ رکھنے والا کوئی بیٹا۔ کوئی بیٹی۔ بھتیجا۔ بھانجا۔ بھائی۔ بہن۔ اور کچھ نہیں تو دور کے رشتہ دار۔ ہوتے ہیں۔ بوڑھی ماں تو گھر کی رونق ہوتی ہے۔ وہ دادی یا نانی بن کر مرنے تک راج کرتی ہے۔ پوچھیں گھر کی کسی بہو کو۔ کہ اُس کا شوہر فیصلہ کرنے سے پہلے کس کے پاس جاتا ہے؟ دوسری طرف بوڑھا باپ۔ وہ تو مرنے سے کچھ لمحے پہلے بھی اپنے بچوں کو سیدھا راستہ دکھا رہا ہوتا ہے۔ اور تابعدار بچے۔ نہائت غور سے سمجھ رہے ہوتے ہیں۔ اور پھر دادا جان یا نانا جان کو سننے کے لئے پوتے۔ نواسے۔ پوتیاں۔ نواسیاں۔ بستر کے چاروں طرف کھڑے نظر آتے ہیں۔ "دادا جان۔ پانی لاؤں آپ کے لئے"۔ اب آپ خود بتایئے۔ کہ نرسنگ ہومز۔ اولڈ پیپلز ہومز۔ بن بھی گئے۔ تو وہاں رہے گا کون۔! ہاں۔ چند استثنائی حالات ضرور ہونگے۔ جہاں کسی بوڑھے شخص کو بدلحاظ اولا دملی۔ اور اُسکا بڑھاپا خراب ہوا۔ مگر ایسے واقعات کم کم ہیں۔ تو امریکہ میں آئے پاکستانی بھائی۔ یہ وجہ ہے کہ آپ کے ہاں ایسے بوڑھے زدہ گھر ہوتے ہیں اور ہمارے ہاں اِن بوڑھوں کو "بزرگ" کہا جاتا ہے۔ جن کی عزت کی جاتی ہے۔ انہیں بھلا اپنے بچوں کے گھر سے کہیں اور جانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔!

وہی نیویارک۔ جہاں سے پانچ بڑے بڑے سوٹ کیس۔ تحفوں سے بھر کے۔ جب کوئی پاکستانی۔ کسی شادی میں شرکت کے لئے پاکستان آتا ہے تو۔ گھر والوں کی آنکھیں کُھلی کی کُھلی رہ جاتی ہیں۔ نوجوان دل ہی دل میں فیصلہ کر لیتے ہیں۔ کہ ایسی شان تو بس امریکہ میں ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ اُنہیں کیا معلوم۔ کہ یہ شخص دن رات محنت کرتا ہے۔ اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے کام کرتا ہے۔ ہفتہ اتوار کو پارٹ ٹائم نوکری کرتا ہے۔ اپنے تمام گھر والوں کے سارے اخراجات اٹھاتا ہے۔ اور بدلے میں اُسے زہریلی مسکراہٹ اور ذلت کے تھپیڑ۔ اُسکی اپنی بیوی۔ اپنے بچے مارتے ہیں۔ یہ سوٹ کیس۔ اِن میں بھرے تحفے۔ کیا بتا سکتے ہیں کہ اِس شخص کے دل پر ہر روز۔ شام کو گھر آئے ہوئے کیا خیال آتا ہے "یہ بھی کوئی زندگی ہے"۔ اور ظلم یہ کہ وہ یہ دکھ کسی کے گلے لگ کے رو بھی نہیں سکتا۔ اب اُسکی باقی زندگی صرف اور صرف "بھرم" رکھنے میں گذرے گی۔ بچوں کی بدتمیزیوں کا بھرم۔ نیک پروین بیوی کے بیڈروم اور گھر کے دوسرے کمروں میں کئے گئے مظالم کا

بھرم ۔ باتھ روم کا کموڈ خود صاف کرنے کا بھرم ۔ کچن کے نلکے کی واشل خریدنے اور خود ہی بدلنے کا بھرم ۔ ایک مکمل جعلی زندگی گذارنے اور پھر پلاسٹک سائلز دینے والے اِس شخص سے صرف ھمدردی کی جاسکتی ہے ۔ جو ۔ اب نہ ادھر کا ہے ۔ اور نہ ۔ اُدھر کا ۔ ! ایسی حالت میں وہ اپنے وطن عزیز میں برائیاں نکال کر ۔ گند اچھال کر ۔ اپنے آپ کو مزید ذلّت کا شکار کرتا ہے ۔ چاروں طرف کے جعلی پن نے اُس سے ۔ اُسکا بچپن ۔ لڑکپن ۔ اور اپنے ماں باپ کے سکھائے اصول ۔ سب چھین لئے ہوتے ہیں ۔ ورنہ ابھی ابھی تو وہ یونیورسٹی میں ایک ہونہار طالبعلم تھا ۔ اور وطن کی محبت میں بسے اُس ماحول میں ۔ خوبصورت تقریریں کیا کرتا تھا ۔ "اگر ماں کو کوڑھ نکل آئے ۔ باپ کو لقوئ ہو جائے ۔ تو کیا ہم انہیں گھر سے باہر پھینک دیتے ہیں ۔ کیا ہوا اگر ہمارے دیس کو اس وقت پریشانیوں اور مصیبتوں نے گھیرا ہے ۔ کیا دیس کو لگی کوئی بیماری اس قابل ہے کہ جسکی وجہ سے ہم اپنے دیس ہی کو بُرا بھلا کہیں ۔ یہ تو اپنی ذات کی نفی ہے ۔ اپنی ذات کی" ۔ !

دنیا کے چند بڑے شہروں میں سے ایک ۔ وہی نیویارک ۔ جہاں زندگی کو مزید سمجھنے اور صحیح طرح برتنے ۔ کے لئے ۔ کچھ پاکستانیوں نے ایک ادبی تنظیم بنا رکھی تھی ۔ جس میں عارف کے علاوہ پندرہ بیس اور بھی تھے ۔ جو نئی لکھی نظم، غزل یا کسی تازہ افسانے پر باقاعدہ تنقیدی نشستیں کرتے تھے ۔ اتنی مصروف زندگی ۔ اتنا کام ۔ اور پھر تنقیدی نشست کے لیے سب کام چھوڑ چھاڑ کے ۔ بیوی سے بہانہ کر کے ۔ ٹریفک سے تنگ ہوتے ہوئے ۔ ان سب کا تین ماہ میں ایک مرتبہ ۔ چند گھنٹوں کے لئے مل بیٹھنا ۔ اتنی تیز رفتار زندگی میں ۔ یقیناً ایک انوکھی بات تھی ۔ اب دیکھئے نا ۔ اس ادبی وشعری محفل میں کسی کے مارگیج دینے کی شرح کم ہوگی نہ ہی تنخواہ میں اضافہ کی کوئی سبیل نکلے گی ۔ دنیا ۔ گھر ۔ بیوی ۔ بچے ۔ نوکری ۔ کاروبار ۔ اس محفل میں بظاہر کسی بھی ٹھوس مسئلے کا حل نکلنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی ۔ فقط ایک لگن ۔ فقط ایک لگاؤ ۔ جو ان چند خواتین وحضرات کو کہیں نہ کہیں سے لا کے اکٹھا کر دیتا تھا ۔ ایک بات ان سب میں مشترک تھی ۔ سب شعروادب کو زندگی کے لئے ضروری سمجھتے تھے ۔ اور کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے ۔ اس محفل میں اپنا نیا افسانہ ۔ تازہ نظم یا غزل ۔ یا پھر حالات حاضرہ پر کوئی مضمون ۔ سُنا کر دلوں اور روحوں کا کچھ بوجھ ہلکا کیا جاتا تھا ۔ اُس دن عارف نے نشست کے دو حصے کرنے کی تجویز پیش کی ۔ جو ایک کے علاوہ سب نے مان لی ۔ ایک نے نہ کرنی ہی ہوتی ہے ۔ ابوجہل آخر دم تک مسلمان نہ ہو سکا تھا ۔ ! کسی ایک کے ٹھوس انکار سے

بھی۔ کسی اصول یا ضابطہء حیات کے سچ ہونے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔!

پہلے حصے میں پاکستانی شعروادب پر گفتگو اور دوسرے میں۔ ولید کی تین نظمیں۔ جو سدرہ نے پچھلے ماہ عارف کو ای میل کے ذریعے بھجوائی تھیں۔ پڑھ کر سنائی جائیں گی۔ اور چونکہ شاعر خود موجود نہیں تھا۔ لہٰذا تبصرہ نہیں ہو سکے گا۔ عارف۔ اپنے گم شدہ دوست کا ذکر کر کے۔ اُسکی نظمیں ساتھیوں کو سُنا کر۔ اپنے دل کا کوئی بوجھ ہلکا کرنا چاہتا تھا۔

پاکستانی شعروادب پر عارف کی گہری نظر تھی۔ وہ امریکہ آنے کے بعد بھی۔ وہ تمام رسالے۔ جو وہ پاکستان میں پڑھتا تھا۔ یہاں منگوا کر مطالعہ کرتا۔

آج کی غزلیں اور نظمیں۔ جو پاکستان کے مختلف شہروں۔ قصبوں اور دیہاتوں میں۔ لکھی اور پڑھی جا رہی ہیں۔ اُن کو پڑھنے کے بعد اپنے اُس خواب پر یقین مضبوط ہوتا نظر آتا ہے۔ جو حالات کی منڈیر پر آگہی کے پرندوں کا منتظر ہے۔ خواب زندہ ہے۔ یہ کافی نہیں ہے۔ لیکن اتنا بھی بہت ہے کہ ہم لوگ خواب دیکھ رہے ہیں۔ خواب انتظار کی طرح ہوتا ہے۔ حدوں سے ماورا۔ ایک تسلسل۔ دیکھنے اور محسوس کرنے والوں کے لئے ایک جزیرہ۔ جہاں پہنچنے اور کچھ دیر ستا لینے کو جی چاہتا ہے۔ شعر اور شاعری نے مسائل کا پورا حل کبھی نہیں دیا۔ ان کا کام کچھ اور ہے۔ شاعر۔ ادیب۔ مسائل کی گوندھ سمجھتا ہے۔ حل کر طرف اشارہ کرتا ہے۔ احساس کی شدت اتنی بھڑکیلی ہوتی ہے۔ جی چاہتا ہے اپنے ہاتھوں سے۔ اس دھوئیں کے منظر میں جا کر۔ ایک ہرا بھرا شجر جوڑ دیا جائے۔ ایسا ممکن نہیں ہے۔ اور پھر اسی نقطے سے بے چارگی کا بیج لفظوں میں۔ شعروں میں در آتا ہے۔ ہم اُسے سینچتے ہیں۔ کیاریوں کو دھوپ اتنی ہی دیتے ہیں جتنی پودے کی ضرورت ہوتی ہے۔ پانی کی ایک خاص مقدار۔ اور پھر خوابوں کی کھاد۔ یوں شعر اپنی تکمیل کی طرف بڑھتا ہے۔ یا نظم شروع ہوتی ہے۔

پسند اور ناپسند پر کبھی بحث نہیں ہو سکتی۔ مجھے پیلا رنگ اچھا لگتا ہے۔ اور میں یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ کیوں۔؟ بس اچھا لگتا ہے۔ شاعر اور ادیب۔ چھوٹے یا بڑے نہیں ہوتے۔ معیاری ادب تخلیق کرنے والوں میں کوئی چھوٹا بڑا نہیں ہوتا۔ بات پسند یا ناپسند کی ہے۔ غالب اور میر میں کون بڑا ہے؟ ریاض خیرآبادی اور مومن میں کون بڑا ہے؟ پابلو نرودا بڑا شاعر تھا یا کیٹس؟ نظیر اکبر آبادی یا ورڈز ورتھ گارسیا مارکیز۔ دستوئے یا وسکی۔ میلان کنڈیرا۔؟ میکسم گورکی۔ یا سمرسٹ

ماہم۔؟امیر خسرو یا شیکسپیئر۔! تقابل کا ایک جہان ہوگا۔اور ہم ہوں گے۔نقادوں کی ایک فہرست ہو گی۔اور آخر میں بات پسند۔ناپسند پر آ کے رکے گی۔

ایک غلط روّیہ کہیں سے ادب میں آ گیا ہے۔کچھ لوگ کہتے ہیں کہ پاکستان میں اتنے شاعر پیدا ہو رہے ہیں کہ خبر رکھنی مشکل ہے۔اور پھر سب ایک جیسے اشعار تخلیق کر رہے ہیں۔یہ ادبی سُستی کا نتیجہ ہے یا معصوم سی کم علمی کا۔کہ سب کو پڑھ لینے۔اور پورا پڑھ لینے سے پہلے ہی یہ فیصلہ سنا دیا جائے۔اور بات پسند یا ناپسند تک پہنچ ہی نہ سکے۔میرے خیال میں زیادہ نہیں۔بہت کم لکھا جا رہا ہے۔اور معیاری بھی۔چند نوٹ چھاپنے والی مشینوں کے مانند شاعروں کو چھوڑ کر۔جو ہر پندرہ دن بعد اپنی نئی " کاوش" کی تقریب رونمائی سجا کر۔مقبولیت کی آخری حدوں کو چھو رہے ہیں۔میرے ملک میں بہت معیاری ادب تخلیق ہو رہا ہے۔آپ سرکاری درباری ماحول سے باہر نکلیں تو آپ کو پتہ لگے۔!

چند ایک جگہ۔کچھ جانے پہچانے ادیب و شاعر۔اپنی نادانستگی میں وہ باتیں لکھ جاتے ہیں جو کسی برٹرنڈرسل۔کسی ایشلے بری نُسنت کسی سیموئیل سمتھ یا کسی مارک لوئن نے۔پہلے کر دی ہوتی ہیں۔رابرٹ فراسٹ کو پڑھنا ضروری نہیں۔لیکن اگر پڑھ لیا جائے تو کوئی مضائقہ بھی نہیں۔!ہاں۔فراسٹ کی طرح کا لکھنا۔یا رابرٹ فراسٹ ہو جانا۔ذرا معیوب سا خواب ہے۔چارسدہ سے سکردو۔ساہیوال سے ملتان۔پھر سیالکوٹ سے کوئٹہ۔کراچی سے پشاور۔مجھ سے آبِ گُم۔یا حب سے شیخوپورہ۔لاہور تک۔مناظر کا ایک ڈھیر ہے۔کہانیوں کا ایک انبار ہے۔داستانوں کا ایک انبوہ ہے۔جو ہمارے فنکاروں کو " مقامی" رہنے اور " مقامی" بننے کی دعوتِ عام دے رہا ہے۔

مجھے معلوم ہے میری بات ذرا لمبی ہو گئی۔ابھی تو ایک نئے شاعر کی نظمیں بھی ہم نے سننی ہیں۔بس آخری بات۔!

اردو شعر کا اپنا ایک مسئلہ ہے۔چونکہ پوری طرح واضح کبھی کبھی ہوتا ہے۔اپنی شکلیں۔حالات کے آئینوں میں بدلتا رہتا ہے۔اس لئے اس کے رخ۔ہر بار پڑھنے پر۔بدلے بدلے سے نظر آتے ہیں۔یہ اردو شعر کی ایک اساسی خوبی ہے۔لیکن یہ ایک عجیب سی بات ہے کہ ایک شعر۔کسی شاعر کے ساتھ منسوب ہو تو کچھ اضافی پہلو یا تو کہیں سے خود در آتے ہیں۔یا پھر پڑھنے

CamScanner

والے کچھ نئے لباس خود پہنا دیتے ہیں۔ " شیکسپیر۔ بلھے شاہ۔ اقبال۔ غالب نے کہا ہے۔ واہ کیا بات ہے۔ "۔! اب اگر غالب کا یہ مشہور شعر۔ گودھ پور مُرادپور کے کسی ساجد حسین بھٹہ کے نام سے سامنے آئے تو کتنے "لوگ" توجہ دیں گے۔

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے

آخر اس درد کی دوا کیا ہے

ہماری اسی شعری نشست میں۔ بھٹہ صاحب یہ شعر سنا کر۔ اور پھر اس پر ہوئی تنقید سُن کر۔ اگر شاعری سے متوب نہ ہوئے تو کم از کم ہماری محفل میں کبھی دوبارہ نہ آنے کی قسم تو ضرور کھالیں گے۔! ادبی دیانت داری۔ معیاری ادب کے لئے بہت ضروری ہے۔! دوستو۔ میں آج کی نشست میں اتنا سارا وقت لینے پر معذرت چاہتے ہوئے.....

" نہیں عارف میاں۔ بولو۔ ہم ہمہ تن گوش ہیں۔ اسی طرح کی گفتگو ہی تو اب سننے کو نہیں ملتی۔ کیا زمانے تھے۔ وہ پچھلے زمانے۔ " یہ آواز محفل میں بیٹھے ایک بزرگ شاعر کی تھی۔

" جی شکریہ۔ لیکن وقت کی قلت کے باعث۔ اپنے دوست کی۔ تین کی بجائے۔ دو نظمیں ہی سناؤں گا۔ کل ویسے بھی working day ہے "۔ ولید نے اپنے سامنے پڑے فائل فولڈر سے کچھ کاغذ نکالتے ہوئے کہا پہلی نظم کا عنوان ہے: "یقین کرو"

اگر میں نفرت کو

حقیقت میں بدل سکا

تو میں تم سے نفرت کروں گا

پھر تمہارے سینے سے

تمام بے ترتیب سانسیں

ایک ترتیب سے

کھینچ کر۔۔۔۔۔نکال کر

خلا برد کر دوں گا

تم نے میرے بچوں کے

کتابوں جیسے خواب چھین کر
ان کے ہاتھوں میں
بارود اور نشہ تھما دیا ہے۔!!

نظم ختم ہوئی تو ایک خاتون کی آواز آئی۔ "صاف ہے۔ بالکل صاف نظم ہے۔ حیرانی کی بات ہے کہ یہ شاعر کی پہلی پہلی نظموں میں سے ہے۔ لہجہ تو بہت شفاف اور مضبوط ہے"۔ عارف نے دوسری نظم سنانے کے لئے۔ اجازت طلب کی۔ اُس نے خاتون کی بات کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔

شاعر نے اِس نظم کا عنوان دیا ہے "لفظوں کے بادشاہ"۔ سنئیے گا۔!

چہرے بدل گئے
نظام بدل گئے
دستور بگڑ گئے
سلطنت وہی ہے!

بارہ دریاں نہ رہیں
باندیاں نہ رہیں
حرم سرا نہ رہے
بادشاہ وہی ہے

گڈریے کی بانسری سے لے چھن گئی
کھلیانوں میں پرائی خوشبوئیں بس گئیں
منڈیروں کے دیئے ہوا ہو گئے
وعدہ وہی ہے!

CamScanner

سکولوں میں کتابوں کے نصاب بدل گئے
وردیوں کے رنگ بدل گئے
افسروں کے عہدے بدل گئے
انتظار وہی ہے

سلطنت' بادشاہ' وعدہ' انتظار!
لفظوں کے بادشاہ کو
رعایا کی مستقل مزاجی مبارک ہو!!

نظمیں سنا کر۔ عارف نے سب کو اِن کی فوٹو کاپیاں دیں۔ اور دعوتِ عام دی کہ اِن پر تبصرہ۔ وہ۔ ای میل کے ذریعے اُسے بھجوا سکتے ہیں جو شاعر کو پہنچا دیا جائے گا۔

گاڑی میں بیٹھ کر واپس گھر آتے ہوئے اُسے ولید کی کہی ہوئے آخری باتوں میں سے ایک یاد آئی۔ اور وہ گاڑی کے اندرونی اندھیرے میں ہلکا سا مسکرا دیا۔ "میری سے شادی کر لینا"۔ عارف کو اندازہ تھا کہ ولید کو عارف اور میری کا "شادی کے بغیر"۔ ایک ساتھ رہنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ اُسکی تربیت ہی اتنے مضبوط اور معتبر ہاتھوں میں ہوئی تھی۔ کہ امریکہ میں لکھ پتی بننے کے باوجود اُسے دوست کا ایک لڑکی کے ساتھ۔ بغیر شادی کے رہنا۔ مناسب نہ لگتا تھا۔

" کر لیتے ہیں شادی۔ پھر اُسی بے وفا پہ مرتے ہیں۔ پھر وہی زندگی ہماری ہے"۔ اور عارف نے ایکسیلیٹر پر پاؤں کا بوجھ بڑھا کر گاڑی کی رفتار تیز کر دی۔

ﷲﷲﷲ

◎

امرتسر میں ولید نے اُس ہاتھ دیکھنے والے کو بہت ڈھونڈا۔ جس نے ایک اتفاقیہ ملا قات میں کچھ ایسی باتیں کر دی تھیں۔ جن کے اندر چھپے سوالات ولید کو پریشان کر رہے تھے۔ پاکستان کے پنجاب اور ہندوستان کے پنجاب میں اُسے کئی چیزیں۔ کئی باتیں مشترک نظر آئیں۔ اُسکی سیالکوٹ اور لاہور کی پنجابی زبان۔ ہندوستان کے امرتسر میں سب کو سمجھ آئی۔ کہیں کہیں کچھ الفاظ ولید کو سمجھ نہ آئے۔ مگر ہر بات کی اُسے پوری سمجھ آئی۔ ہندوستان میں آئے ہیں دو ایک جگہیں دیکھ لیتے ہیں۔ خصوصاً وہ جن کی باتیں اُسکے بچپن میں ابھی بھی گونج رہی تھیں۔ بسوں اور ٹیکسیوں پر سفر کرتے ہوئے اُس نے آگرہ میں تاج محل۔ فتح پور سیکری میں حضرت سلیم چشتیؒ کا دربار۔ اور دہلی میں غالب کا مزار۔ قطب مینار دیکھنے کے بعد وہ اِس وقت امیر خسرو کے دربار میں تھا۔ اندر سے بالکل سیالکوٹ کی کسی مسجد کا ماحول۔ کچھ مجاور۔ کچھ عقیدت مند قسم کے لوگ۔ اور کچھ پیسے اکٹھے کرنے والے۔! ایک طرف کونے میں بیٹھ کر ولید نے ظہر کی نماز پڑھی۔ بڑے عرصہ کے بعد۔ ایک پُرسکون ماحول میں۔ جہاں اُس کو اور اُسکے علم وفن کو کوئی نہیں جانتا تھا۔ اُسے کچھ اطمینان سا محسوس ہوا۔ وہ دست شناس تو نہیں ملا۔ لیکن ولید کو ایک جانے پہچانے ماحول میں آکر۔ خودشناسی کی کوئی پرت ضرور ہاتھ لگی۔ اُسے بچپن سے لے کر جوانی۔ والد صاحب۔ ماں۔ بہن بھائی۔ اپنی گلیاں۔ امریکہ کا سفر۔ ذہنی اور مالی ترقی۔ جینی۔ اپنا بیٹا۔ عارف۔ اور وہ سب کچھ یاد آیا۔ جس میں وہ زندہ تھا۔ لیکن تیز رفتاری کی اڑانوں میں۔ ان سب کے نقوش دھندلے دھندلے سے ہو گئے تھے۔ اُسے اپنے ادبی اور مذہبی ماحول کے پرندوں میں واپس آنا اچھا لگا۔ یہاں اڑانیں بہت اونچی نہیں ہوتیں۔ تھک کے گر بھی جائیں تو چوٹ گہری نہیں آتی۔!

ایک عجیب سا اطمینان اُسے اِس بات کو سوچ کر بھی مل رہا تھا۔ کہ یہ اُسکی زندگی کا پہلا موقع تھا۔ جس میں۔ اُسے مکمل یقین تھا۔ کہ گھر میں اُسکا کوئی انتظار نہیں کر رہا۔ کسی دفتر۔ کسی

میٹنگ۔ کسی بنک۔ کسی سے ملنے کا کوئی امکان نہیں۔ اُسے یہ سب بہت اوپرا اوپرا سا لگا۔ علم۔ لیاقت۔ تجربہ۔ عزت۔ دولت۔ شہرت۔ دوستیاں۔

رشتہ داریاں۔ ماحول اور معاشرے کی مجبوریوں کے گرداب میں پھنسی زندگی۔! اُسے سب اوپرا اوپرا سا لگا۔ شاید یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب اصل حقیقت اپنے دروازے کھولتی ہے۔ اور دستک دینے کی ضرورت بھی پیش نہیں آتی۔ "اس دنیا میں کاش کسی بھی چیز کا کوئی نام نہ ہوتا"۔ فرانز کافکا کے ساتھ اُسے سدھارتھ۔ رسل اور شوپن ہائر بھی یاد آئے۔ پھر اُسے اپنے وقت کا امیر ترین شخص۔ اوناسس یاد آیا۔ جو اتنی دولت ہونے کے باوجود۔ اپنے بیٹے کو جوانی کی موت مرنے سے نہیں بچا سکا تھا۔ اولاد یا دولت؟ مقام یا سفر۔؟ ہجر یا وصال۔؟ اور اِس کا فیصلہ کہ سچ درحقیقت کیا ہے۔ ابھی تک نہ ہو سکا ہے۔ تو کیا ایک حقیقی جواب نہ ملنے کی شکست آدمی کو دنیا میں ہی اُلجھے رہنے پر مجبور کرتی ہے؟ اور کیا ہم شعوری طور پر اِس شکست و ریخت کے عمل سے بخوبی واقف ہیں؟ دولت اور طاقت کے گرد یہ دنیا گھما دینے والے کیا اس حقیقت سے واقف ہیں۔؟ کیا موت کے علاوہ کسی بھی حقیقت پر انسانوں کا اتفاق ہے؟ ولید کے آس پاس کچھ بنیادی سوالوں نے بساط بچھا رکھی تھی۔ اور وہ خاموش۔ اپنے خوبصورت وجود کے ساتھ۔ وقت کی کم مائیگی اور انسان کی ذہنی اور روحانی مجبوریوں کے درمیان حائل کسی نادیدہ پُل صراط سے گذر رہا تھا۔

دیکھا جائے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ سوچا جائے تو۔ سب کچھ کر لیا۔ ماں باپ۔ بہن بھائی۔ دوست۔ دولت۔ جہاز۔ شادی۔ بچہ۔ طاقت۔ حتیٰ کہ سازشیں۔ نفرتیں۔ کدورتیں۔ لالچ۔ محبت۔ حسنِ سلوک۔ کیا کیا نہیں دیکھا۔ کس کس کا تجربہ نہیں کیا۔ تو پھر یہ خالی پن کیوں ہے۔؟

"پھر یہ خالی پن کیوں ہے"۔ ولید نے زیرِ لب کہا۔ اور اُس ماحول سے باہر آتے ہوئے۔ اپنا بریف کیس اٹھایا۔ دروازے پر بیٹھے دو فقیروں کو کچھ پیسے دیئے اور جتنی دیر میں اُسے ٹیکسی نظر آئی۔ وہ پاکستان جانے کا پروگرام۔ راستہ۔ طریقۂ کار اور ایک پروگرام بنا چکا تھا۔

"کدھر جائیں گے صاب"۔ ٹیکسی والے نے پوچھا

"فی الحال تو کسی نزدیکی ہوٹل میں چلتے ہیں"۔ سُن کر ٹیکسی والے کو سمجھ آ گئی کہ یہ صاب کرایہ طے نہیں کرے گا۔ اُس نے ایک لمحے میں سوچ لیا کہ ہوٹل مہنگا ہونا چاہیے۔ اور وہ بھی ذرا

CamScanner

فاصلے پر۔
"دلّی میں لگتا ہے پہلی بار آئے ہو صاب"۔اُس نے سامان ڈکی میں رکھتے ہوئے پوچھا"دنیا میں آنے کا بھی پہلا ہی اتفاق ہے"۔ ولید نے کہا اور ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ گھنٹے بھر کی مسافت میں ٹیکسی ڈرائیور نے ولید کو ہندوستان کی سیاست سے لیکر فلموں۔اور بلیک مارکیٹ سے لیکر۔"بھائی لوگوں" کے دبدبے تک۔ بہت قصے سنائے۔اپنی محبوبہ کی بے وفائی اور اپنی غربت کا قصہ۔اُس نے نہائت تفصیل سے سنایا۔ایک بھاری ٹپ وصول کرتے ہوئے اُس نے ولید کا ہاتھ چوم کر شکریہ ادا کیا۔ایسے مسافر تو ٹیکسی والوں کی دعاؤں میں بستے ہیں۔

ﷲﷲﷲ

◎

"اکاؤنٹ کھلوانا ہے۔کیا کرنا پڑے گا"۔ولید نے سیالکوٹ کے سب سے بڑے اور معتبر بنک میں داخل ہو کر سامنے بیٹھے کلرک نما شخص سے پوچھا"شناختی کارڈ۔ایک فارم۔اور ایک ریفرنس۔اکاؤنٹ کھل سکتا ہے۔دو دن لگیں گے۔اگر آپ جلدی کھلوانا چاہتے ہیں تو"۔

"جی۔جلدی بھی اور ریفرنس کے بغیر بھی"۔ولید نے کلرک کی بات بیچ میں سے ٹوک دی۔

"کتنے روپے ہیں آپ کے پاس"۔کلرک نے ولید کے ہاتھ میں پکڑے بریف کیس کو گھورتے ہوئے پوچھا"یہی کوئی ستر۔اسی ہزار"

"اسی ہزار روپے۔جی اکاؤنٹ ابھی کھل سکتا ہے۔چائے پئیں گے آپ؟" کلرک کا لہجہ بدل چکا تھا۔

"اسی ہزار ڈالر۔یو۔ایس ڈالرز"

"جی۔؟ڈالرز۔تو۔اس کے لئے تو مینیجر صاحب کے ساتھ ملنا ضروری ہو گا۔تھوڑے بہت ڈالرز تڑوانے ہوں تو میں اچھا ریٹ دلوا سکتا ہوں"

"مینیجر سے ملوا دیجئے"۔ولید نے پچاس ڈالر کا ایک نوٹ کلرک کے پاس پڑی ایک فائل کے اندر رکھ دیا۔اس طرح کہ اُسے نظر بھی آ جائے۔

"آپ ذرا رکیئے"۔کلرک نے اُس فائل کو باقی فائلوں سے علیحدہ کیا اور اٹھتے ہوئے بولا۔

کچھ بھی نہیں بدلا۔اتنے برسوں بعد اپنے شہر آیا ہوں۔وہی سڑکیں۔وہی بازار۔وہی گلیاں۔وہی لوگ۔وہی پیسہ اور وہی پیسے کی اہمیت۔ولید کو ایسے لگا جیسے وہ ایک لمبی چھلانگ لگا کر ماضی میں واپس آ گیا ہے۔اُس نے تو ایک زمانہ دیکھ لیا۔پرکھ لیا۔لیکن اُس کے لوگ۔!اور پھر

CamScanner

اپنے لوگوں میں سے تو شائد۔ یہاں اب کوئی بھی نہ ہو۔ محلّے جا کر اُس گھر کو باہر سے ہی دیکھا۔اندر جانے کی ہمت نہ ہوئی۔خالہ تبسّم کے زندہ ہونے کی خبر اُسے گلی کے موڑ پر کریانے کی دکان والے نے دے دی۔باقی سدرہ تو کراچی میں تھی۔حمزہ اور طلحہ کا اتہ پتہ ڈھونڈنے میں ولید کو اتنی دلچسپی نہ تھی۔ عارف کو وہ امریکہ چھوڑ آیا تھا۔"اِس شہر میں اب میرا کوئی بھی نہیں ہے"۔ولید نے سوچا اور ڈالروں کی بجائے۔ پاکستانی نوٹوں سے بھرے اپنے بریف کیس کو ہاتھ میں پکڑ کے۔ ایک رکشہ روک کے۔بابل شہید قبرستان کی طرف چل پڑا۔اپنے ماں باپ کی قبروں پر پھول چڑھاتے ہوئے اور اُن کی مغفرت کی دعا مانگتے ہوئے ولید کو ایک عجیب سا سکون ملا۔ایسا سکون جو اُسے نائن الیون کی گتھی سلجھانے۔اُس چھ گھنٹے کی میٹنگ کے اصلی مقاصد کو جاننے اور کسی حتمی نتیجے پر پہنچنے سے بھی نہیں ملا تھا۔ایسا سکون جو اُسے اپنے بیٹے کو سینے سے لگا کر۔آنکھیں بند کر کے بھی نہیں ملا تھا۔ایسا سکون تو اپنی ماں کی قبر کے پاس کچی زمین پر بیٹھ کر۔خیالوں میں۔اُس کی گود میں سر رکھ کے۔آنکھیں بند کرنے سے ہی مل سکتا ہے۔

"کچھ برس آپ اور زندہ رہتیں ماں۔بس کچھ برس اور۔مَیں آپ کے چہرے پر اُن تمام خوشیوں کو دیکھنا چاہتا تھا۔جن کو اتنی قربانیوں۔اتنے دکھوں نے۔آپ سے دور کر دیا تھا۔کچھ برس کی تو بات تھی۔مَیں کچھ بھی تو نہ کر سکا آپ کے لئے۔اور ابا جان۔مَیں نے آخر کار۔ایک جہاز خرید لیا۔آپ کو شوق تھا جہاز میں بیٹھنے کا۔مَیں آپ کو اپنے جہاز میں سیر کراتا۔یا خدا۔تم نے انسان کو اتنا بے بس اور لاچار کیوں بنایا ہے۔سب کچھ مل گیا مجھے لیکن سب کچھ کھو دینے کے بعد"۔ولید نے سر سے رومال اتارا اور واپسی کے لئے۔قبرستان کے کچے اور پر خار راستے سے نکل کر۔باہر سڑک پر آیا۔ جہاں رکشے والا اُسکی واپسی کا منتظر تھا۔ہوٹل میں گنے چنے کچھ ہی لوگ تھے۔ریسیپشن پر کرسی کے کونے کو پکڑے۔ٹیلی فون کی تار میں پڑی الجھنیں اتارتا ہوا۔ہوٹل کا ملازم۔جو فون سننے۔آنے جانے والوں کا حساب کتاب کرنے۔اور کمروں سے آئی ہوئی شکایات دور کرنے پر معمور تھا۔سیالکوٹ کینٹ میں یہ چھوٹا سا ہوٹل ہی ولید کو مناسب لگا۔چیک ان کرنے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آچکا تھا۔بیگ کھول کر کچھ کپڑے الماری میں نکالے جا چکے تھے۔اور ولید کو زوروں کی بھوک لگی تھی۔زیادہ ٹھنڈے اور کم گرم پانی سے نہانے کے بعد اُس نے کپڑے بدلے اور ہوٹل کے ساتھ اُس پرانے ریسٹورانٹ میں آگیا۔جہاں وہ اور عارف۔چند مرتبہ بیٹھ کر

گپیں لگا چکے تھے۔

بغیر ٹیبل کور کی اُن میزوں کے ارد گرد سرخ رنگ کی کرسیاں تھیں۔ تین چار گاہک کھانا کھا رہے تھے۔ دو ایک نے اپنے سامنے چائے کی چینک اور پیالیاں رکھی تھیں۔

ولید نے سب چہروں کو غور سے دیکھا۔ وہ اِن چہروں سے نا آشنا تھا۔ اُسی طرح۔ جس طرح اُن لوگوں کے لئے ولید۔ جو ہلکے براؤن رنگ کے سوٹ میں۔ بالکل اجنبی تھا۔ اپنے شہر میں ایک مانوس ریسٹورانٹ میں بیٹھا خود کو بھی اجنبی لگ رہا تھا۔

ولید نے کھانے کا آرڈر دیا۔ اور جیب میں پڑے موبائل فون کو میز پر رکھ دیا۔ ویٹر نے پانی کا ایک جگ اور شیشے کا گلاس اُس کے سامنے رکھا اور ساتھ ہی موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف امریکی لہجے میں ایک کھردری سی مردانہ آواز تھی۔

"تم پہنچ گئے"

"یس"

"تمہیں سب یاد ہے نا۔؟ کسی قسم کی کوئی ذرا سی غلطی بھی بہت بڑا نقصان بن سکتی ہے"

"یاد ہے"

"نہ کوئی ای میل۔ نہ فون۔ نہ خط۔ نہ ٹیلی گرام۔ نہ زبانی پیغام۔ اور نہ ڈائری۔ اور نہ ہی کسی سے کوئی بات چیت۔ ہم سب دیکھ۔ سُن۔ اور پڑھ رہے ہوں گے۔ ٹھیک ہے؟

"میرا خیال ہے یہ سب طے کر کے ہی مَیں امریکہ سے آیا تھا۔ اچھا ہوگا۔ اگر میرا پیچھا نہ کیا جائے۔ سیل فون پر آپ مجھ سے اب رابطہ نہ کر سکیں گے۔ یہ ساتھ ہوگا تو بار بار آپ کا سبق مجھے دہرانا پڑے گا"۔

"کتنے دن اور یہاں رہنا ہے؟"

"اِس سے آپ کا کوئی لینا دینا نہیں"۔ ولید نے کہا اور ویٹر کو ہری مرچیں لانے کے لئے کہا۔ سیالکوٹ آ کر اُس کا جی چاہ رہا تھا۔ وہ سارے کرارے کھانے کھائے جو وہ لڑکپن میں مزے لے لے کر کھایا کرتا تھا۔

"اِس سے ہمارا لینا دینا رہے گا۔ تمام باتوں کا خیال رکھنا" اور بغیر خدا حافظ کہے فون بند

ہو گیا۔ ''تمام باتوں کا خیال رکھنا۔'' یہ فقرہ شائد مخصوص معنے رکھتا ہے۔ ولید کو یاد آیا کہ 25 جون کی۔ چھ گھنٹے طویل میٹنگ کے تقریباً دو ماہ بعد۔ ایک پُر اسرار سے شخص نے اُس کے گھر کے آگے روک کر۔ لگ بھگ تیس منٹ تک بہت سی باتیں کیں۔ اور جانے سے پہلے۔ ایک سیل فون ایک پیغام ''میٹنگ کے بارے اپنی زبان بند رکھنا ورنہ کاٹ دی جائے گی۔'' دینے کے بعد یہ فقرہ زور دے کر کہا تھا ''تمام باتوں کا خیال رکھنا!''

ولید نے آرام سکون سے۔ نہائت مزے سے بھنا گوشت۔ مغز اور ماش کی دال سے پیٹ بھرا۔ کڑک سی دودھ پتی چائے پی۔ اور بل سے زیادہ رقم کی ٹپ دے کر ریسٹورانٹ سے باہر نکل آیا۔

اپنے موبائل کی سم نکال کر اُس نے بے احتیاطی سے سڑک کے کنارے پھینک دی۔ موبائل۔ ہوٹل کے ریسپشنسٹ کو تحفتاً دیا اور ملک اینڈ سنز کے پاس سے خریدے اخباروں کے بنڈل کو لے کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ مغز اور ہری مرچیں۔ چائے پینے کے بعد بھی۔ ان کا ذائقہ موجود تھا۔ اردو۔ انگریزی کے وہ سارے اخبار ولید کے سامنے تھے۔ ایسے ہی جیسے۔ آنے والے دنوں کا پلان۔ اُس کے ذہن میں ترتیب سے پڑا تھا۔ تہہ در تہہ۔ لیکن ترتیب سے۔

☙☙☙

◎

سیالکوٹ کے جنوب میں۔شہر سے لگ بھگ چالیس کلو میٹر دور واقع یہ گاؤں۔ پاکستان کے ہر صوبے میں۔پھیلے ہزاروں گاؤں جیسا تھا۔کھیتی باڑی۔کسان۔صبح تین بجے سے چلتے ہوئے ہل۔دس بجے دوپہر کا کھانا۔شہر کو گاؤں سے جوڑتی ہوئی۔ایک سڑک اور پھر پگڈنڈیاں۔لہلہاتے کھیت۔یہاں گنا۔تو وہاں گندم۔چھوٹے چھوٹے زمین کے ٹکڑوں میں بٹے حصے۔جہاں ایک چوہدری کے آنکھ کے اشارے سے۔یا اُسکے منشی کے پرانے مگر موٹے سے رجسٹر کو دیکھ کر۔غربت میں زندگی بسر کرنے والے لوگ گھبرا جاتے تھے۔یا اللہ خیر۔لگتا ہے کوئی غلطی ہو گئی ہے۔! یہ گاؤں برسوں سے ایسے ہی چلا آرہا تھا۔پچھلے پانچ برسوں میں ایک مرتبہ پھر پکّی کرائی گئی گاؤں کی واحد۔حویلی۔چوہدری مراد بخش کی تھی۔جس کا بیٹا شہر میں تعلیم کرنے کے بعد سویڈن میں جا کر تعلیم حاصل کر رہا تھا۔اکا دکا گھرانوں سے بچے شہر جاتے تھے۔لیکن سلمان واحد بی۔اے پاس تھا۔جو گریجوئیشن کرنے کے بعد گاؤں واپس آیا تھا گاؤں کی قسمت بدلنے۔!

گاؤں کے بیچ میں "بازار" تھا۔جہاں شفیقا قصائی۔روزانہ "جانور" ذبح کر کے۔سہ پہر تک۔گوشت بیچ دیتا تھا۔اُسکا ہم نام شفیق دھوبی۔جسے سب شفیق ہی کہتے تھے۔اپنی بیوی بچوں کا پیٹ پال رہا تھا۔جس دن دھونے یا استری کرنے کے زیادہ کپڑے مل جاتے۔وہ خوش ہو جاتا۔اُسکی خواہش تھی کہ کسی طرح اپنی بیٹی کی شادی کرا کے وہ اپنے کچے مکان کی دیوار پکّی کرا لے۔ سکھاں رنگ والی کی "گاہکی" اُن دنوں کم ہو گئی تھی۔اُسے شکایت تھی کہ گاؤں والے اب کپڑا رنگوانے کی بجائے۔شہر جا کر۔اپنی مرضی کے رنگوں والے کپڑے خرید لاتے ہیں۔لیکن شادی بیاہ کے موقع پر اُسکا کاروبار بہر حال چلتا تھا۔

گاؤں کا واحد درزی۔فضل قینچی والا۔اپنے دو کاریگروں کے ساتھ دن رات کپڑے سیتا رہتا۔اُس نے زندگی بھر کپڑے سی سی کر دو بیٹیوں کی شادی کرائی اور ایک بیٹے کو پڑھا کے

کراچی سٹیل مل میں نوکری دلائی۔ اپنے گھر کے علاوہ اُسکے پاس ایک کمرہ کا چھوٹا سا "مکان" بھی تھا۔ جو اُس نے اپنے بیٹے اور بہو کے لئے۔ شادی کے بعد رہنے کے لئے۔ خرید رکھا تھا۔

ماسی حاجراں۔ فضل قینچی والے کی پہلی بیوی تھی۔ جو بچہ پیدا نہ کر سکنے کے سبب طلاق لینے پر "مجبور" کی گئی۔ ماسی حاجراں۔ گاؤں میں سب گھروں کے "اوپر کے کام" کروانے کے ساتھ ساتھ۔ رشتے بھی کرواتی تھی۔ گاؤں میں مشہور تھا کہ ماسی ہاجراں نے اپنی شادی کے علاوہ جتنی بھی شادیاں کروائیں۔ سب کامیاب ہوئیں۔

سُوجانائی اپنی دیگوں۔ لذیذ کھانوں اور شادیوں میں بہترین زردہ بنانے کے ساتھ ساتھ۔ اپنے گیتوں کی وجہ سے بہت مقبول تھا۔ سلمان کا خیال تھا کہ سُوجانائی اگر لاہور جا کر آڈیشن دے تو ایک مشہور گلوکار بن سکتا ہے۔ اُس کو یقین تھا کہ محمد رفیع کے گانے۔ سُوجے نائی سے زیادہ اچھے کوئی نہیں گا سکتا۔

حاجی تصدق حسین۔ چوہدری مراد بخش کے بعد۔ گاؤں کے سب سے "معتبر" شخص تھے۔ تھوڑی بہت زمین تھی۔ اور سعودی عرب میں کسی شیخ کے ہاں نوکری کرنے سے اُن کے پاس خوب پیسہ آ چکا تھا۔ انکی اکلوتی بیٹی تسکین دس جماعتیں پڑھنے کے بعد گھر میں ہی رہتی تھی۔ دو سال سے رشید پیچھے پڑا تھا کہ تسکین سے شادی ہو جائے۔ مگر ہر بار۔ تسکین انکار کر دیتی۔ اُسکا کہنا تھا کہ رشید نے صرف پانچ جماعتیں پڑھی ہیں اور اُسے کوئی شعر بھی یاد نہیں ہے۔ اس لئے وہ رشید سے شادی نہیں کر سکتی۔

گاؤں کے چھوٹے سے واحد پرائمری سکول میں پہلی سے چوتھی جماعت تک تعلیم دینے کے لئے۔ استاد پیراں وسایا۔ اور سکول کا ملازم جیدا ٹلی۔ جس کی واحد ذمہ داری یہ تھی کہ وہ تین وقت روزانہ گھنٹی بجا کر سکول کے اوقات یاد کراتا تھا۔

جیدے ٹلی والے کا باپ۔ بُورا فقیر۔ پاگل ہونے سے پہلے گاؤں کا بڑھئی تھا۔ جس کے ہاتھ کی صفائی۔ اور دماغ کے کمالات کی لوگ ابھی بھی داد دیتے تھے۔ بقول ماسی حاجرا کے۔ بُورا کھڑے درخت میں سے دو کرسیاں نکال کر سامنے لا کھڑی کرتا تھا۔ اُس کے پاگل ہونے کی اصل وجہ کسی کو معلوم نہ تھی۔ لیکن سُکھاں رنگ والی کا خیال تھا کہ اُسکی بیوی۔ رکھاں۔ جو سُکھاں کی بہن تھی۔ ایک دن چوہدری کے گھر سے رات کے وقت۔ بغیر دوپٹے کے نکل کر بھاگتی ہوئی نظر آئی

تھی۔اور اِس واقعہ کا اثر بُورے نے کچھ یوں لیا کہ اپنے حواس ہی کھو بیٹھا۔بارہ جماعتیں پاس۔ بُورا فقیر۔بلھے شاہ اور شاہ حسین کی کافیاں گانے جوگا رہ گیا۔!

بازار کے شروع میں ہی صدیق چینک والے کا ایک کھوکھا تھا۔جس کے آگے چند موڑھے' ایک چارپائی۔وہ اپنے گاہکوں کو کالی۔ہری اور کشمیری چائے پلواتا تھا۔صبح کو صدیق سفید چنے کے سالن والی ایک چھوٹی دیگ تیار کرتا۔اور ہفتے میں تین دن شہر جا کر نان چھولے بیچتا۔شام کو اپنے کھوکھے۔پر بیٹھے نوجوانوں اور بزرگوں سے گپ لگاتا۔اور چائے پلاتا۔جس میں دودھ زیادہ اور چائے کم ہوتی۔صدیق چینک والے نے نوراں کے مرنے کے بعد شادی نہ کی۔دونوں کی محبت کے گاؤں بھر میں چرچے تھے۔شادی ہونے والی تھی۔کہ ایک دن پتہ چلا کہ نوراں کو جن آ گیا ہے۔یہ اُن دنوں کی بات ہے جب چوہدری مراد بخش کا بیٹا شہر جانے اور وہاں جا کر پڑھائی کرنے کی تیاری کرر ہا تھا۔جن نوراں پر اُس دن تک چڑھا رہا جب تک نوراں گاؤں کے کنوئیں میں چھلانگ لگا کر مر نہ گئی۔صدیق نے اپنے کھوکھے کے اندر نوراں کی ایک تصویر ابھی بھی لگا رکھی تھی۔جس سے وہ سب سے چھپ کر باتیں بھی کرتا تھا۔

کھوکھے پر اکثر نوجوان جو شہر میں پڑھتے تھے۔اور چھٹیوں میں گاؤں آتے تھے۔بیٹھ کر بقول صدیق چینک والے کے۔"مشکل مشکل باتیں" کرتے تھے۔لیکن اُسے تو چائے کے بل سے غرض تھی۔لہٰذا وہ اُن نوجوانوں کی گفتگو میں زیادہ دخل نہ دیتا۔

اِسی خوبصورت سے گاؤں کی طرف آتے ہوئے ولید اور ولید کے ساتھ بیسیوں دوسرے مسافروں کی بس بیچ سڑک پر انجن بند ہونے کی وجہ سے رکی کھڑی تھی۔کچھ مسافر اپنا اپنا سامان لے کر پیدل ہی چل پڑے تھے۔کچھ بس کے باہر کھڑے ڈرائیور سے بحث کر رہے تھے۔اور کچھ آنے جانے والی بسوں کو اشارہ کر کے روکنے کی کوششوں میں تھے۔

دو گھنٹے کے صبر آزما انتظار کے بعد بھی جب بس چلنے کے قابل نہ ہوئی تو ولید نے اپنا بیگ اور بریف کیس دونوں ہاتھوں میں اٹھایا۔اور کسی دوسری بس یا سواری کے لئے انتظار کرنے لگا۔"یہ میرا ملک پاکستان ہے۔یہاں سڑک کے بیچوں بیچ۔مسافروں سے بھری بس کھڑی ہو جاتی ہے۔اور گھنٹوں بعد بھی۔کسی کو خبر نہیں ہوتی۔یہ میرا پیارا ملک پاکستان ہے"۔ولید کو ہنسی آ گئی۔ اُسے اپنی نئی بی۔ایم۔ڈبلیو یاد آئی جو وہ کسی کو ایسے ہی تحفتاً دے آیا تھا۔

ایک دوسری بس کے کنڈ کٹر نے ڈبل پیسے لینے کے بعد ولید کو لفٹ دی۔ گاؤں شروع ہونے سے پہلے والی سڑک پر پہنچ کر ولید نے اپنا سامان بس سے اتارا۔ اور سامنے پیپل کے درخت کے سائے میں کھڑے ایک تانگے کو اشارہ کر کے بلایا۔

" کہاں جاؤ گے باؤ"۔ تانگے والے نے ٹائی والے سوٹڈ بوٹڈ باؤ کو دیکھا اور اپنے چھانٹے کو بغل میں دباتے ہوئے پوچھا۔

"یہ جو سامنے گاؤں نظر آ رہا ہے۔ اس میں کوئی رہنے کی جگہ مل جائے گی"۔ ولید نے بیگ تانگے پر رکھواتے ہوئے پوچھا

رہنے کے لئے۔ تمہارا مطلب ہے پکا رہنے کے لئے کہ دو چار دن کے لئے"۔ تانگے والے نے گھوڑے کو چھانٹا مارتے ہوئے پوچھا۔

"پکا رہنے کے لئے۔ مَیں چھوٹا موٹا مکان خرید سکتا ہوں"

" گاؤں میں لوگوں کے پاس اپنے لئے رہنے کو جگہ نہیں۔ اور تم مکان خریدنے کے بات کر رہے ہو۔ چلو وہاں پہنچ کر دیکھتے ہیں"

"ذرا آہستہ چلاؤ بھئی۔ یہ تو مشکل سی سڑک لگتی ہے"

"بالکل ہی نئے ہو باؤ۔ تاجی کے تانگے جیسی سواری تمہیں گاؤں میں اور کہاں ملے گی"۔

پندرہ بیس منٹ کے تکلیف دہ سفر کے بعد۔ ولید کو گاؤں کا اتہ پتہ نظر آنا شروع ہوا۔ دل ہی دل میں تاجی کی آرام دہ سواری کی داد دیتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا۔ کہ گاؤں میں تو کوئی ہوٹل وغیرہ بھی نہیں ہوتے۔ رات کہاں گذاری جائے گی۔

"یہ سامنے کنواں ہے۔ ذرا روکنا بھائی"۔ ولید بولا

تانگے والے نے جونہی ولید کی طرف مڑ کے دیکھا۔ تو ایک اونچی آواز کے ساتھ تانگہ الٹ گیا۔ پہیے کے نیچے ایک بڑا سا پتھر آ گیا تھا۔ گھوڑا۔ تانگے سے علیحدہ ہو کے تھوڑی دور جا کر رک گیا۔ تانگے والا ایک طرف۔ اور ولید دوسری طرف۔ دونوں کو چوٹیں آئی تھیں۔ ایک کا سر سے خون بہہ رہا تھا۔ اور دوسرے کا کاندھا شدید زخمی ہوا تھا۔ تاجی تانگے والے کی آرام دہ سواری۔ حصے بخروں میں ہو کر۔ اپنے مالک اور مسافر۔ دونوں کے لئے بے کار ہو چکی تھی۔

سہ پہر کا سورج اپنی گرمی کم کرتے ہوئے۔ مغرب کی طرف رواں تھا۔ ماسی حاجراں

CamScanner

کنوئیں پر پہنچی تو اپنے سامنے دو لوگوں کو بے ہوش دیکھ کر۔ کچھ دیر کے لئے خود بھی پریشان ہو گئی۔ پانی کے چھینٹے کام آئے۔ اور کچھ دیر بعد تانگے والا۔ اپنے ٹوٹے ہوئے تانگے کے ٹکڑے اکٹھے کر رہا تھا۔ اور ساتھ کھڑے اپنے گھوڑے پر غصہ کر رہا تھا کہ اُسے وہ پتھر نظر کیوں نہیں آیا۔ دوسری طرف ولید ماسی حاجراں کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔

" آپ کا شکریہ۔ آپ نے پانی پلایا "۔ ولید نے اپنا بیگ اٹھایا۔ دوسرے ہاتھ میں بریف کیس تھاما۔ اور کھڑے ہوتے ہوئے بولا

" شکریہ کا بدا پترا۔ اور یہ خون تو ابھی بھی بہہ رہا ہے "۔ ماسی نے ولید کے کاندھے کی طرف دیکھتے ہوئے افسوس بھری آواز میں کہا

" چل کر پٹی کرالیں گے اماں "۔ ولید نے تسلی دی

" کدھر سے آئے ہو۔ کہاں جانا ہے۔ تمہارا نام کیا ہے بیٹا "

" آپ نے بیٹا کہہ دیا۔ یہی میرا نام ہے اماں۔ نام میں کیا رکھا ہے "ولید نے دل میں what's in a name دہرایا اور ماسی حاجراں کے ساتھ گاؤں کے کنوئیں سے گاؤں کے اندر داخل ہو گیا۔!

نام میں واقعی کچھ نہیں رکھا۔ اپنے بچے کا نام کسی بڑے یا معتبر تاریخی شخص کے نام سے متاثر ہو کر رکھ لینا۔ فقط اُس تاریخی شخصیت سے احترام کا رشتہ ہے۔ ورنہ حمزہ۔ جس نے موقع ہوتے ہوئے بھی۔ ماں کو اپنے پاس رکھنے پر مجبور نہ کیا۔ کیا وہ حمزہ ہے جو رسول اللہؐ کو ابو جہل کی جہالت سے بچا کے رکھتا تھا۔ جس حضرت حمزہؓ نے ابو جہل کو پٹائی کی اور اپنے بھتیجے محمد ﷺ کے بارے فضول باتیں کرنے پر سختی سے وارننگ دی۔ اُس کی نسبت سے۔ اُس کے نام سے کوئی فرق پڑتا ہوتا تو حمزہ۔ شادی کے بعد۔ گھر بار ہونے کے باوجود۔ اپنی ماں کو کسی اکیلے مکان میں رہنے نہ دیتا۔

اور طلحہ۔؟ کیا صحابی رسول حضرت طلحہؓ کی ذات کا کوئی ایک پہلو۔ یا اُس پہلو کا عشرِ عشیر بھی۔ میرے بھائی طلحہ میں تھا۔ بیوی کی باتوں میں آ کر۔ ماں کے آخری دنوں میں۔ اُس نے سیالکوٹ آنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ " خواہ مخواہ سفر پر پیسے خرچ کرنے پڑیں گے پھر ماں کے لئے کچھ تحفے تحائف۔ چھوڑ کے دیکھو۔ انہوں نے زندگی گذار لی۔ اب ہماری باری ہے "۔

فضل قینچی والے سے وہ چھوٹا سا مکان۔ ولید نے منہ مانگے دام دے کر خرید لیا۔

CamScanner

ضرورت کی کچھ چیزیں خرید کر سجا بھی لیا۔ اور فیصلہ کر لیا کہ اِس گاؤں میں جب تک رہنا ہے۔ بغیر کسی نام کے رہنا ہے۔ اُسے اِس فیصلہ پر عمل درآمد کرانے میں گاؤں والوں کی معصومیت اور سادگی نے اپنا کردار ادا کیا۔ بُورے فقیر نے ولید کو پتلون قمیض پہنے دیکھتے ہی کہا کہ "باؤ گاؤں میں نیا آیا ہے۔ سوٹڈ بوٹڈ۔ باؤ"۔ اور پھر اُس کے دل شگاف قہقے میں ولید کا نام ھمیشہ ھمیشہ کے لئے کھو گیا۔ وہ اب صرف "باؤ" تھا۔ پنجاب میں۔ اور خصوصاً۔ پنجاب کے دیہاتوں میں چھوٹی سی فیشنی داڑھی والے نوجوان کو "صوفی" اور کسی بھی نوجوان کو جو پتلون کوٹ پہنتا ہو۔ "باؤ" کہا جاتا ہے۔ یہ "بابو" کی پنجابی شکل ہے۔ "بابو" جو شہر سے وابستہ ہوتا ہے۔ پڑھا لکھا ہوتا ہے۔ اور تھوڑی بہت انگریزی بھی بولتا ہے۔ ولید کوٹ پتلون پہنتا تھا۔ اور اُسکی ہلکی داڑھی بھی تھی۔ حیرت ہے گاؤں کے کسی بھی شخص نے اُسے "صوفی" کہہ کے کبھی نہ پکارا۔ شائد اِس لئے کہ اُس خوبصورت انسان کے چہرے پر ہلکی سی داڑھی۔ اُس کے چہرے کا ہی ایک جزو لگتی تھی۔

ویسے بھی دیکھا جائے تو ولید کے نام میں گاؤں والوں کو کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ اُسکی "کہیں سے "اچانک" آمد" چونکہ گاؤں والوں کے کسی بھی کام میں رکاوٹ نہ بن رہی تھی۔ اس لئے چند ہفتوں میں ہی ولید تقریباً تمام گاؤں والوں کے دل میں گھر کر گیا۔ اُس کا مُسکرا کر پنجابی زبان بولنا۔ ادب سے گفتگو کرنا۔ بزرگوں کو بزرگوں کی طرح سے۔ نوجوانوں کو نوجوانوں کی طرح سے۔ خواتین کو خواتین کا احترام ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے۔ اور بچوں کو۔ بچوں کی زبان میں گفتگو کرنا۔ پھر سب سے بڑھ کے یہ امر کہ وہ کسی سے کچھ نہیں مانگتا تھا۔ کسی سے اُس کو کسی بھی قسم کی توقع نہ تھی۔ بلکہ وہ ہر کسی کو۔ تقریباً ہر وقت۔ مدد کرنے پر تیار ملتا تھا۔ گاؤں والوں کو یہ فرشتہ صفت باؤ"۔ بہت اچھا لگا۔ ماسی حاجراں نے تو چند گاؤں والوں کو اپنے بیس سالہ پرانے "خواب" کا قصہ بھی سنایا۔ جس میں سفید گھوڑے پر ایک بزرگ ماسی حاجراں کے پاس آتے ہیں۔ اور اپنی سفید رنگ کی پگڑی کے اندر سے ایک سرخ رنگ کا قیمتی پتھر نکال کر ماسی حاجراں کے ہاتھ میں رکھ کر کہتے ہیں۔ جا۔ اور تمام گاؤں والوں کو بتا دے۔ کہ ایک دن۔ یہاں اِس سرخ پتھر سے بھی قیمتی ایک شخص آئے گا۔ جو تم سب کا خیال کرے گا۔ تسکین کو پورا یقین تھا کہ ماسی حاجراں کے اِس خواب سے باؤ کے آنے کا کوئی تعلق نہیں۔ ماسی کو اِس طرح کے خواب۔ واقعہ رونما ہونے کے بعد یاد آتے تھے۔ کوئی ایک خواب تو ایسا ہو جس کو ماسی نے بتایا اور بعد میں وہ پورا ہوا ہو۔ تسکین کو تو

باؤ" اچھا لگ گیا تھا"۔ صرف ایک مرتبہ۔ گلی کی نکڑ پر۔ چلتے چلتے اُس کا باؤ سے اچانک سامنا ہوا تھا۔ اور اُسے اچھی طرح یاد تھا کہ اُسے دیکھتے ہی باؤ نے اپنی نظریں نیچی کر لی تھیں۔ اور سلام کیا تھا۔ اُسے باؤ کا نظریں نیچی کرنا۔ اور نہائت سلیقے سے سلام کرنا اچھا لگا۔ عورت کے پاس بہت سی اور خوبیوں کے ساتھ۔ ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اُسے کسی بھی مرد کو جانچنے کے بیسیوں گُر آتے ہیں۔ وہ اپنی حسیات سے محسوس کر کے اندازہ لگا لیتی ہے۔ ایک لمحے میں سر سے پاؤں تک کا جائزہ لے کر بتا سکتی ہے کہ مرد کے دانت صحت مند ہیں کہ نہیں۔ ہاتھوں کا سائز کیا ہے۔ جوتے پالش ہوئے ہیں کہ نہیں۔ پتلون کی کریز صحیح طور پر بٹھائی گئی ہے کہ نہیں اور پھر آواز اور الفاظ۔ عورت الفاظ سے زیادہ۔ آواز کا تجزیہ کرتی ہے۔ اسی لئے سچ کے قریب قریب پہنچنے میں سہولت محسوس کرتی ہے۔ دوسری طرف مرد۔ الفاظ پر زیادہ توجہ دیتا ہے۔

اور یوں اکثر اوقات دھوکہ کھا جاتا ہے۔ مرد آنکھیں دیکھے گا۔ بدن کے خاص اتار چڑھاؤ پر نظر رکھے گا۔ کم علمی کا یہ عالم ہے کہ کسی خوبصورت عورت سے ایک گھنٹہ ملاقات کے بعد اگر اُس سے پوچھا جائے کہ عورت کی قمیض پر پھول تھے کہ نہیں۔؟ اُسے جواب دینے میں مشکل پیش آئے گی۔ وہ تو دورانِ گفتگو۔ اپنے اور عورت کے "الفاظ" پر توجہ دیتا ہے۔ الفاظ۔ جو بسا اوقات کچھ معنی نہیں رکھتے۔ اور مصلحت اندیش ہوتے ہیں۔ الفاظ۔ جو مرد۔ اگلی ملاقاتوں میں quote کرتے ہیں۔ اور عورت ایک نظر کے اشارے سے رد کر دیتی ہے۔ عورت بھی الفاظ یاد رکھتی ہے۔ لیکن وہ جو یاد رکھنے والے ہوتے ہیں۔ "تم نے ہلکے نیلے رنگ کا لباس پہنا تھا۔ میں نے نئی نئی چڑھائی چوڑیاں تمہیں دکھائی تھیں۔ اور بیٹھے بیٹھے تم اچانک اٹھ کر کھڑے ہوئے۔ تم نے بائیں ہاتھ کو پتلون کی جیب میں ڈالا اور مجھ سے کہا۔ کہ میری ہنسی تمہیں جھرنوں کی یاد دلاتی ہے۔ یاد ہے اُس دن میں نے پیلے رنگ کا شلوار قمیض پہنا ہوا تھا۔۔۔۔" اور مرد کے فرشتوں کو بھی یاد نہیں ہوتا۔ پیلے رنگ کا لباس تو کجا۔ اُسے تو چوڑیاں بھی یاد نہیں ہوتیں۔ یہیں عورت کی آبزرویشن سے مرد مار کھا جاتا ہے۔ اور بحث کے بعد اُس کو ماننا پڑتا ہے کہ چونکہ میں نے تمہاری ہنسی کو جھرنوں سے تشبیہہ دی تھی۔ لہٰذا مجھے پتہ تھا کہ مجھے تم سے کس قدر محبت ہے۔ نتیجہ یہ کہ محبت کا اظہار کرنے میں پہل میں نے کی تھی۔! مرد عقل میں دل ڈھونڈتا ہے۔ اور عورت دل سے عقل کے کام لینا جانتی ہے۔ یہ فطری عمل ہے۔ طرفہ تماشہ یہ ہے کہ عقل۔ اپنی تمام جائز دلیلوں کے

CS CamScanner

باوجود اور حتمی نتیجوں پر پہنچنے کے باوجود۔ مطلوبہ صورتِ حال کو تشکیل دینے میں اکثر اوقات ناکام رہتی ہے۔ اور پھر تمام کتابیں۔ تمام اقوال زریں۔ بزرگوں کی کہی عقل کی تمام باتیں۔ فلسفہ۔ منطق۔ علم۔ حتیٰ کہ اپنے وجود پر شک ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اس مقام سے ایک تنہائی کا سفر شروع ہوتا ہے۔ جو ہر اس طرح کے مقام آنے پر اپنے اندر گہرائی اور اداسی کو مزید بڑھاتا ہے۔ اور پھر بار بار عقل پر مبنی کئے گئے فیصلوں کا غلط ثابت ہونا۔ پہاڑ کے دوسری طرف کی ڈھلوان پر لے آتا ہے۔ جہاں نشیب۔ گہری کھائیاں۔ بھاری پتھر۔ اور اندھیروں کا ایک نامعلوم ماحول اپنی لپیٹ میں لے کر۔ "حقیقت" کے بھرے پُرے بازاروں سے دور لے جاتا ہے۔

ولید اس سفر میں سے گذر رہا تھا۔ عقل اور حقیقت۔ منطق اور لوگوں کا سلوک۔ ماضی اور مستقبل کے درمیان حال کا پُل۔ کامیابی اور کامیابی میں چھپی ناکامیاں۔ ناکامی اور ناکامی میں پوشیدہ کامیابیاں۔ اوپری محبت۔ اور محبت کا اوپرا پن۔ دماغ کی حد۔ اور بے حد اعلیٰ دماغ۔ خواب اور خواہش کے بیچ توقعات کا خستہ پُل۔! یہ سفر ولید بالکل اکیلے طے کرنا چاہتا تھا۔ "کس کو سمجھاؤں" ۔ اور پھر " کوئی سمجھے گا بھی کہ نہیں"۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کسی کو سمجھانے کی ضرورت ہی نہیں۔ پہلے خود تو کسی بات کی "پوری" سمجھ آ جائے۔ ولید یہ بھی جانتا تھا کہ جب کوئی بات پوری سمجھ میں آ جاتی ہے تو الفاظ بے کار ہو جاتے ہیں۔ کسی کے کچھ سمجھانے کا موقع ہی نہیں ہوتا۔ نفع اور نقصان سے عاری یہ فضا۔ عشق کے آخری لمحے کی بھڑک دار روشنی کی طرح ہوتی ہے۔ جو بے آواز ہوتی ہے۔ لیکن چاروں طرف چکا چوند کر دیتی ہے۔ لوگ چھتوں' بازاروں' گلیوں' اور سڑکوں پر نکل کے دیکھتے ہیں۔ یہ روشنی کچھ عرصہ کے لئے سب کچھ اپنے حصار میں لے لیتی ہے۔ دریاؤں کا بہاؤ رک جاتا ہے۔ آسمان پر اڑنے والے پرندے کسی تصویر کی طرح وہیں جم جاتے ہیں۔ ہوا ساکت اور فضا منجمد ہو جاتی ہے۔ پرواز اور رفتار۔ اپنی سکت کھو دیتی ہیں۔ اور یہ روشنی کا بادل۔ کچھ دیر کی سہولت اور آگہی دے کر۔ ایک جھماکے سے غائب ہو جاتا ہے۔ کسی اور جگہ پر طلوع ہونے کے لئے۔ کسی اور اندھیرے کو جلا بخشنے۔ کسی اور انسان کو تھوڑا سکون۔ تھوڑی محبت۔ تھوڑا سا ساتھ دینے کے لئے۔! ولید یہ بھی جانتا تھا کہ "پوری" بات سمجھ کر۔ کشید کی ہوئی یہ روشنی۔ کبھی فنا نہیں ہوتی۔ آنکھوں سے یکدم اوجھل تو ہو جاتی ہے۔ لیکن اسے دوام حاصل ہے۔ یہ سورج کی طرح عمل پذیر ہوتی ہے۔ یہاں سے نکلی تو شام کر گئی۔ اُدھر سے طلوع ہوئی تو سحر کر گئی۔!

❦❦❦❦

◎

بچپن کا خواب تھا۔اور کچی پکی معلومات کی بنیادوں میں زندہ رہا۔ٹوٹ گیا تو کیا ہوا۔یہاں تو مصدقہ معلومات اگلے روز شک کی دلدل میں دھنسی نظر آتی ہیں۔دنیا کی سب سے بڑی طاقت۔موجودہ دور کا سب سے مضبوط ملک۔معاشی اور عسکری لحاظ سے بے مثال۔اپنے علاقے میں طاقت کی دھاک بٹھانے کے ساتھ ساتھ۔دنیا کے ہر چھوٹے بڑے ملک میں کوئی نہ کوئی۔کسی نہ کسی طریقے سے اثر پذیری۔! کچھ تو ہوگا اُس ملک میں۔کوئی ایسی خاص بات۔یا پھر چند مخصوص جزیات کا کوئی لاثانی مجموعہ۔یونہی تو امریکہ اتنے لمبے عرصہ سے خوشحال اور طاقت ور نہیں رو رہا۔وہاں کے لوگ شہروں اور کھیت کھلیانوں میں ہوں۔یا پیچیدہ لیبارٹریوں میں منہ پر سفید رنگ کے نقاب نما ماسک لگا کر مائیکروسکوپ میں اپنی دائیں آنکھ گھسیڑے سائنسدان۔سب ترقی کی طرف گامزن۔سب کو تقریباً تمام سہولیات میّسر۔اور پھر دن بدن ترقی۔کچھ تو ہوگا۔یکدم رد کرنے سے بہتر نہ ہوگا کہ ایک مرتبہ ٹھنڈے دل سے یہ سوچ اور دیکھ لیا جائے کہ وہ کونسے عوامل ہیں جو چین کو چین اور امریکہ کو امریکہ بناتے ہیں۔اور پھر اُن عوامل کی جزیات پڑھ کے۔تحقیق کر کے سچے جذبوں کے ساتھ۔لوگ اپنے اپنے ملکوں کو دیکھیں۔اور عوام کے لئے خوشحالی اور ترقی کی راہیں کھولیں۔کامیابی کے پھل باہر سے توڑ کر گھر میں سجانے کی بجائے۔کامیابی کے راستوں کو جاتی مشکل ترین سوچ کا بیج۔ایک اجتماعی تاثر ذہن میں رکھتے ہوئے۔دلوں اور دماغوں میں بو دیا جائے۔کونپلوں کی آبیاری کی جائے۔اور دیکھ بھال کے صبر آزما عمل میں خیال یہ ہو کہ پھل ہم نہیں دوسرے کھائیں گے۔پیڑ کی چھاؤں میں دوسرے بیٹھیں گے۔لگن یہی ہو۔کامیابی اجتماعی ہو۔خواب کی تکمیل کا فائدہ عوام کو ہو۔اور پھر آنے والی نسلوں کو۔ہر مرتبہ کی طرح۔الف سے شروع نہ کرنا پڑے۔سلسلہ آگے بڑھے۔ذات اور انا۔علیحدہ رکھنے پڑتے ہیں۔اِن پر سخت بوٹوں سمیت چل کر۔کچل کر۔اجتماعی سوچ کے گلاب کھلانے کا تصور جنم لے۔!اگر شارٹ کٹ ڈھونڈنا ہی ہے تو اِس عمل کے لئے ڈھونڈا جائے۔بہت سا پیسہ بنا لینا۔دنیاوی آسائش سے گھر بھر

لینا۔اپنے بچوں کو گاڑیاں اور اچھی تعلیم کے لئے باہر کے ملکوں میں بھیج کر سمجھ لینا کہ ہم نے بڑی چھلانگ لگالی۔ بڑی ترقی کر لی۔ یہ سوچ اپنے دائرہ کار کے حوالے سے بہت محدود ہے۔ ذاتی ترقی مشکل سہی۔اپنی محنت کے بل بوتے پر ملی سہی۔لیکن کامیابی اپنے اور اپنے بچوں سے باہر ہی نہ نکلی۔تو کیا فائدہ۔؟

لیکن مجھے اِن باتوں کا اُس وقت کیوں نہ پتہ چلا جب جوانی کی دہلیز پر کھڑے۔ امریکہ جانا۔خوب پیسے کمانا۔اور اُس ملک سے اپنے ملک کے لئے کچھ کامیابیاں لانا۔خواب کی صورت میں ڈھلا۔میرے سامنے ماں تھی۔ باپ تھا۔بہن بھائی تھے۔اور مَیں۔! کامیابی کا تصور محدود تھا۔ اِسی لئے اتنی چوٹ لگی۔ یہ سفر جاری رکھا جا سکتا تھا۔لیکن اپنے شہر کا سودا کرنے والے سے اپنا سودا طے نہ ہو سکا۔اُس خوبصورت ملک کے خوبصورت لوگوں میں رہتے ہوئے مَیں بھول گیا۔کہ میری جڑوں میں۔میرے خون میں۔دولت پر ہی انحصار کر کے زندگی گذار لینا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی تھا۔عہدے بدل کر بڑے ہو جاتے۔ بنک بیلنس ہزاروں گنا زیادہ ہو جاتا۔مگر مَیں رات کو نیند ڈھونڈتا رہتا۔اتنی بڑی ناانصافی دیکھ کر مَیں اُس ملک میں نہیں رہ سکتا تھا۔تحریک چلا کر۔لوگ جمع کر کے۔سیاست چمکا کر۔تقریریں کرنے کی جادوگری مجھے نہیں آتی۔مَیں تو ایک لڑکی کو اپنی محبت کے بچے نہ بتا سکا۔جمع تفریق میں طاق ہونے کے باعث گفتگو کم کی۔مجھ سے انقلاب کی توقع کیسی۔؟ زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا تھا کہ سازش کے ایک مکروہ حصے کو بے نقاب کر دیتا۔میڈیا کو بتا دیتا کہ حقیقت کیا ہے۔ اِس صورت میں زندہ بچ نکلنے کی امید کتنی تھی۔اور پھر مرنے کے بعد اگر دنیا کی کسی ہوا کا رخ نہ بدلا۔تو ایسی "بے موت"۔موت مرنے کا کیا فائدہ۔؟ عقاب۔ہُدہُد۔گِدھ۔اور کبوتر کسی امتحان میں پڑیں تو کیا ایک طرح کا جواب دیتے ہیں۔کیا چیتا۔بھیڑیا۔بندر اور لومڑی۔روّیوں میں ایک ہیں۔؟ بہت زیادہ علم۔قلم میں روانی تو لے آتا ہے۔میدان کا شیر نہیں بناتا۔مَیں اگر میدان کا شیر ہوتا تو کیا سوفٹ ویر بنا بنا کر پیسے جمع کرتا؟ مَیں تو کب کا کوئی غازی علم دین شہید بن کر تاریخ کا حصہ ہو چکا ہوتا۔میری سرشت میں شرافت،قربانی اور علم کی سوئیاں چینی طریقۂ علاج کے تحت۔اُن تمام نسوں میں لگا دی گئی تھیں۔ جہاں سچ ہوتا ہے۔اور سچ کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہوتا۔! پھر اس "سچ" کو بھی دیکھ لیا۔کیا ہوا؟ کیا ملا؟ مَیں ایک بہت بڑے سچ کو جانتا ہوں۔ پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ہاں یہ سچ

CS CamScanner

ہے۔ ثابت کر سکتا ہوں لیکن میری بات مانے گا کون۔؟ تو کیا سچ اب منوانا پڑے گا۔ مجھ جیسے بے شمار۔ ان گنت۔ کروڑوں لوگ ایسے ہیں اِس دنیا میں جنہیں کتابیں پڑھنے پر لگا دیا گیا ہے۔ کتابیں لکھنے پر لگا دیا گیا ہے۔ سچ بولنے' سننے اور تلاش کرنے پر لگا دیا گیا ہے۔ حلال کی کھانے پر۔ حلال کمانے پر۔ حلال کھلانے کے راستوں پر چلا دیا گیا ہے۔ ہمارا یقین مضبوط کرنے کے لئے دنیا اور دنیاوی راستوں میں عیب نکال کر دکھائے جاتے ہیں۔ دنیا ایک امتحان ہے۔ کہہ کر ہمیں امتحان کی تیاری میں لگا دیا جاتا ہے۔ کمرۂ امتحان میں میرے جیسے ہزاروں ہیں۔ لیکن سوچنے کی بات ہے۔ وہ جو ہزاروں دوسرے ہیں۔ جو دنیاوی ضرورتوں سے لبالب بھرے ہیں۔ اُن کو امتحان دیئے بغیر کامیابیوں کی ڈگریاں کیسے مل رہی ہیں۔؟ وہ کونسا نصاب پڑھتے ہیں؟ اُن کا سچ اور جھوٹ کے بارے میں سوچ کا زاویہ کیا ہے۔؟ دروازے پر ہلکی دستک کی آواز سُن کر ولید نے ڈائری احتیاط سے بند کی۔ اُسے تکیئے کے نیچے رکھ کر۔ اُس نے جوتے پہنے اور " آ رہا ہوں" کہتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھا۔

"ماسٹر صاحب آپ۔؟ خیریت؟" ولید نے ماسٹر پیراں وسائے کو دیکھا۔ دروازے کو باہر سے بند کر کے۔ تالا لگایا۔ اور اُن کے ساتھ ہلکے ہلکے قدموں کے ساتھ چلنے لگا۔ ولید اپنے گھر میں کسی کو بھی لے کر نہیں جاتا تھا۔ جس سے ملنا ہوتا۔ باہر ملتا۔ اُسے اپنے بارے میں کسی کو بھی بتانے کے خیال سے ہی الجھن ہوتی تھی۔

"پرسوں آپ نے سکول دیکھنے کی بات کی تھی۔ سوچا آج اتوار ہے چھٹی ہے۔ اچھا موقع ہے آپ کو سکول دکھا دیتا ہوں۔" ملیشیا کے سرمئی شلوار قمیض پر کالی ویسٹ کورٹ پہنے ماسٹر پیراں وسائے نے ولید کو دو دن پہلے ہوئی کسی بات کو یاد کرایا۔

"جی جی۔ آپ نے بہت اچھا کیا۔ چلئے۔ آپکا سکول۔ وہ سامنے والی گلی گذر کر دائیے ہاتھ پر ہے نا۔ ایک دن چلتے چلتے باہر سے دیکھا تھا"۔ ولید نے کہا

گارے۔ مٹی۔ اور گھاس پھونس کی ایک کچی چار دیواری۔ دو بغیر چھت کے کمرے۔ ایک بلیک بورڈ۔ چاک کے ٹوٹے ٹکڑے۔ ایک بوسیدہ سی کرسی۔ دو چٹائیاں۔ ایک دری۔ اور صحن میں لگے کیکر کے درخت پر لٹکتی ہوئی موٹے لوہے کی ایک پرات نما بیل۔ جس کے ساتھ ہی رسی سے لٹکا ہوا ایک جلدی میں بنایا ہوا لکڑی کا ہتھوڑا۔! یہ ماسٹر پیراں وسائے کا سکول تھا۔ پہلی سے

Mir Zaheer Abass Rustmani

CamScanner

چوتھی جماعت میں پڑھنے والے بارہ بچوں کو تعلیم کے حسن سے آراستہ کرنے والا "پرائمری سکول"۔ جس دن بارش ہو جاتی۔ تو سکول میں جبری چھٹی کرنی پڑتی۔ چھت کے نہ ہونے سے دری اور چٹایاں رول کر کے ماسٹر صاحب گھر لے جاتے۔

سکول کے مقابلے میں۔ گاؤں کی اکلوتی مسجد کی حالت ذرا بہتر تھی وہاں پکی اینٹوں سے وضو کرنے والی جگہ۔ چھت۔ اور مولوی صاحب کا حجرہ گاؤں والوں نے پیسے جمع کر کے بنوالیا تھا۔ اذان دینے کے لئے سپیکر۔ جو اذان کے بعد۔ منبر کے ساتھ بنائی چھوٹی سی الماری میں رکھ کر باہر سے تالا لگا دیا جاتا تھا۔ یہ پرانی طرز کا سپیکر جس کے ماؤتھ پیس پر سرخ ریشمی کپڑے کا غلاف۔ سنہری دھاگے سے باندھا گیا تھا۔ مسجد کی واحد قیمتی شئے تھی۔ جسے مولوی صاحب۔ انکے بیٹے اور گاؤں کے دو ایک معتبر لوگوں کے علاوہ کوئی استعمال نہ کر سکتا تھا۔ یہ سپیکر۔ اذان کے علاوہ ۔اہم اعلانات کرانے کے لئے بھی استعمال ہوتا تھا۔ کوئی بچہ گم جائے۔ کسی کا انتقال ہو جائے اور نماز جنازہ کا وقت بتانا ہو۔ گاؤں میں شادی بیاہ کے علاوہ کوئی بھی اہم بات ہو۔ مسجد میں "اعلان" کرانے کے لئے یہی سپیکر استعمال ہوتا تھا۔

سکول کی نسبت۔ مسجد میں درس لینے والے بچوں کی تعداد زیادہ تھی۔ کم از کم بیس بچوں کے ماں باپ سمجھتے تھے کہ سکول کی تعلیم سے قرانی تعلیم۔ حفظِ قرآن۔ اور نمازی راستہ زیادہ بہتر ہے۔ وہ اپنے بچوں کو خالص مسلمان بنانا چاہتے تھے۔ جو نماز پڑھتا ہے۔ روزہ رکھتا ہے۔ تلاوتِ کلام پاک پڑھتا ہے۔ اور گلی سے نظریں نیچی کر کے گذرتا ہے۔ اِن والدین کو۔ اپنے بزرگوں کی کہی باتیں یاد تھیں کہ سکول کی تعلیم۔ مغرب کی تعلیم کی طرف لے جاتی ہے۔ بچے مذہب سے دور ہو جاتے ہیں۔ ماں باپ سے سوال جواب کرتے ہیں۔ گاؤں کی بجائے شہروں میں جا کر گوری میموں کے پیچھے گھومتے ہیں اور آخرِ کار کسی کام کے نہیں رہتے۔ ایسے بچے۔ نوجوان چھوٹی چھوٹی داڑھیوں اور سر پر پرنے باندھ کر۔ گاؤں میں ہی رہتے ہیں اور اپنے والدین کے کام میں ہاتھ بٹاتے ہیں۔ یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ اور رفتہ رفتہ سکول کے بچوں کی تعداد۔ درس لینے والے بچوں کی تعداد سے کہیں کم ہو جاتی ہے۔

معاف کیجئے گا۔ مَیں آپ کو بیٹھنے کے لئے نہیں کہہ سکتا۔ آپ پہلی مرتبہ سکول آئے ہیں۔ اور میرے پاس صرف ایک کرسی ہے۔ اگر آپ۔۔۔۔۔" ماسٹر صاحب بولتے بولتے

اچانک رکے۔ انہیں خیال ہی نہیں رہا کہ "باؤ" تو باہر صحن میں کھڑا چاروں طرف دیکھ رہا ہے اور وہ کمرے میں اکیلے کھڑے اپنے آپ سے باتیں کر رہے ہیں۔

"آپ یہاں ہیں۔ اور میں"۔ ماسٹر صاحب اب ولید کے پاس صحن میں آ گئے تھے۔

"جی۔! یہ بتایئے کہ سکول کی یہ زمین کس کی ہے۔ اگر اس کو کچھ ٹھیک ٹھاک کرنا ہو تو۔" ولید نے ذہن میں صحن کی لمبائی چوڑائی کا اندازہ لگاتے ہوئے پوچھا

"زمین تو ساری اللہ کی ہے جناب۔ لیکن میں آپ کا سوال سمجھ گیا ہوں۔ تقریباً بیس برس پہلے بڑے چوہدری صاحب نے یہ زمین میرے والد صاحب کو دے دی تھی۔ کہ یہاں سکول بناؤ۔ یوں سمجھیں یہ زمین۔ میری ہے۔ یا گاؤں والوں کی ہے۔ یا۔"

ماسٹر صاحب سے اس طرح کا سوال کسی نے پہلی مرتبہ کیا تھا۔

"گاؤں میں مزدور۔ کل تعداد میں کتنے ہوں گے۔ جو سیمنٹ اور اینٹوں کا کام جانتے ہیں"

"وہ گاؤں میں تھوڑی کام کرتے ہیں۔ وہ تو تڑکے ہی شہر چلے جاتے ہیں اور رات گئے واپس آتے ہیں۔ ہوں گے کوئی تیس چالیس"

"بہت ہیں۔ اور یہ بتایئے کہ اس سکول کی حالت کچھ بہتر کرنے کے لئے کتنے لوگ آگے آئیں گے۔ اندازاً"

"کچھ کہہ نہیں سکتا۔ ویسے میں اور میرے دونوں بیٹے حاضر ہیں"

"کوئی ٹھیکیدار قسم کا آدمی بھی ہے گاؤں میں۔ جو بتائے گئے نقشے کے مطابق تعمیر کا سامان خرید سکے۔ مزدوروں کو کام پر لگا سکے۔ اور تقریباً چھ ماہ تک کام مکمل کرا دے"۔

"نیکی کا کام ہے باؤ جی۔ کوئی بھی کر لے گا۔ ویسے چوہدری صاحب سے بات کر کے اکرم کو راضی کیا جا سکتا ہے۔ اکرم ہی چوہدری صاحب کے مکان کی دیکھ بھال کرتا ہے"

"اور چوہدری صاحب سے کب اور کیسے ملا جا سکتا ہے"

"پرسوں شہر سے لوٹیں گے تو ملاقات ہو سکتی ہے۔ میں خود بتاؤں گا۔ بلکہ آپ میرے ساتھ چلیں"

"کتابیں۔ کاپیاں۔ اور دوسری سٹیشنری وغیرہ کا انتظام کیسے ہوتا ہے"

CamScanner

"ہر کلاس کی دو کتابیں ہیں۔ جو میرے پاس ہوتی ہیں۔ سٹیشنری سکول میں نہیں ہے۔ تختۂ سیاہ پر ہی لکھ لکھ کر پڑھاتا ہوں۔ بچے اپنی کاپیاں خود لاتے ہیں۔ پنسلیں بھی۔ اور تختیاں بھی"

"ماسٹر صاحب۔ آپ اِس گاؤں میں بہت عرصہ سے رہ رہے ہیں۔ یہ بتایئے کہ اگر سکول کی عمارت بن جائے۔ کتابیں اور سٹیشنری مفت ملے۔ کوئی فیس نہ ہو۔ اور تین چار استاد بھی ہوں۔ دسویں جماعت تک کلاسیں ہوں۔ کرسیاں۔ میز۔ اور باقی سہولیات بھی ہوں تو گاؤں کے کتنے لوگ اپنے بچوں کو پڑھائی کے لئے بھیجیں گے"۔

"یعنی شہر والے سکول کی طرح۔؟"

"اُس سے بھی بہتر"

"کچھ کہہ نہیں سکتا۔ لیکن کچھ تو تعداد ضرور بڑھے گی۔ مفت تعلیم کسے اچھی نہیں لگے گی جناب"

"ایسا ہو سکتا ہے کہ گاؤں کے لوگوں کو کسی ایک جگہ اکٹھا کیا جا سکے۔ اور آپ اُن سب کی رائے لیں۔ نئے سکول کے بارے میں"۔

"سپیکر پر اعلان کرانا پڑے گا۔ دو ایک دن میں لوگ اکٹھے ہو سکتے ہیں۔ فٹ بال کے میدان میں"

"اور ہاں۔ اُس میدان کی بات بھی آپ کیجئے گا۔ اُسے پکا کرواتے ہیں۔ اور والی بال۔ باسکٹ بال کے لئے بھی کچھ کریں گے"

"یہ سب کچھ کرنے کے لئے تو بہت سارا روپیہ چاہیئے ہوگا"

"وہ بھی آ جائے گا۔ آپ اُسکی فکر نہ لگائیں۔ یہاں پر کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں کڑک۔ سٹرانگ چائے ملتی ہو"۔ ولید نے ماسٹر صاحب سے سکول کے احاطے سے باہر نکلتے ہوئے پوچھا

"کیوں نہیں جناب۔ چلئے مَیں لے چلتا ہوں"۔ اور دونوں صدیق چینک والے کے کھوکھے کی طرف چلنے لگے۔ جہاں اگلی بے شمار اتواریں ولید نے کڑک چائے پی کر گذارنی تھیں۔ کتنی مزے کی بات ہے۔ نہ پارکنگ کے مسائل۔ نہ کوئی سگنل۔ نہ پولیس والا۔ نہ ٹریفک۔ کسی اپائنٹمنٹ کی ضرورت نہ ٹیلی فون کرنے کی زحمت۔ لوگ اِس گاؤں میں۔ انسانوں کی طرح زندگی گزار رہے ہیں۔ جو ایک دوسرے کو جاننا چاہتے ہیں۔ جانتے ہیں۔ دکھ سکھ میں

CamScanner

شریک۔ سادہ اور خوبصورت لوگ۔ تازہ ہوا۔ بچپن صفحے کا اخبار نہ ڈاک میں آئے بے شمال پمفلٹ۔ ایک دوسرے کی برائی نہ ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کا لالچی سفر۔ پلاسٹک سائل نہ "ڈوڈراپ اِن سم ٹائم" کے تکلفات۔ ولید صدیق چینک والے کی داستان سُن رہا تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ یہ گاؤں اور اس میں رہنے والے لوگ کتنے پرسکون ہیں۔ سازشوں سے عاری۔ اپنی بنیادی ضروریات کو پورا کرنے کی کوششوں میں جُتے یہ پیارے لوگ۔ جن کی خواہشات اور زندگی بھر کے خواب۔ ولید اپنے قلم اور چیک بُک سے ایک منٹ میں پورے کر سکتا تھا۔ اُسے اپنا آپ کافی ہلکا پھلکا محسوس ہوا۔ ایسے جیسے سارا دن کام کے بعد۔ جم میں ایک گھنٹہ کی ورزش کے بعد نہائیں تو کچھ دیر کے لئے سب اچھا لگتا ہے۔ جیسے دس سال پرانی اچکن اتارنے سے پہلے۔ فنکشن ختم ہونے کے بعد۔ بٹن کھولتے ہوئے محسوس ہوتا ہے۔ یا جیسے کسی پارٹی کے لئے خریدے گئے۔ مہنگے ترین جوتے۔ جو تین گھنٹے آپ کے پاؤں کاٹتے ہیں۔ انہیں گھر میں داخل ہوتے ہی اتار کر دور پھینکنے کے بعد محسوس ہوتا ہے۔ سکون۔۔!!

☆☆☆☆

◎

چاردیواری پکی اینٹوں سے تیار ہو چکی تھی۔ دو کمرے تقریباً مکمل ہو چکے تھے۔ صحن میں سیمنٹ، اینٹیں، پتھر، ریت اور تعمیر کرنے کے مختلف اوزار بکھرے تھے۔ چھ مزدوروں نے اُس "بڑے اکٹھ" میں ماسٹر صاحب اور باؤ کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ باقی کے چار چند روز بعد آن ملے۔ یوں دس مزدوروں اور ایک ٹھیکیدار نے گاؤں کے سکول کو "سکول" کی عمارت میں بدلنے کی حامی بھر لی۔ ماسٹر صاحب کے کہنے پر ٹھیکیدار نے شہر سے سامان لانا شروع کر دیا۔ ولید بغیر حساب کئے پیسے دیتا جا رہا تھا۔ اُس نے ساری زندگی ریاضی کا علم استعمال کر کے شائد یہ سیکھ لیا تھا کہ نیکی کے کاموں میں حساب نہیں چلتا۔ اعتبار اور اعتماد سے کام لینا چاہیئے۔ تقریباً ہر روز ولید اپنے ضروری کاموں سے فارغ ہو کر سکول کی طرف آ جاتا۔ گھنٹوں ماسٹر صاحب کے ساتھ بیٹھ کر کچے سکول کو پکے سکول میں بدلتے دیکھتا۔ ماسٹر صاحب کے پاس ہر وقت سوال ہوتے۔ جن کا سیر حاصل جواب ولید سے پا کر وہ ہر بار ولید کی لیاقت اور علم کی تعریف کرتے ہوئے کہتے۔ "اللہ بخشے آپ کے والدین کو۔ کیسی اعلیٰ تربیت کی ہے انہوں نے اپنے بیٹے کی"۔ اور یوں ولید کا حاصل کیا ہوا سارا علم اُسکے والدین کی جھولی میں آ گرتا۔ اِس بات کا بُرا نہ مناتا۔ بلکہ ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہتا "سب ماں باپ اپنے بچوں کی تربیت درست طور پر کرتے ہیں۔ کبھی کبھی علم کی کمی یا بچوں کی نافرمانی کے باعث۔ تربیت میں خامیاں رہ جاتی ہیں۔ کچھ بھی ہو بچوں کو ماں باپ سے ھمیشہ عزت واحترام سے پیش آنا چاہیئے"۔

ماسٹر صاحب کے ایک سوال پر اُس دن دوپہر سے شام اور شام سے رات ہو گئی۔ ولید بولتا رہا۔ ماسٹر صاحب سنتے رہے۔ اور دونوں کو وقت گذرنے کا احساس نہ رہا۔ مزدور کب کے جا چکے تھے۔ مسجد کے سپیکر سے عشاء کی اذان ہو رہی تھی۔ اور ولید بول رہا تھا۔

"تاریخ کو جھٹلانا۔ کم عقلی اور ناسمجھی ہے۔ انا کو بیچ میں نہیں لانا چاہیئے۔ جو حقیقت ہے

اُسے حقیقت تسلیم کر لینے میں ہی عافیت ہے۔ ورنہ سوالوں جوابوں میں خواہ مخواہ الجھنا پڑتا ہے۔ اور کچھ دیر بعد سمجھ نہیں آتا کہ اصلی سوال کیا تھا۔؟

دنیا کے تین بڑے مذاہب۔ بدھ ازم، جین ازم اور سناتار ادھرم۔ پرانے ہندوستان میں جنم لیتے ہیں۔ یہ عرب میں اسلام آنے سے بہت پہلے کی بات ہے۔ اور ہاں یہ سناتار ادھرم موجودہ زبان میں ہندو ازم کہلاتا ہے۔ موئنجو داڑو اور ہڑپہ۔ موجودہ پاکستان میں ہیں۔ لیکن یہ انڈس ویلی سوی لائیزیشن۔ پرانے ہندوستان میں ہی جنم لیتی ہے۔ کچھ برسوں تک یہ خیال کیا جاتا رہا ہے کہ یہاں آریا لوگ سنٹرل ایشیا سے آئے۔ 1980 کی دہائی میں ہونے والی تحقیق نے ثابت کر دیا ہے کہ آریا دراصل یہیں کے مقامی باشندے تھے۔ اور انڈس ویلی میں جو بھی کمالات نظر آتے ہیں۔ انہی کی بدولت تھے۔ میرے نبیؐ نے فرمایا علم حاصل کرو چاہے اِسکے لئے تمہیں چین ہی کیوں نہ جانا پڑے "۔ ہندو مذہبی روایات کی بنیاد "وید" پر ہے۔ اور وید کا ایک مطلب "علم" بھی ہے۔ ترائی وید، رگ وید، سم وید، آتھر و وید۔ سب منتروں پر مشتمل ہیں۔ وید کے پہلے منتر اُس وقت ترتیب دیئے گئے جب آریا شمال مغربی ہندوستان میں تھے۔ بعد میں یہ سلسلہ گنگا اور جمنا کے دوآبے کی طرف منتقل ہو گیا۔ والد صاحب نے بچپن میں بتایا تھا کہ پُرش نے اپنی قربانی دی اور ہندو خداؤں نے اُسکے وجود سے جنم لیا۔ برہمن نے سر سے جنم لیا۔ کھشتری نے بازوؤں سے۔ ویش نے ٹانگوں سے اور شودر نے پیروں سے۔! برہمن سفید رنگ، کھشتری سرخ رنگ، ویش پیلا اور شودر کالا۔ یہ تصورات ہندو ازم اچھی طرح جاننے والوں کو پتہ ہے کہ کس سیاق و سباق میں وجود میں آئے۔ دوسری طرف میرے نبیؐ نے فیصلہ سنا دیا کہ کسی گورے کو کالے پر اور کالے کو گورے پر فوقیت نہیں ہے۔ سب برابر ہیں۔ عملِ صالح کرنے والوں کا مقام اونچا ہے۔

جی ماسٹر صاحب۔ گوتم بدھ برہمن نہیں تھا۔ وہ کھشتری تھا۔ اور وہ چالیس نہیں تقریباً انتیس سال کی عمر میں اپنے محل سے نکل آیا تھا۔ وہ شیخوپورہ میں نہیں۔ پٹنہ کے جنوب میں۔ بہار کے علاقے میں اپنی عبادات کیا کرتا تھا۔ وہ بعد میں مسلمان نہیں ہو گیا تھا۔ اِسلئے کہ اسلام گوتم بدھ کے اِس دنیا میں آنے۔ اُسکا نروان حاصل کرنے۔ چار زریں اصول دینے۔ اور اُسکے اِس دنیا سے چلے جانے کے بعد آیا۔ وہ کپل وستو میں 563 قبل مسیح میں پیدا ہوا تھا۔ یعنی یہ حضرت عیسیٰ کے پیدا ہونے سے بھی ساڑھے پانچ سو سال پہلے کی بات ہے۔ وردھاس مہاویر بھی لگ بھگ

CS CamScanner

انہی برسوں میں پیدا ہوا۔ یہ بھی پٹنہ بہار کا قصہ ہے۔ اور مہاویر تقریباً تیس سال کی عمر میں اپنا آرام و آسائش چھوڑ کر گنگا کی وادی میں گم ہو گیا تھا۔ اُسے بیالیس سال کی عمر میں "جی نا"۔ یعنی "فاتح" کا خطاب ملا۔ جو ظاہر کرتا ہے کہ گوتم بدھ کی طرح اُسے بھی نروان کی روشنی مل گئی تھی۔ بتا تا چلوں کہ اہمسا (ahimsa) کا تصور۔ ہندو ازم میں کافی مدت کے بعد شامل ہوا۔ اور ....."

"لیکن باؤ۔ مَیں نے تو سوال کچھ اور کیا تھا۔ آپ کی اکثر باتیں تو میری سمجھ سے اوپر کی ہیں۔ مَیں تو صرف یہ جاننا چاہتا ہوں ہمارے اسلام میں دوسرے مذاہب کو پڑھنے اور سمجھنے کی کتنی اور کس حد تک اجازت ہے۔ اور مہاتما بدھ کی شیخو پورہ والی بات تو مجھے آپ جیسے ایک باؤ نے شہر میں بتائی تھی"۔ ماسٹر صاحب کے چہرے پر شرمساری اور تھکن۔ دونوں عیاں تھیں "بچوں کو بھی کسی سوال کا جواب دینا ہو تو کوشش کرنی چاہیئے کہ سیاق و سباق کے حوالے سے۔ تحقیق کے ترازو میں تول کر ہو۔ اور آپ کے ہاتھ میں تو چھوٹے بچوں کا مستقبل ہے۔ اگر چھوٹی عمر میں دماغ میں ذرا سا غلط تصور بھی بٹھا دیا جائے تو ساری عمر جھوٹ پر گذرتی ہے۔ اگر آپ اجازت دیں گے تو آپ کے ساتھ پہلی سے دسویں جماعت کے سارے بچوں کو۔ تاریخ۔ اسلامیات اور انگریزی میں پڑھاؤں گا"۔

"بصد شوق جناب۔ آپکا اپنا سکول ہے۔ اور پھر آپ سے زیادہ علم والا تو شہروں میں نہیں ملے گا۔ گاؤں کا تو نصیب جاگ اٹھا ہے۔ آپ کے یہاں آنے سے"

"گاؤں کا نہیں۔ میرا نصیب جاگ اٹھا ہے۔ یہاں آ کر۔ اِس گاؤں کا شکریہ جس نے مجھے۔ مجھ سے ملا دیا ہے"

"مجھے۔ مجھ سے ملا دیا ہے۔ جی مجھے کچھ سمجھ نہیں آئی"

"رہنے دیں اِسے۔ آپ کے سوال کی طرف آتے ہیں۔ ہمارا ایمان اللہ کی ذات پر۔ اپنے نبیؐ کی ذات پر۔ قرآن پاک پر۔ آخرت پر۔ فرشتوں پر۔ الہامی کتابوں پر۔ اپنے نبیؐ کے آخری نبی ہونے پر۔ مضبوط ہونا چاہیئے۔ یہ بہت ضروری ہے۔ باقی دوسرے مذاہب کو پڑھنا۔ تقابلی جائزہ لینا۔ علمی رویہ ہے۔ علم سے گریز نہیں کرنا چاہیئے۔ میری آنکھیں اگر خوبصورت ہیں تو مجھے اس امر پر بھروسہ ہونا چاہیئے۔ دوسروں کی آنکھوں میں خامیاں نہیں نکالنی چاہئیں۔ ہر ماں کو اپنا بچہ خوبصورت لگتا ہے۔ اور کسی کو یہ اختیار نہیں کہ وہ صرف اپنے بچے کو خوبصورت ثابت

CS CamScanner

کرنے کے لئے دوسرے تمام بچوں کو بدشکل قرار دے دے۔ میرے نبیؐ سارے عالموں کے لئے رحمت بن کر آئے تھے۔ سارے عالموں پر۔ سارے جہانوں پر۔ سب دنیاؤں پر۔ صرف یہی عالم اور دنیا نہیں۔ سب جہانوں کے لئے"۔

" آپ "میرے نبیؐ" کہتے ہیں تو میرے دل سے آپکے لئے دعائیں نکلتی ہیں۔ باؤ جی۔ اس میں کتنا احترام۔ کتنی اپنائیت۔ کتنا پیار ہے۔ آپ کو نبی پاک ﷺ سے بہت پیار ہے۔؟ ماسٹر صاحب کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"پیار۔؟ میں اس قابل کہاں کہ اپنے نبیؐ سے پیار کا دعویٰ کر سکوں۔ اُن کی ذات۔ شخصیت۔ مقام۔ مرتبہ۔ تعلیم۔ حُسن۔ اللہ سے نسبت۔ یہ سب کچھ میری بساط اور علم کے دائرے سے باہر ہے۔ اُن کے غلاموں میں کہیں جگہ مل جائے تو بہت خوش قسمتی ہوگی۔ "میرے نبیؐ" کہہ کر والدہ محترمہ بات کرتی تھیں۔ ساتھ ہی اپنا دوپٹہ سر پر درست کرتی تھیں۔ اور اپنے نبیؐ کا نام آتے ہی اُن کی آنکھیں ایک عجیب احترام سے بند ہو جاتی تھیں۔ ماں نے کہا۔ بیٹے نے سیکھ لیا ہوگا۔ وہ میرے ہی نہیں۔ ہم سب کے نبیؐ ہیں"

"باؤ جی ایک بات بتائیں۔ آپ نے تو دنیا دیکھی ہے۔ یہ ساری مصیبتیں مسلمانوں پر ہی کیوں اتر رہی ہیں۔ کہاں پر خامی رہ گئی ہے"

"اِس سوال اور اِس طرح کے سوالوں سے پیچھا چھڑا کر ہی تو میں یہاں آیا ہوں۔ اب یہاں بھی اِن سوالوں کا سامنا کرنا پڑے گا"۔

" آپ بُرا مان گئے جناب۔ معافی چاہتا ہوں۔ اصل میں آپ سے بے تکلف گفتگو ہوتی ہے۔ حد سے آگے نکلنے کی معافی....."

"معافی نہ مانگیئے۔ آپ کے سوال میں کوئی خرابی نہیں۔ میرے جواب سے خرابی پیدا ہونے کی امید ضرور ہے۔ لہٰذا میرا اِس موضوع پر چپ رہنا ہی بہتر ہے۔ ماسٹر صاحب۔ آسان سوالوں کے جواب دینا ہی مشکل ہوتا ہے۔ مشکل سوال حل کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن یہ آسان سوال ہی ہوتے ہیں۔ جنہیں ہم آسان سمجھ کر۔ مناسب حد تک کوشش نہیں کرتے۔ اور یوں آسان سوال۔ ایک وقت آتا ہے۔ مشکل سوالوں میں بدل جاتے ہیں۔ آپ مجھے بتایئے۔ آسان سی بات ہے کہ مجھے سگریٹ چھوڑ دینی چاہیئے۔ لیکن جانتے ہوئے بھی کہ اِس سے اپنی۔ دوسروں کی۔

CS CamScanner

اور ماحول کی صحت پر برا اثر پڑتا ہے۔ میں بچے جا رہا ہوں۔ آسان سی بات ہے کہ کسی نے محنت کی اور اپنی لیاقت کے بل بوتے پر کچھ حاصل کر لیا۔ لیکن دیکھ لیجئے۔ ہزاروں ہیں جو محنت نہیں کرتے۔ اُن کے پاس لیاقت بھی نہیں۔ لیکن..... چھوڑیئے ماسٹر صاحب۔ میرا خیال ہے آج کافی باتیں ہو گئیں۔ یہ بھی تو ایک آسان سی بات ہے کہ مجھے اور آپ کو بھوک لگی ہے۔ اور ہمیں اب اپنے اپنے گھروں کی طرف جانا چاہیئے"

"حق ہے۔ باؤ جی۔ بالکل حق ہے۔ آپ علم کا سمندر ہیں۔ اور یہ آسان سی بات نہیں ہے" ماسٹر صاحب نے کہا اور ولید مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ دونوں نے اپنے اپنے گھر کی طرف جاتے ہوئے سکول کی تعمیر کے بارے میں کچھ باتیں کیں اور ایک دوسرے کا شکریہ ادا کر کے رخصت ہوئے۔ مسجد کے سپیکر پر بعداز نمازِ عشا۔ اعلان ہو رہا تھا کہ عید الاضحیٰ پر قربانی کی کھالیں مسجد میں جمع کرا کے ثوابِ دارین حاصل کیا جائے۔ گاؤں کے لوگوں کے پاس تین وقت کا کھانا میسر ہو یا نہ ہو۔ وہ قربانی ضرور کرتے تھے۔ بکرا یا دنبہ نہ خرید سکیں۔ تو کسی گائے کی قربانی میں حصہ ڈال لیتے تھے۔ انہیں رسمِ ابراہیمی سے لگاؤ بھی تھا۔ اور دوسرے لوگوں کو بتانا بھی ضروری تھا کہ ہم قربانی کر سکتے ہیں۔ پکے مسلمان ہیں۔ اور سیدھے راستے پر چل رہے ہیں۔ جورا فقیر اس موقع پر خوب قہقہے لگاتا۔ "بچوں کو کھانا کھلاؤ۔ یہی قربانی ہے۔ اپنے ہمسائے کا خیال کرو۔ یہی قربانی ہے۔ دوسروں کو معاف کر دو۔ اصل قربانی یہ ہے"۔ اور گاؤں کے اکثر لوگ اُسے پاگل کہہ کر خاموش ہو جاتے۔ اور پھر پاگلوں سے بحث کون کرے۔ یہاں تو سمجھدار لوگ بات نہیں سمجھتے.....!!

ﷲﷲﷲﷲ

CamScanner

◎

صُغراں کو دو ہفتوں سے جن چڑھا ہوا تھا۔ بال بکھرائے۔ بازوؤں کو ہوا میں لہراتی ہوئی۔ وہ کئی مرتبہ اپنے گھر سے باہر کی طرف بھاگی۔ ماں پیچھے پیچھے اونچی آواز میں دلاسے دیتی ہوئی۔ "شہر گیا ہے سائیں اللہ واں والا۔ آ جائے تو پتر اس جن سے نمٹیں گے"۔ گاؤں والوں کے لئے کسی لڑکی پر جن آ جانا۔ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ لہٰذا ایک خبر کے طور پر صغراں کے جن والا واقعہ سنا گیا۔ ولید کے لئے یہ خبر سوائے حیرانی کے کچھ نہ لائی۔ کیا لوگ ابھی بھی جنوں اور بھوتوں کی کہانیوں میں پھنسے ہیں۔ ڈاکٹر یا ماہرِ نفسیات کا کام سائیں اللہ واں والا کرے گا۔ جو سننے میں آیا تھا کہ لڑکی کو اپنے ساتھ۔ کمرے میں اکیلے رکھ کے۔ اُس کا جن نکالتا تھا۔ "سب کے سامنے کیوں نہیں"۔ ولید کو اس طرح کے کسی "جن" کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ بچپن میں کسی دوسرے تیسرے محلّے سے اس طرح کی کوئی خبر آتی تھی۔ اور بچپن میں اس طرح کی باتوں کا کوئی اثر نہیں لیتا۔ اُسے اندازہ تھا کہ شہر سے کسی سائیکالوجسٹ کو گاؤں میں بلوانا۔ ماں کو علاج پر راضی کرنا۔ اور گاؤں والوں کی باتوں کا جواب دینا۔ بہت مشکل ہوگا۔ چلو۔ ایک کوشش خود کر کے دیکھتے ہیں۔ شائد کوئی افاقہ ہو جائے۔!

شفیقے قصائی کی بیوی نے مدد کرنے کی حامی بھری۔ اور ولید صغراں کی ماں۔ سکھاں رنگ والی سے ملنے گیا۔

"کیا کرو گے باؤ جی۔ کبھی کسی لڑکی پر آیا جن نکالا ہے تم نے" سکھاں نے اپنے سینے پر دوپٹہ ٹھیک کرتے ہوئے پوچھا "میرا نہیں خیال یہ کوئی جن ہے ماں جی۔ اگر تو کوئی جن ہے تو آپ کسی بھی علاج کا نہ سوچئے۔ لیکن اگر یہ جن نہیں ہے تو میرے خیال میں علاج ممکن ہے۔ مجھے بس تھوڑی دیر اپنی بیٹی سے ملنے دیں"

"باؤ بڑا شریف آدمی ہے سکھاں۔ خدا ترس بھی ہے۔ مدد کرنا چاہتا ہے۔ ورنہ آج کل

CamScanner

کے زمانے میں کون کسی کی مدد کرتا ہے۔ وہ بھی بغیر کسی وجہ کے "۔ شفیقے قصائی کی بیوی بولی

" تم بھی لڑکی کے کمرے میں اکیلے جا کر بات کرو گے باؤ "سُکھاں تقریباً راضی ہو چکی تھی۔

" جی نہیں۔ آپ اسی چار پائی پر بیٹھیں۔ مَیں اور آپکی بیٹی وہ۔ کونے میں پڑی چار پائی پر بیٹھ کر بات کریں گے "۔ ولید نے کہا

" صغراں۔ وے صغراں پُتر۔ باہر آ بچہ۔ آ میرا بچہ۔ باہر آ "۔ سُکھاں نے اپنی بیٹی کو آواز دی۔ جو کچھ دیر بعد سہمی سہمی۔ گھبرائی گھبرائی۔ بغیر دوپٹے کے۔ اپنے کمرے سے صحن میں آکر۔ نظریں نیچے کیئے۔ آکر کھڑی ہو گئی۔

تقریباً آدھے گھنٹے کی گفتگو میں ولید کو صغراں نے وہ سب کچھ بتا دیا جو اُسے معلوم کرنا تھا۔ اُسے پتہ لگا کہ صغراں کا منگیتر۔ پچھلے پانچ سال سے۔ شادی کا وعدہ کر کے شہر گیا ہوا ہے۔ اور اُس کا کوئی خط بھی نہیں آیا۔ ماں کسی اور جگہ رشتہ کی بات نہیں چلاتی۔ کہتی ہے جس سے منگنی ہوئی ہے شادی بھی اُسی سے ہو گی۔ گاؤں کے نوجوان لڑکوں کو چونکہ پتہ ہے کہ صغراں کی منگنی ہو چکی ہے۔ اسلیئے وہ صغراں کو "زیادہ غور سے" نہیں دیکھتے۔ "پانچ سال"۔ ولید کو صغراں پر آئے "جن" کا ہلکا سا تعارف ہوا۔ مزید پوچھنے پر پتہ لگا کہ صغراں کو گاؤں کا ایک لڑکا اچھا لگتا ہے۔ لیکن وہ ماں کے ڈر سے صغراں کو ملنے نہیں آتا۔

" تو یہ بال بکھرائے۔ باہر کی طرف بھاگنا۔؟ کیا جان بوجھ کر کرتی ہو"۔ ولید نے پوچھا

" نئیں باؤ جی۔ میرے اندر کوئی جن ہے۔ اچانک۔ بے قابو ہو جاتی ہوں۔ اپنے بس میں نہیں رہتی"۔

" اگر اُس لڑکے سے شادی ہو گئی تو تمہارے خیال میں یہ جن اسی طرح تمہارے اندر رہے گا؟"

" مجھے کیا پتہ۔ یہ تو سائیں اللہ والا ہی جانتا ہوگا۔ اُسے جنوں کی زبان آتی ہے"

" کتنی عمر ہے تمہاری صغراں۔؟"

" پچھلے سال ستائیس کی ہوئی تھی باؤ جی۔ تو اب اٹھائیس کی ہونے والی ہوں گی"۔

CamScanner

گفتگو ختم کر کے۔ شفیقے قصائی' اُسکی بیوی اور سکھاں سے ولید نے کافی دیر بات کی۔ سمجھانے کی کوشش کی کہ کوئی جن وِن نہیں۔ تنہائی۔ بیالوجی۔ ہسٹیریا۔ انتظار۔ اور اسی طرح کے کچھ اور تصورات کو آسان زبان میں۔ محتاط الفاظ استعمال کر کے۔ اُس نے سکھاں کو مشورہ دیا کہ صغراں کی جلد سے جلد شادی کرادو۔ اگر دو دن میں صغراں ٹھیک نہ ہوئی تو ساری ذمہ داری اُس پر ڈال دی جائے۔

"لے۔ وکھینا ذرا۔ اگر شادی ہوگئی۔ اور جن نہ نکلا۔ تو فیر۔ باؤ ذمہ داری کیسی۔؟" سکھاں کو جن اور شادی میں کوئی تعلق نظر نہیں آ رہا تھا۔

"ویسے بھی عمر خاصی ہوگئی ہے صغراں کی۔ شادی کرا ہی دو سکھاں۔ باقی اللہ مالک ہے"۔ شفیقے نے لقمہ دیا

دس دن کے بعد ایک سادہ سی شادی کی رسم منعقد ہوئی۔ اور صغراں کی رخصتی کے ساتھ ہی صغراں پر آئے "جن" کی رخصتی بھی ہوگئی۔ ولید کو شک تھا کہ صغراں نے جن کا ڈرامہ خود رچایا ہے۔ لیکن اُسے صغراں کے ٹھیک ہو جانے کی خوشی زیادہ تھی۔ سکھاں سارے گاؤں میں باؤ کے گن گا رہی تھی۔ ہر ایک کو اس "اللہ والے "فرشتہ صفت انسان کے " کمالات "بتا رہی تھی۔

اُسے سب سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ سائیں اُلاں والے کو پیسے نہیں دینے پڑے اور یہ کہ باؤ نے اکیلے کمرے میں لڑکی کا جن نہ نکالا۔ بلکہ "میرے بالکل سامنے۔ میری اکھاں دے سامنے "اُس جن کو رخصت کیا۔ نہ دھوئیں کی دھونی دی گئی۔ نہ ڈھول بجائے گئے۔ نہ رقص ہوا۔ اور نہ ہی "جن" سے اونچی آواز میں بات چیت ہوئی۔ بغیر پیسوں کے۔ اور بغیر اتنے سارے لوازمات کے۔ گاؤں کی تاریخ میں یہ پہلا "جن" تھا۔ جو نہائت شرافت سے "جہاں سے آیا تھا۔ وہیں واپس چلا گیا"۔ یوں "باؤ" کا تعارف ساتھ والے گاؤں میں بھی ہُوا۔ اور ولید نے گاؤں والوں سے اب جن نکالنے کی "فیس" لینی شروع کر دی۔ ایک جن نکلوائیں اور ایک بچے کو سکول بھیجیں۔ یوں ساتھ والے دو تین گاؤں میں سے جنوں کا کوچ شروع ہو گیا اور ماسٹر پیراں وسائے کا سکول بچوں سے بھرنے لگا۔ وہ سکول۔ جس میں اب پہلی جماعت سے دسویں جماعت کے چھیالیس بچے پڑھ رہے تھے۔ نئی کتابیں۔ نئی کاپیاں۔ پکے کمرے۔ فلش سسٹم والا باتھ روم۔ جو ولید نے اپنے چھوٹے سے گھر میں بھی بنوالیا تھا۔ اور شہر سے آئے ہوئے

Mir Zaheer Abass Rustmani

CS CamScanner

چار استاد۔ جو شہر سے زیادہ۔ گاؤں میں آکر کمارہے تھے۔ ولید نے شہر میں دی جانے والی تنخواہوں کو دو سے ضرب دے کر استاد بلوائے تھے۔

صبح آٹھ بجے سے دوپہر تین بجے تک۔ پیر سے ہفتہ۔ چھ دن۔ ولید۔ باقی ماسٹر حضرات کے ساتھ۔ ان بچوں کی تعلیم و تربیت میں جت گیا تھا۔ پہلے سال نتیجہ کوئی اتنا اچھا نہ نکلا۔ لیکن دوسرے اور تیسرے سال۔ سب بچے پاس ہونے شروع ہو گئے۔ ایک دو نے ولید کی توقعات سے بڑھ کر نتیجہ دکھایا۔ جنہیں یونیورسٹی تک پڑھانے کا۔ اور وہ بھی بالکل مفت۔ ولید نے اُن کے ماں باپ سے وعدہ کرلیا تھا

"ہر امتحان میں اوّل آیا۔ ہر کسی سے زیادہ نمبر لئے۔ ریکارڈ توڑے۔ نئے ریکارڈ بنائے۔ اخبار میں تصویر چھپی۔ لیکن اتنی خوشی نہ ہوئی۔ جتنی ظہیر کے آٹھویں جماعت میں وظیفہ لگنے کی ہوئی ہے۔ ایسا لگا جیسے وظیفہ ظہیر کو نہیں۔ مجھے ملا ہے۔ صبح چار بجے یہ بچہ اپنے گاؤں سے پیدل چلتا ہوا۔ اِس گاؤں کے سکول آتا ہے۔ اِسی طرح تین گھنٹے روزانہ پیدل چل کر واپس جاتا ہے۔ کوئی چھٹی نہیں کرتا۔ اتوار کو کبھی کبھار مجھ سے آکر کچھ سوالوں کے جواب بھی لیتا ہے۔ جینی۔ تم ظہیر کو دیکھتیں تو بہت خوش ہوتیں۔ ہمارا بیٹا تو شوفر ڈرون کار میں سکول جاتا ہے۔ اُسکے لئے تو دو ٹیوٹرز گھر آکے پڑھاتے ہیں۔ اُسکا امتحان میں فرسٹ آنا۔ سمجھ میں آتا ہے۔ سینی ٹوریم میں میری آخری بات کل ہوئی تھی۔ تم بہت بہادر ہو۔ مجھے پورا یقین ہے کہ تم ڈاکٹروں کی ہدایت پر پورا عمل کرو گی۔ اور پھر تم میرے یہاں آنے اور یہیں رہ جانے پر ناراض بھی نہیں ہو۔ یہ تمہارا مجھ پر احسان ہے۔ ماں کے بعد۔ تم دوسرا انسان ہو۔ جو مجھے سمجھتا ہے۔ اپنے آپ کو اِس مختصر سی فہرست میں شامل نہیں کر رہا۔ یوں کہ مجھے اپنا۔ پورا پتہ۔ ابھی نہیں لگا۔ تم بہت اچھی ہو۔ ڈیانا تمہارا خیال رکھتی ہے۔ مجھے خبر ہے۔ اُسے بھی ای میل بھیجوں گا۔ اُس کے سال بھر کا ایڈوانس پچھلے ہفتہ اُس کے بنک میں ٹرانسفر کرا دیا تھا۔

لو بھئی۔ شدید بارش شروع ہو گئی ہے۔ امریکہ کی طرح یہاں بارش چھتوں پر نہیں ہوتی۔ لگتا ہے اپنے سروں پر ہو رہی ہے۔ کھڑکیاں دروازے بلتے ہیں۔ چھت پر ایسے جیسے چار پانچ بچے بیس بال کھیلتے سنائی دیتے ہیں۔ لیکن یہ بارش مجھے امریکہ کی بارش سے اچھی لگتی ہے۔ وہاں تو کھڑکی کے شیشوں پر اسے صرف گرتے۔ اور قطروں کو لکیریں بنتے دیکھتے تھے۔ یہاں

بارش پورے وجود کے ساتھ محسوس کی جا سکتی ہے۔

اس سے پہلے کہ باہر کا دروازہ بار بار کھل اور بند ہو کے ہوا سے اکھڑ جائے۔تم سے اجازت لیتا ہوں۔اپنا خیال رکھنا۔تمہارا ولید"

لیپ ٹاپ بند کر کے۔ولید نے جلدی سے دروازہ مضبوطی سے بند کیا۔اور سگریٹ سُلگا کر۔نیند آنے کا انتظار کرنے لگا۔

ꕥꕥꕥ

CamScanner

◎
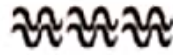
بحث اُس وقت زوروں پر تھی جب ولید وہاں پہنچا۔ شہر سے آیا ہوا ایک اخباری نمائندہ معلومات کرنے آیا تھا۔ اپنے فوٹو گرافر کے ساتھ۔ کہ گاؤں کے سکول میں پڑھتے ہوئے ایک بچے نے نمایاں کامیابی حاصل کی۔ یہ سکول کیسا ہے۔ یہاں تعلیم دینے والوں کی تعلیمی قابلیت کیسی ہے۔ سکول میں سب کچھ مفت کیسے اور کیوں ہے۔ کون ہے جو اخراجات چلاتا ہے۔ اور اِسی طرح کے مختلف النوع سوالات ہو رہے تھے۔ اور چائے خانے والے کا کاروبار خوب چل رہا تھا۔ ایک چائے کی چینک اترتی تو پھر چولہے پر چڑھنے میں زیادہ دیر نہ لگتی۔ گاؤں میں آئے ہوئے اور گاؤں میں رہتے ہوئے کچھ نوجوانوں کو یہ چائے خانہ راس تھا۔ فنون لطیفہ سے لے کر سیاست اور معاشیات پر گفتگو ہوتی۔ اور بحث ایک موضوع سے دوسرے موضوع پر چھلانگیں لگاتی۔ کبھی کسی نتیجہ پر پہنچتی اور کبھی کسی تعلیمی یا ادبی تخنی کا باعث بنتی۔ ولید اِن بحثوں کو خاموشی سے سنتا۔ موقع مناسب جان کر اپنی رائے دے دیتا۔ اور سننے والے اسکی رائے کا احترام کرتے وہ دلیل کے ساتھ بات کرتا تھا۔ مشکل ہوتا اُسکی بات رد کرنا۔ پھر وہ صلح جو تھا۔ دو لوگوں کی گفتگو میں سے مشترکہ باتیں نکال کر سامنے لاتا۔ اور کوشش یہی ہوتی کہ علم بڑھے۔ خیر بڑھے۔ آپس میں محبت قائم رہے۔ ولید کی رائے کا سب کو انتظار رہتا۔ کسی وجہ سے سب یہی سوچتے کہ ولید نے اُن کے حق میں بات کی ہے۔ سب سے انوکھی بات یہ تھی کہ اتوار کی اِس محفل میں۔ شرکاء کو کچھ نہ کچھ نیا سیکھنے کو مل جاتا۔ کوئی علم کی بات۔ فلسفہ کا کوئی پہلو۔ کسی بڑے آدمی کی حالاتِ زندگی میں سے کوئی واقعہ۔ کوئی کہانی۔ ریاضی۔ طبعیات۔ کمپیوٹرز۔ ٹیکنالوجی۔ شاعری۔ حتیٰ کہ تاریخ۔ جغرافیہ۔ اور انسانی تعلقات۔ ولید کے پاس ہر مرتبہ کوئی نئی بات ہوتی کہنے کے لئے۔ یا پھر کوئی نئی بات۔ گفتگو کے دوران نکل آتی۔

آج کی محفل ذرا مختلف نوعیت کی تھی۔ شہر سے چھٹیوں پر آئے سلمان کو اخباری

نمائندے کے چند سوالات پر شدید اعتراض تھا۔ اُس کا کہنا تھا کہ فضول سوالات کرنے کی بجائے۔ اخبار کی رپورٹ یہ جائزہ پیش کرے کہ "اپنی مدد آپ" کی بنیاد پر چلنے والا سکول۔ گاؤں کے لئے کتنا سود مند ہے۔ شہر والوں کو سبق سیکھنا چاہیئے۔ جہاں روپیہ پیسہ حکومت لگائے یا پرائیوٹ انوسٹمنٹ ہو۔ "خرچہ زیادہ اور نتیجہ کم" والی صورت حال کیوں ہوتی ہے۔

دونو جوان اِس بات پر مصر تھے کہ گاؤں کے سکول کی کوئی رپورٹ بھی اخبار میں نہیں چھپنی چاہیئے۔ خطرہ تھا کہ مفت پڑھائی کا سُن کر شہر کے لوگ۔ یہاں آجائیں گے اور گاؤں کے بچوں کے لئے سکول میں جگہ نہیں رہے گی۔ اخباری نمائندہ سکول کے ہیڈ ماسٹر یعنی استاد پیراں وسائے سے ملنا چاہتا تھا۔ سلمان کا خیال تھا کہ ہیڈ ماسٹر کی بجائے۔ باؤ کا انٹرویو اخبار میں چھپنا چاہیئے۔ یوں کہ سارا آئیڈیا تو اُسی کا تھا۔ اُسی کا پیسہ تھا۔ اُسی کی محنت تھی۔ ولید کو چائے خانے میں آتے دیکھ کر سلمان کے ساتھ دوسرے لوگوں کی بھی خوشی ہوئی۔ کہ اب سوالات کے جوابات مل جائیں گے۔ مشکل آسان ہو جائے گی۔ اور فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی۔ ولید ابھی بیٹھنے کے لئے کوئی جگہ ڈھونڈ رہا تھا کہ بُورے فقیر کا قہقہ گونجا

" آزاد ہو جاؤ گے۔ بالکل آزاد۔ سب کو سارا کچھ معاف کر دو۔ آزاد ہو جاؤ گے۔ بالکل آزاد"۔

اخباری فوٹو گرافر نے جلدی سے بُورے فقیر کی تصویر بنائی اور دلچسپی سے اُس کی حرکات وسکنات نوٹ کرنے لگا۔ اتنی دیر میں ولید اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھ چکا تھا۔ اور اُسکی پسندیدہ کڑک چائے کا کپ سامنے آچکا تھا۔

سلمان نے اخباری نمائندے کا تعارف ولید سے کراتے ہوئے بحث میں آئے کچھ سوالوں کا ذکر کیا۔

"جس بچے نے نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ اُس سے بات کرائی جائے۔ اور ہیڈ ماسٹر کی بجائے۔ کلاس ٹیچر سے دو ایک سوال ہو جائیں تو مناسب رہے گا"۔ ولید نے ساری روداد سننے کے بعد دھیمے لہجے میں کہا

"لیکن جناب۔ اور آپ نے اپنا نام نہیں بتایا۔؟ کیا نام ہے آپکا" اخباری نمائندہ بولا!

"ہیڈ ماسٹر کا نام پیراں وسایا ہے۔ اور ظہیر کے کلاس ٹیچر کا نام مشتاق احمد ہے۔ میرا نام

CamScanner

پوچھ کر کیا کریں گے آپ۔؟ میرا اِس امر سے کوئی خاص تعلق نہیں۔گاؤں میں سارے مجھے باؤ کہتے ہیں۔یہی میرا نام ہے" ولید نے اُسی ملائم لہجے میں کہا

" تو باؤ جی۔مشتاق صاحب سے کہاں ملاقات ہوسکتی ہے۔بچے کی تصویر بھی لینی ہے۔ آگے بس بھی پکڑنی ہے۔یہ گاؤں والے کیسے ہیں؟ مہمانوں کا خیال بھی نہیں کرتے"۔

" خیال نہیں رکھتے۔؟ کھانا کھلایا۔چائے پلا رہے ہیں۔کیا مطلب ہے کہ ہم نے خیال نہیں رکھا"۔سلمان کو بُرا لگا تھا" میرا مطلب ہے۔وقت کا خیال نہیں رکھتے"۔اخباری نمائندے نے بات بدلنے کی کوشش کی۔

" اگر کوئی کوتاہی ہوگئی ہے تو اُسکی معذرت چاہتے ہیں۔سلمان۔آپ انہیں ماسٹر مشتاق سے ملوا دیجئے۔" ولید نے کہا اور سلمان اپنے تین ساتھیوں سمیت دونوں مہمانوں کو ساتھ لے کر چلا گیا۔

تین اور لوگ اٹھے اور ولید سے اجازت لے کر۔سلمان کے پیچھے پیچھے ہو لئے۔ چائے خانے میں اب ولید کے ساتھ۔چائے خانے کا مالک۔اُسکا" چھوٹا" جو اُس وقت برتن دھونے میں مصروف تھا۔اور دو لوگ باقی رہ گئے۔رشید اور قیصر۔جو سلمان کے ساتھ شہر سے آیا تھا۔اور ذاتی طور پر سکول اور باؤ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے میں دلچسپی رکھتا تھا۔ سلمان نے باؤ کے علم کی اتنی تعریف کی تھی کہ اِس مرتبہ وہ گاؤں ہی چلا آیا۔رشید۔چار جماعتیں پاس۔گاؤں میں ہی رہتا تھا اور کوئی بھی کام دلجمعی سے نہ کرنے کی وجہ سے بے کار تھا۔کپڑوں کی کریز خراب نہیں ہونے دیتا تھا۔لیکن کوئی کام دھندہ ٹِک کر کرنے سے اُس کی جان جاتی تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ باؤ کسی سیکورٹی ایجنسی کا جاسوس ہے جو گاؤں والوں کی نگرانی کے لئے حکومت نے بھیجا ہے۔سب سے زیادہ تکلیف اُس کو اِس بات کی تھی کہ جب سے باؤ گاؤں میں آیا تھا۔ تسکین نے اُس سے بات ہی کرنا چھوڑ دی تھی۔یہ الگ قصہ کہ باؤ اور تسکین کے کسی بھی سمبندھ کا گاؤں میں کوئی بھی چرچا نہیں تھا۔رشید کو شک تھا کہ باؤ اور تسکین چھپ چھپ کر کہیں ملتے ہیں۔ یوں وہ اتوار کو چائے خانے کا چکر ضرور لگاتا تھا۔باؤ کے بارے میں معلومات اکٹھی کرتا تھا۔اور کوشش کرتا تھا کہ جہاں باؤ جائے وہ وہاں موجود ہو۔

" آزاد ہو جاؤ گے۔سارا کچھ معاف کر دو۔سب کو۔" ہو رافقیر کہیں چکر لگا کر پھر آ گیا

تھا۔

"چائے پیو گے؟" ولید نے بُورے فقیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

"تم تو یہاں سے چلے ہی جاؤ۔ تمہارے لئے اچھا ہوگا" بُورے نے عجیب سے لہجے میں کہا

"چائے پیو گے" ولید نے دوبارہ پوچھا

"تو یہاں اور ملتا کیا ہے۔؟ چائے ہی پلوا سکتے ہو۔ اور تم۔ یہاں کیا کرو گے۔ ہیں؟" بُورے نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ولید کو دیکھا

"سب کو سارا کچھ کیسے معاف کیا جا سکتا ہے"۔ ولید نے "چھوٹے" کو چائے لانے کے لئے کہتے ہوئے پوچھا

"مجھے کیا پتہ"

"تو پھر کہا کیوں؟"

"مجھے کیا پتہ۔ وہ جانتا ہے"۔ بُورے نے آسمان کی طرف انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے کہا

"اور تم کیا جانتے ہو" یہ سوال قیصر نے کیا

"تم بھی یہاں رہنے آئے ہو کا کا۔؟ یا چلے جاؤ گے؟ جاؤ تو باؤ کو ساتھ لے جانا۔ یہ بہت اکیلا ہے یہاں پر۔"

"کیوں اکیلا ہے باؤ۔ اتنے سارے لوگ تو ہیں یہاں۔ اور پھر تم بھی ہو۔؟ قیصر نے کہا

"سب کو معاف کرنا پڑے گا۔ سارا کچھ۔ ورنہ سیاپا ختم نہیں ہوگا"

"چھوڑیں جی۔ پاگل ہے۔ فقیر ہے۔ اللہ لوک ہے۔ آپ کس کی باتوں میں آ گئے ہیں" رشید کو گفتگو کی کچھ سمجھ نہ آ رہی تھی۔

"پاگل۔ ہاہاہا۔ فقیر۔ ہاہاہاہا۔" بُورا فقیر قہقہے لگا رہا تھا

"اور نہیں تو کیا۔ کپڑے تو دیکھو اپنے۔ اور کتنے مہینوں سے تم نہائے نہیں ہو۔ گاؤں میں بُو پھیل جاتی ہے جب تم گلی سے گذرتے ہو" رشید نے کہا

CamScanner

"یہ مناسب نہیں ہے۔آپ خود کہہ رہے ہیں کہ وہ پاگل فقیر ہے۔اور پھر توقع کر رہے ہیں کہ وہ عام لوگوں کی طرح نہائے۔دھوئے۔اجلے کپڑے پہنے۔یہ مناسب نہیں ہے" قیصر نے سرزنش کی۔ولید یہ ساری گفتگو خاموشی سے سُن رہا تھا۔

"اللہ لوک۔ہاہاہا۔سب اللہ لوک ہیں۔تم بھی۔مَیں بھی۔"بُورے نے ایک ہی سانس میں ساری چائے گلے میں انڈھیلتے ہوئے کہا

"گہری بات کی ہے بھئی تم نے۔درست ہی تو ہے۔ہم سب اللہ کی ہی مخلوق ہیں" قیصر بولا

"گہری باتیں تو باؤ کرتا ہے جی۔یہ پاگل بیچارہ کیا کرے گا۔اِس کو تو دو کا پہاڑہ نہیں آتا۔کھانا اِسے لوگ کھلاتے ہیں" رشید بولا

"آپ کافی مدت سے یہاں ہیں۔کچھ اپنے بارے اور گاؤں بارے بتایئے" قیصر نے ولید سے سوال کیا

"چلا جا باؤ۔ایتھوں چلا جا سوہنیا۔سوال نئیوں مکنے۔سب کچھ معاف کر دے باؤ۔سب کچھ"۔بُورا فقیر یہ کہتا ہوا اور قہقے لگاتا ہوا گاؤں کی کسی گلی میں مڑ گیا۔

"آپ کیسے یہاں۔پہلے تو آپ کو یہاں نہیں دیکھا۔"ولید نے سوال کا جواب سوال میں دیا۔

"جی۔سلمان میرا دوست ہے۔اُس نے گاؤں کے سکول اور آپکی اتنی باتیں کیں کہ جی چاہا خود ملوں آ کے۔پرسوں واپسی ہے۔بی اے فائینل میں ہوں"۔

"پھر کیا کرو گے۔بی اے کے بعد پڑھائی جاری رکھو گے ناں"

"جی ہاں۔سی ایس ایس کروں گا۔پولیس میں جاؤں گا۔اے ایس پی بنوں گا"۔

"پولیس میں ہی کیوں۔فارن سروس یا ڈسٹرکٹ مینجمنٹ میں کیوں نہیں"

"نہ جی۔جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا۔فارن سروس۔فارن میں ہوتی ہے۔میں یہاں کچھ کرنا چاہتا ہوں۔اور ڈی ایم جی اب کمزور ہو رہی ہے۔اصلی گروپ پولیس ہے"۔قیصر کی آنکھوں میں "اصلی گروپ" کہتے ہوئے ایک خاص چمک سی آئی۔

"اصلی گروپ مطلب؟ پولیس میں آ کر کیا کرو گے"

CamScanner

"رعب ہے جناب رعب۔ پولیس کا رعب ہے۔ اور پھر لمبا پیسہ بھی ہے"۔

"رعب اور پیسہ۔! اور یہ دونوں چیزیں کسی اور جگہ سے مل جائیں تو پھر بھی پولیس میں جاؤ گے"

"پھر بھی۔ اسلئے کہ اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے تھوڑی بہت طاقت بھی ہونی چاہیئے اپنے پاس"۔

"قائداعظم' علامہ اقبال' ڈاکٹر عبدالسلام' عبدالستار ایدھی اور اِن جیسے مشاہیر میں سے کون پولیس کی نوکری کرتا تھا۔ طاقت سے تمہاری مراد کیا ہے۔ بندوق کی طاقت۔ یا کسی کو جیل میں ڈالنے کی طاقت۔؟ طاقت تو بیٹا علم میں ہوتی ہے۔ یا پھر اچھے اعمال میں۔ کیا کہتے ہو۔؟"

"وہ تو ٹھیک ہے جی۔لیکن زمانہ بدل گیا ہے۔ ہمارا ویلیو سسٹم بدل گیا ہے۔ پیسہ۔ طاقت۔ تعلقات۔ یہی پیمانے ہیں"۔ ولید کو قیصر کی باتوں میں محو دیکھ کر رشید کب کا وہاں سے جا چکا تھا۔

"اور اِس بدلے ہوئے ویلیو سسٹم کو تم پولیس میں جا کر ٹھیک کر سکو گے؟"

"تو پھر آپ ہی بتایئے۔ کیا کیا جائے۔ اتنی مہنگائی ہوگئی ہے۔ انصاف ملتا نہیں۔ غنڈہ گردی انتہا کو پہنچ گئی ہے۔ بے روزگاری۔ بجلی کا بل۔ بچوں کی تعلیم و تربیت۔ ہم لوگ تو گھر بنانے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ اور کچھ نہیں تو قبضہ گروپ۔ ہتھوڑا گروپ۔ چوریاں۔ ڈاکے۔ اور پھر سیاست کی قلابازیاں اور دہشت گردی۔ پولیس میں جاؤں گا تو کم از کم اپنی اور اپنے گھر والوں کی حفاظت تو کر سکوں گا۔ وہ زمانے گئے جب سچ بولو۔ نیک رہو۔ غصہ حرام ہے۔ رشوت حرام ہے۔ جیسے بزرگ رہتے تھے۔ اب تو ماں باپ خود کہتے ہیں کہ کما کر لاؤ۔ کہاں سے اور کیسے کما کر لاؤ۔ یہ اُن کا مسئلہ نہیں رہا"۔ قیصر کی آواز جذباتی ہو رہی تھی۔

"اب سمجھ میں آیا کہ تم کس ویلیو سسٹم کی بات کر رہے تھے۔ بیٹا سچ ختم نہیں ہوا دنیا سے۔ بس ذرا اِس کے راستے میں مشکلات بڑھ گئی ہیں۔ رشوت حلال نہیں ہوئی۔ کبھی بھی نہیں ہو گی۔ بس ذرا ہم لوگوں نے شارٹ کٹس ڈھونڈنے شروع کر دیئے ہیں۔ بزرگ نہیں بدلے۔ ذرا بے چینی بڑھ گئی ہے"۔

"آپ گاؤں میں بیٹھے ہیں۔ آپ کو کیا خبر۔ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ چکی

ہے۔انٹرنیٹ اور کمپیوٹر نے کیا دھمال مچائی ہے۔دنیا کے رنگ کتنے بدل گئے ہیں۔کتنا کچھ جانتے ہیں آپ ٹیکنالوجی اور کمپیوٹر کے بارے میں" قیصر نے پوچھا

" کچھ زیادہ نہیں۔لیکن بیٹا اتنا جانتا ہوں کہ انٹرنیٹ اور ٹیکنالوجی کا صحیح استعمال ابھی ہمیں سیکھنا ہے"۔ولید دل میں کچھ دیر کے لئے مسکرایا۔وہ اِس نوجوان کو اپنے اور اپنے علم کے بارے میں کیا بتاتا۔

" آپ کچھ بھی کہہ لیں جناب۔پیسہ پیسہ ہے۔اور یہ بولتا ہے۔آپ کے پاس سنا ہے بہت پیسہ ہے۔بولتا ہے کہ نہیں"

''پیسہ اتنا ہی جتنی ضروریات!۔پیسہ اگر بہت اہم ہوتا تو میرے نبی ضرور کہتے کہ پیسہ حاصل کرو چاہے اس کے لئے جان سے ہی گذرنا کیوں نہ پڑے۔کوئی ایک حدیث تو ہوتی۔! پیسہ اگر اتنا اہم ہوتا تو دنیا بھر کے مذاہب۔فلسفے۔شاعری اور ادب۔اِس کے حصول کے لئے اصول وضع ضرور کرتے۔لیکن مَیں تمہیں پولیس میں جانے کے لئے نہیں روکوں گا۔امتحان دو۔کامیابی حاصل کرو۔پولیس مین بنو۔اور بقول تمہارے رعب اور طاقت بھی حاصل کرو۔مگر بیٹا۔تھوڑا سا خیال رکھنا۔اگر ضمیر کسی جگہ روک دے۔ٹوک دے۔کچوکے لگائے۔تو ضد پر نہ اڑے رہنا۔فیصلوں کے بدلنے سے ہی انسان۔انسان رہتا ہے۔ورنہ خدا نہ بن جاتا"

"پرانی باتیں ہیں۔زمانہ بدل گیا ہے۔اصول بدل گئے ہیں"۔

"باتیں۔زمانہ۔اصول۔مان لیا تھوڑی دیر کے لئے۔کہ سب بدل گیا ہے۔تو کیا ماں کی محبت بھی بدل گئی ہے۔باپ کی شفقت بھی بدل گئی ہے۔دوسروں کے لئے کچھ اچھا کرنے کا جذبہ بھی بدل گیا ہے؟ کیا خون کا رنگ بدل گیا ہے؟ بھوک پر قابو پالیا گیا ہے۔لالچ پر آرا چلا دیا گیا ہے؟ درختوں اور پھولوں نے اُگنا چھوڑ دیا ہے؟ تتلیوں نے کتوں کی طرح بھونکنا شروع کر دیا ہے؟ کتوں نے مالک پر حملے شروع کر دیئے ہیں؟ فقیر کی جھولی خالی ہوگئی ہے کیا؟ قرآن کے لفظ بدل گئے ہیں؟ زمین نے انسان کا بوجھ اٹھائے رکھنے سے انکار کر دیا ہے؟۔بہت کچھ ویسے کا ویسا ہی ہے بیٹا۔پیسہ اتنا ہی اچھا جتنا ضرورت کا۔ورنہ سنبھالا نہیں جاتا۔کیا کہتے ہو" ولید نے نرمی سے پوچھا

" آپ نے تعلیم کتنی حاصل کی۔کیا کام کرتے رہے ہیں آپ"

سعدی شیرازی جتنی تعلیم نہیں حاصل کی جنہوں نے کئی برس پہلے تمہارے اس سوال کا جواب دیا تھا۔ کہ یہ نہ دیکھو کون کہہ رہا ہے۔ یہ دیکھو کہ کیا کہہ رہا ہے۔ تم ابھی یہیں بیٹھو گے؟ میرے جانے کا وقت ہو گیا ہے"۔

"بس۔ سلمان آتا ہی ہوگا۔ آپ سے مل کر خوشی ہوئی" قیصر نے ہاتھ بڑھایا

"مجھے زیادہ خوشی ہوئی۔ کچھ نئی باتیں سیکھنے کا مجھے موقع ملا۔ اگر کل یہیں ہو تو سکول آنا۔ وہاں ملاقات رہے گی۔ تم سے بات کر کے واقعی اچھا لگا۔ اور ہاں۔ میری کسی بات پر بھی زیادہ سوچنا نہیں۔ بس یونہی۔ گفتگو کا سلسلہ ختم نہیں ہونا چاہیئے۔ حتمی بات ابھی ہونی ہے"۔ ولید نے گرمجوشی سے ہاتھ ملایا

"یہی حتمی بات ہے"۔ قیصر نے کہا اور ولید کو جاتا ہوا دیکھنے لگا۔ گفتگو کے کئی پہلو دوبارہ دماغ میں آئے۔ اور خیالات کا سلسلہ "چھوٹے" کی آواز سے ٹوٹا

"چائے صاحب۔؟"

"ہاں بھئی۔ اور ہاں۔ تیز پتی والی"۔ قیصر نے آسمان کی طرف دیکھا۔ جہاں پرندے شام ڈھلے واپسی کا سفر کر رہے تھے۔!

☙☙☙

◎

سلمان اور ماسٹر پیراں وسائے کو باؤ کی پراسرار مگر پرکشش شخصیت میں اتنا پیار نظر آتا تھا کہ انہوں نے کریدنا مناسب نہ سمجھا۔ جب بھی کبھی باؤ کے ماں باپ، بہن بھائی یا اُسکے اچانک گاؤں آ بسنے والے سوالات اُن کے ذہنوں میں ابھرتے۔ وہ لفظوں کا روپ دھارنے سے پہلے ہی ہوا ہو جاتے۔ پھر باؤ کا کوئی ایک کام بھی ایسا نہ تھا جس پر اعتراض کیا جا سکے۔ یوں سوال کرنے کی "جرأت" بھی نہیں ہوتی تھی۔ رفتہ رفتہ اِن دونوں کے ساتھ باقی گاؤں والوں نے بھی باؤ کی تاریخ، ماضی اور اُسکی شخصیت کے بارے ذہنوں میں اٹھنے والے کئی سوالوں کو نہ کرنے کا ایک لاشعوری فیصلہ کر لیا۔ ایک رشید اور تسکین کو چھوڑ کر سب باؤ کے "حال" والے روپ میں خوش تھے۔ اور کیوں نہ ہوتے۔ کسی کی بیٹی کی شادی میں پیسے کی ضرورت ہو یا کسی کے بچے کو شہر ہسپتال داخل کرانا ہو۔ ہمسائیگی کی چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ہوں یا اسلام کے بارے کوئی سوال کا جواب درکار ہو۔ باؤ ہر جگہ مدد کرتا نظر آتا تھا۔

تسکین کو باؤ اچھا لگ گیا تھا۔ عمر میں پندرہ بیس سال کے فرق کے باوجود۔ باؤ کا لمبا قد۔ بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں۔ فراخ ماتھا۔ اور پھر سب سے بڑھ کے اُسکی دھیمے لہجے میں کی گئی باتیں۔ تسکین۔ باؤ کو پسند کرنے لگی تھی۔ وہ اُسکے بارے میں سب کچھ جاننا چاہتی تھی۔ وہ کہاں سے آیا ہے۔ اور کیوں؟ وہ یہاں کتنی دیر رہے گا؟ اُسکی شادی ہوئی کہ نہیں؟ اُسکے ماں باپ۔ گھر گرہستی۔ تسکین کے پاس سوالوں کا ایک انبار تھا۔ مگر موقع ہی نہیں تھا کہ کسی دن آمنے سامنے بیٹھ کر تفصیل کے ساتھ باؤ سے بات کی جائے اور یہ سب پوچھا جائے۔ پھر یہ فکر بھی تھی کہ باؤ نے اِن سوالوں کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا اور ناراض ہو گیا تو کیا ہوگا۔ شادی بیاہ کے موقع پر۔ یا کسی کے گھر کسی عید شبرات کو۔ تسکین کی دو تین بار باؤ سے مختصر بات چیت رہی۔ اور ہمیشہ کی طرح باؤ کا سامنا ہوتے ہی وہ سب سوال بھول جاتی۔ باؤ کی شخصیت اور پھر گاؤں میں اُسکی

CamScanner

یہاں سے آگے
حیثیت۔ تسکین ان سارے سوالوں میں سے کوئی ایک بھی سوال باؤ سے نہ پوچھ سکی تھی۔ اپنے اوپر
غصہ آنے کی ایک دوسری وجہ بھی تھی۔ باؤ سے جب بھی بات ہوئی۔ تو اُس نے تسکین کو بچوں کی
طرح ٹریٹ کیا۔ ایسے جیسے وہ پندرہ سولہ سال کی کوئی بچی ہو۔ جسے ماسٹر صاحب یا مولوی صاحب
ھمیشہ سمجھاتے ہی رہتے ہیں۔ کہ یوں کر لیں تو ٹھیک رہے گا۔ ایسا کرنے سے اس قسم کے
نقصانات ہو سکتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ اب بھلا کوئی دیکھنے پوچھنے والا تھا۔ چھبیس سال کی تسکین۔
جو کچھ جماعتیں پڑھ جانے کے بعد اردو لکھ اور پڑھ سکتی تھی۔ خوبصورت تھی۔ بقول سرتاج
خالو کے۔ "گاؤں کی سب سے سگھڑ اور سمجھ دار لڑکی" تھی۔ اُسے باؤ کا اِس طرح بچوں کی طرح
اُسے دیکھنا۔ کیسے اچھا لگ سکتا تھا۔

دوسری طرف رشید۔ جسے تسکین سے بقول اُسکے "سسی پنوں" والی محبت تھی۔ باؤ کی
طرف تسکین کا رجحان دیکھ کر ھمیشہ اِس تلاش میں رہتا کہ کسی نہ کسی طرح سے باؤ کی کوئی ایسی بات
کا پتہ چلے جس سے گاؤں والے اور خاص طور پر تسکین اپنی سوچ بدل لیں۔ بدقسمتی یا خوش
قسمتی۔ رشید کو ابھی تک باؤ کی کوئی ایک برائی بھی نہیں ملی تھی۔ باؤ کا مہینے میں چند روز کے لئے
غائب ہو جانا۔ کسی کو بتائے بغیر۔ رشید نے بہت مرتبہ کوشش کی پیچھا کرنے کی۔ لیکن باؤ شہر میں جا
کر ھمیشہ گم ہو جاتا۔ رشید نے گاؤں میں یہ افواہ پھیلانے کی ناکام کوشش بھی کی کہ باؤ کسی سیکورٹی
ایجنسی کا جاسوس ہے۔ جو مہینے میں چند روز کہیں جا کر پورے گاؤں کی رپورٹیں دیتا ہے۔ لیکن
گاؤں والوں نے ھمیشہ رشید کو ہی بُرا بھلا کہا کہ خواہ مخواہ باؤ کے پیچھے ہاتھ دھو کے پڑ گیا ہے۔ سبھی
شہر جاتے ہیں۔ اور پھر ہو سکتا ہے کہ کوئی کاروبار کرتا ہو باؤ۔ بنکوں کے چکر لگانے ہوتے ہیں۔ اور
ہزاروں جھمیلے ہوتے ہیں۔ رشید نے باؤ کے چھوٹے سے۔ ایک کمرے کے گھر کی باتیں بھی مشہور
کرنے کی کوشش کی۔ باؤ کے گھر آج تک کسی گاؤں والے نے قدم نہیں رکھا۔ کوئی نہیں جانتا اُسکے
گھر میں کہیں جاسوسی کرنے والے آلات ہی نصب نہ ہوں۔ کیوں وہ کسی کو اپنے گھر کے اندر نہیں
آنے دیتا۔ رشید نے گاؤں کے چوہدری سے بھی کہا کہ پتہ کرائیں۔ اسکے گھر کے اندر کیا خزانہ
چھپا ہے۔ تین پولیس والوں کے چھوٹے سے تھانے کے افسر سے بھی بات کی۔ رشید کی کسی نے نہ
سُنی۔ شفیقے قصائی نے رشید کو ایک دن ڈانٹ دیا۔ کہ باؤ کے بارے میں ایسی باتیں نہ کرے ورنہ
کسی دن ٹوکے سے وہ رشید کے بہت سارے ٹوٹے کر دے گا۔ شفیقا قصائی باؤ کی بے انتہا عزت

کرتا تھا۔ایک تو گاؤں میں ہر کسی کا خیر خواہ ہونا۔دوسرا۔باؤ اُسکی زندگی میں آنے والا پہلا شخص تھا جس نے اُسے جانور ذبح کرنے اور جانور صحیح طرح سے ذبح کرنے کا فرق بتایا تھا۔باؤ کی بات مان کراب وہ ہر بکرے کو چھری پھیرنے سے پہلے پیٹ بھر کے کھانا کھلاتا۔پانی پلاتا۔اور جلد سے جلد چھری پھیر دیتا۔یوں کہ بکرے کی تکلیف کم سے کم مدت رہے۔باؤ نے ایک دن شفیقے کو بکرے کے تمام حصوں کی بوٹیاں۔کس انداز۔اور کس طریقے سے کرنی ہیں کہ ذائقہ قائم رہے۔اور اس طرح کی دوسری معلومات دیں۔" تمہیں یہ سب کیسے پتہ ہے باؤ" کے جواب میں باؤ ہنس پڑا تھا۔اُس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

محمد پان والے نے بھی رشید کی سرزنش کی تھی۔محمد پان والا اپنے کام سے کام رکھنے والا خاموش طبع آدمی۔اور یہ بھی باؤ کا طرف دار۔یا تو یہ سارا گاؤں پاگل ہوگیا ہے یا اس پر کوئی سایا ہے۔سب باؤ کی عزت کرتے ہیں۔اُس سے پیار کرتے ہیں۔اور اُسکی غیر موجودگی میں بھی اُسکے خلاف کوئی بات نہیں سنتے۔رشید بہت مایوس ہوا۔اب تسکین سے شادی کے سارے خواب اُسے چکنا چُور ہوتے نظر آرہے تھے۔اچھا بھلا معاملہ آگے بڑھ رہا تھا۔تسکین دو ایک بار مسکرائی بھی تھی۔اللہ غرق کرے اِس باؤ کو۔اِسکے آتے ہی تسکین مجھ سے دور ہوگئی۔اور اب تو تسکین رشید کو "ہوں" "ہاں" میں ہی جواب دے کر ٹال رہی تھی۔باؤ کا تو نہیں۔البتہ تسکین کے بارے میں رشید کو پورا یقین تھا کہ وہ باؤ سے محبت کرتی ہے۔ایک دن باؤ سکول سے گھر واپس آرہا تھا۔اور سامنے سے تسکین اچانک کہیں سے آگئی۔رشید نے برگد کے بڑے درخت کے پیچھے چھپ کر دونوں کی بات چیت سُن لی تھی۔

"باؤ جی۔میں نے وہ گانا ٹیپ کرالیا ہے۔مُک گئی باؤ جی گل مُک گئی" تسکین نے سر پر دوپٹہ سیدھا کرتے ہوئے شرارتی موڈ میں کہا

" گانے ہی سُنتی ہو کہ شادی کا بھی سوچا ہے۔تمہاری عمر کی لڑکیوں کے تو تین چار بچے ہوتے ہیں بھئی" باؤ نے بات سُنی اَن سُنی کرنے کے انداز میں جواب دیا

"وہی تو کرنی ہے۔آپ میری مدد کریں۔مصیبت یہ ہے کہ میں جس سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔اُسکے پاس وقت ہی نہیں بات کرنے کا۔ھمیشہ مصروف رہتا ہے"

" گاؤں میں رہتا ہے۔؟ میں اُس سے بات کروں گا۔ویسے مجھے پتہ چلا ہے رشید

CS CamScanner

نے تمہارا رشتہ بھیجا تھا۔ اُس سے کرلو شادی۔ اچھا لڑکا ہے" اور درخت کے پیچھے چھپا شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ ایک وہ تھا جو باؤ کے بارے میں کتنا غلط سوچتا تھا اور ایک باؤ ہے۔ جو تسکین سے اُس کی شادی کی بات کر رہا ہے۔

"آپ کی شادی ہوئی ہے" تسکین نے اچانک سوال داغ دیا

"میرا خیال ہے خاصی باتیں ہو گئی ہیں۔ میں نے ابھی بہت کام کرنا ہے" باؤ نے کہا اور تسکین کو اشارے سے ایک طرف ہونے کا کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ اُس نے تسکین کا اترا ہوا۔ چہرہ نہ دیکھا۔ جو مایوسی اور پشیمانی کے ملے جُلے جذبات سے ہلکا زرد ہو رہا تھا۔ تسکین کو ایک ہی فکر تھی۔ کہیں باؤ اُسکے سوال سے ناراض تو نہیں ہو گیا۔؟

"کیوں کیا میں نے یہ سوال" بڑبڑاتے ہوئے تسکین نے دایاں پاؤں زور سے زمین پر مارا اور اپنے گھر کی طرف واپس جانے لگی۔

عام حالات میں رشید کی جگہ کوئی بھی ہوتا۔ باؤ کی عزت دل میں کئی گنا زیادہ ہو جاتی۔ مگر رشید تو تسکین کو کسی بھی حالت میں اپنا بنانا چاہتا تھا۔ اُسکا دھیان کسی اور طرف تھا۔ اگر تسکین باؤ سے پیار کرتی ہے۔ شادی کرنا چاہتی ہے۔ تو باؤ نے بات سُنی کیوں نہیں؟ کیا اُسکی شادی ہو چکی ہے؟ پتہ لگاتے ہیں۔ لیکن کیسے۔؟

باؤ کے بارے میں کوئی بھی بات کیسے پتہ لگے۔ سُراغ لگانے والا ایک۔ اور روکنے والے سینکڑوں۔ رشید کو کچھ سمجھ نہ آیا تو اُس نے باؤ سے "ڈائریکٹ" بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا۔ باؤ ڈانٹ دے گا۔ ناراض ہو جائے گا۔ تو ہو جائے۔ اب کوئی دوسرا راستہ بھی تو نہیں۔

کئی دنوں کے بعد رشید کو موقع مل گیا۔ "ڈائریکٹ" بات کرنے کا۔ اتوار کو چائے خانے پر باؤ ابھی اکیلا تھا۔ دوسرے لوگ نہیں آئے تھے۔

"آپ سے چند ایک ذاتی سوال پوچھنا چاہتا ہوں" اِدھر اُدھر کی چند باتیں کرنے کے بعد رشید نے کہا

"ذاتی باتیں۔؟"

"جی"

"میری ذات سے کوئی نقصان پہنچ رہا ہے آپ کو"

"جی ہاں۔ میرا مطلب ہے جی نہیں" رشید کو اس سوال کی توقع نہیں تھی۔

"پوچھیئے۔ لیکن ذرا جلدی کیجئے گا۔ کچھ نوجوانوں نے ابھی یہاں آنا ہے۔ اور یوں بات پوری نہ ہو سکے گی"

"آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟ اور کہاں سے آئے ہیں"

"زیادہ مناسب سوال یہ ہوگا کہ آپ یہاں کیا کرنے آئے ہیں"

"چلیں اسی کا جواب دے دیں"

"تو سوال بھی میرا اور جواب بھی مجھے دینا پڑے گا" باؤ نے مسکراتے ہوئے کہا

"آپ کی شادی ہوئی ہے کہ نہیں؟ بیوی بچے ہیں آپ کے" رشید کچھ گومگو کی حالت میں تھا۔ اُسے خیال ہی نہ رہا کہ اِس طرح کے سوالات کسی بھی جگہ۔ کسی سے بھی کرنے والے نہیں ہوتے۔ خصوصاً اگر دوستی کا رشتہ نہ ہو۔

"میں آپکی مشکل آسان کرتا ہوں۔ کچھ روز قبل تسکین سے ملاقات ہوئی تو میں نے اُس سے کہا کہ وہ آپ سے شادی کر لے۔ سُنا ہے آپ نے اُسے رشتہ بھیجا تھا"

"جی۔ لیکن مجھے لگتا ہے جب سے آپ یہاں آئے ہیں۔ اُس نے مجھ سے بات کرنا ہی بند کر دی ہے"

"کسی کے آنے جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ شادی دو لوگوں کی "ہاں" سے ہوتی ہے۔ آپ کے معاملے میں لگتا ہے "ہاں" صرف ایک طرف سے ہے۔ انتظار کرنا ہے یا زبردستی۔ یہ آپ کا اپنا فیصلہ ہوگا۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا" باؤ نے چار لڑکوں کو آتے دیکھا تو بات ختم کرنے کی کوشش کی۔ رشید خدا حافظ کئے بغیر وہاں سے اُٹھ گیا۔ اُسے اپنی مرضی تو کیا۔ کسی بھی سوال کا جواب نہ ملا تھا۔

"انتظار یا زبردستی"۔ رشید کس پر زبردستی کر سکتا تھا۔ اور بہت سے کمزور لوگوں کی طرح اُس نے انتظار کرنے کا ہی فیصلہ کیا۔ طاقتور لوگوں کی ایک نشانی یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ انسانی رشتوں کے معاملات میں زبردستی نہیں کرتے۔ اِس لئے نہیں کہ وہ کر نہیں سکتے۔ اس لئے کہ وہ اپنی انا کے ہاتھوں مجبور ہو جاتے ہیں جو سیدھی سادی "ہاں" سننا چاہتی ہے۔ اور پھر اُن لوگوں میں کوئی

Mir Zaheer Abass Rustmani
CamScanner

مضبوط سی "ناں" سننے کے بعد اتنی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ کہ وہ کسی بھی قسم کا "انتظار" کریں۔ یوں وہ اپنا راستہ بدل لیتے ہیں۔ لومڑی کے "انگور کھٹے ہیں" کی طرح نہیں۔ بہادروں کی طرح۔ جو فتح کا جشن منانا تو جانتے ہی ہیں۔ شکست کو تسلیم کر کے نئے راستے چننے پر بھی قادر ہوتے ہیں۔

☆☆☆

◎

اُن دو برسوں میں ولید نے جینی کے بارے میں بہت سوچا۔ اُسکے ہزار بار کہنے پر بھی جینی کا پہلے دن والا رویّہ ویسے کا ویسا ہی رہا۔ انکار سُن کر روہ اور مضبوط نظر آتی۔ اُسکی آنکھوں میں ولید کی محبت دن بدن بڑھتی دکھائی دیتی۔ ولید کو کئی مرتبہ سننا پڑا "جب تک کسی دوسری عورت کو تمہارے ساتھ دیکھ نہیں لوں گی۔ تسلّی نہیں کرلوں گی کہ وہ بھی تم سے اتنا ہی پیار کرتی ہے جتنا میں کرتی ہوں۔ تسلّی نہیں کرلوں گی کہ تم اُس کے ساتھ خوش رہو گے۔ مَیں تمہارا پیچھا نہیں چھوڑوں گی"۔ سامنے تو نہیں۔ مگر دل میں ولید کو جینی کو یہ رویّہ بڑا اچھا لگتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی اپنا۔ کسی بہت اپنے کا۔ بہت خیال رکھ رہا ہے۔ یقین کر لینا چاہتا ہے کہ مَیں خوش رہوں گا۔ جسے اپنی خوشی سے زیادہ میری خوشی کی پرواہ ہے۔

ولید نے بہت سوچا۔ لاشعوری طور پر اُسکے ذہن میں اپنی ہونے والی بیوی کا تصور۔ جینی سے بالکل لگا نہیں کھاتا تھا۔ اُسے اپنی بیوی میں تھوڑی سی ماں۔ تھوڑی سی سدرہ۔ تھوڑی سی آنٹی تبسم۔ تھوڑی سی صبا۔ اور ڈھیر ساری ایک ایسی عورت چاہیئے تھی۔ جو اُسکے ساتھ بحث نہ کرے۔ زیادہ بات نہ کرنی پڑی اور وہ خود سمجھ جائے۔ اپنی اور دوسروں کی space میں فرق جانتی ہو۔ اُسکا احترام کرتی ہو۔ یہ نہ پوچھے کہ کہاں گئے تھے۔ کس سے ملے ہو۔ اُسے اعتبار ہو۔ ہر طرح کا۔!

جینی میں ماں۔ سدرہ۔ آنٹی تبسم یا صبا۔ کچھ بھی نہ تھا۔ لیکن باقی ساری خوبیاں جو ولید چاہتا تھا۔ بدرجہ اتم موجود تھیں۔ کہیں کہیں آنٹی تبسم کی خاموش محبت۔ جینی میں نظر آتی تھی۔ لیکن مغربی ماحول میں پلی بڑھی جینی کی باتیں مختلف انداز کی تھیں۔ وہ جو نہیں کہتی تھی۔ وہ ولید کو اچھا لگتا تھا۔ یہ لگاوٹ تھی یا اخلاص۔ جینی نے اردو سیکھنے کے لئے باقاعدہ کلاسیں لینی شروع کر دی تھیں۔ ٹوٹی پھوٹی اردو۔ امریکی لہجے میں۔ ایک انوکھا تجربہ تھا۔ ہندوستانی فلمیں' مہدی حسن اور سلامت علی کی غزلیں' نور جہاں کے گیت' جینی نے ولید کو جتائے بغیر۔ کہ وہ یہ سب کچھ اُس کے لئے کر

رہی ہے۔ اپنالیا تھا۔ اُس کا کہنا تھا کہ آدھی ہندوستانی تو وہ تھی ہی۔ اب وہ پوری ساؤتھ ایشین بننا چاہتی تھی۔ ایک دن جینی نے ولید کو واقعتاً حیران کردیا۔ غالب کی غزل "یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا"۔ پوری سُنادی۔ وزن میں۔ ترتیب کے ساتھ۔ ایک ایک شعر۔ ٹھہر ٹھہر کر سنایا اور پھر ولید کو ہر شعر کی تشریح انگریزی میں کرنی پڑی۔ بہت پوچھنے پر بھی جینی نے یہ نہ بتایا کہ آخر یہ غزل ہی کیوں۔ اور کس نے اُسے یہ غزل یاد کروائی ہے۔ اُس نے "تم صرف مطلب بتاؤ" کہہ کر بات ٹال دی۔ اُدھر ولید کو "رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا" کا انگریزی ترجمہ کرنے اور "اصل مطلب" بتانے میں خاصی دشواری ہو رہی تھی۔ اور اِدھر جینی۔ ولید کی تشریحات کو اپنی چھوٹی سی نوٹ بک میں لکھتی چلی جارہی تھی۔ سچی محبتیں۔ انسانوں کو کیا سے کیا بنادیتی ہیں کیا کیا کچھ کرنے پر مجبور کردیتی ہیں۔ ناممکن باتیں بھی۔ آسان لگنی شروع ہو جاتی ہیں۔ صرف ایک مرتبہ عارف نے ولید سے بات کرتے ہوئے غالب کا ذکر کیا تھا۔ اور ولید کا اپنے والد صاحب کو شعر کے حوالے سے یاد کرنا۔ جینی کو یاد تھا۔ کتنا یاد رکھواتی ہیں سچی محبتیں۔ اپنا آپ بھول جاتا ہے۔ اور ایک بے نام سا سرور سارے وجود میں سرائیت کر جاتا ہے۔ شائد یہ وسیلہ بن جائے۔ کسی اپنے تک پہنچنے کا۔ یا پھر۔ معلوم تو کریں کہ کسی اپنے کا اپنا ماحول دراصل کیسا ہے۔؟ چلو تمہارے دیس جا کر۔ تمہاری بولی میں۔ تمہارے ماحول میں رچ بس کر دیکھتے ہیں۔ سچی محبتیں۔ معصوم بنادیتی ہیں۔!

جینی کی سب سے اچھی بات ولید کو یہ لگتی تھی کہ اُس نے صبا کی طرح "ہاں کرو" "ناں کرو" "بولتے کیوں نہیں" "وعدہ ہی کرلو" قسم کی کبھی کوئی بات نہ کی تھی۔ وہ صرف اپنی نسبت کا ذکر کرتی تھی۔ وہ تقریباً ہر ملاقات میں ولید کو بتاتی کہ وہ ولید سے کتنی محبت کرتی ہے۔ وہ اُسکے لئے ساری عمر انتظار کرسکتی ہے۔ اُسے ولید کی پوری شخصیت اچھی لگتی ہے۔ اور جواب میں اُسے کچھ نہیں چاہیئے۔ یہ وہ رویہ تھا جو ولید کو بھا گیا۔ اُسے زندگی میں پہلی مرتبہ۔ اپنا آپ خوبصورت لگا۔ کوئی ایسا بھی ہے جو مجھے بے غرض۔ بغیر کچھ مانگے۔ کسی بھی توقع کے بغیر ملتا ہے۔ چاہتا ہے۔ ساتھ رہنا چاہتا ہے۔ زندگی share کرنا چاہتا ہے۔

ولید نے ایک مرتبہ عارف سے "جینی کے ساتھ شادی نہ کرلی جائے" قسم کی گفتگو کرنے کا سوچا۔ لیکن پھر عارف۔ صبا کی باتیں شروع کردے گا۔ جینی کو میم ثابت کرنے کی کوشش کرے گا۔ سدرہ کو بتادے گا۔ اور سدرہ کو کیسے سمجھایا جائیگا کہ جینی کیا ہے؟ یوں ولید نے اپنے دل

میں ہی جینی کے بارے گفتگو شروع کر دی تھی۔میم تو وہ تھی۔میموں کی طرح کپڑے پہنتی۔انہی کی طرح گفتگو کرتی۔مردوں سے ملتی۔امریکہ میں رہتی۔نوکری کرتی۔دو ایک بوائے فرینڈ بھی تھے اُس کے کسی زمانے میں۔!مگر نہ ماں زندہ ہے اور نہ والد صاحب۔اعتراض کون کرے گا۔اور پھر کسی کے اعتراض سے اب فرق ہی کتنا پڑتا ہے۔یہ تو اپنا من ہے جو شادی کے لفظ سے کتراتا ہے۔تو کیا ایک عورت کا ہی ہو کر رہنا پڑے گا ساری زندگی۔ایک کی بجائے دو تکیئے۔دو تولیئے۔سینما کی دو ٹکٹیں۔خریدنی پڑیں گی۔جائیداد سے لیکر زندگی کے ہر حصے کو دو حصوں میں تقسیم کرنا پڑے گا۔سب سے بڑھ کے یہ۔کہ مجھے جینی سے محبت ہے بھی کہ نہیں۔کیا وہ مجھے صرف اچھی لگتی ہے۔اور یوں وہ پرانا معمہ ولید کے سامنے آ کھڑا ہوتا۔کہ محبت کیا ہوتی ہے۔ہوتی بھی ہے کہ نہیں۔کیسے یقین دلایا جائے کہ محبت واقعی کسی علیحدہ سے جذبے کا نام ہے۔اور واقعی مجھے جینی سے ہوگئی ہے۔اور جو صبا کے ساتھ تھا۔وہ کیا تھا۔؟ پھر۔پہلی محبت۔دوسری محبت کے چکر میں ولید کا حسابی کتابی دماغ الجھ جاتا۔اور دوسرے کاموں کی ڈھیر ساری مصروفیت۔ایک سہارا بن جاتی۔وہ گہرائی میں سوچنے کے لئے فرصت کے لمحات تلاش کرتا۔جو اُسے کم ہی میسر آتے۔لہٰذا جینی سے محبت۔یا شادی۔؟ولید کسی بھی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔

دریں اثنا دونوں ملتے رہے۔کبھی کھانا کسی ریسٹورانٹ میں کھالیا کبھی گھومنے کسی اتوار کو اکٹھے چلے گئے۔کبھی دوستوں کے درمیان۔کبھی سینما ہال کی اندھیر کوٹھری میں۔کبھی کبھی جینی اپنے گھر "تمہارے لئے خاص کھانا بناؤں گی" کہہ کر ولید کو بلا لیتی۔اور کبھی "فلاں ریسٹورانٹ میں کھلاؤ نا کھانا" کہہ کر ضد کر دیتی۔ولید کے گھر میں عارف کی موجودگی لازمی تھی۔یوں جینی۔ولید سے ملنے اُسکے گھر شاذ و نادر ہی جاتی۔جب سے جینی کو عارف نے عورت کے بارے اُسکے اپنے خیالات کا بتایا تھا۔جینی کو عارف برا لگنا شروع ہوگیا تھا۔وہ سمجھ گئی تھی کہ عارف سے ولید کی دوستی اور وہ بھی بچپن کی۔ولید کو بہت عزیز تھی۔یوں کسی۔بحث میں الجھنے سے بہتر تھا کہ ولید کے گھر کو ہی بھول جاتے ہیں۔ولید سمجھتا تھا کہ جینی گھر میں اس لئے نہیں آتی کہ عارف گھر میں ہے۔اور پھر ایک نوکر ہوتا ہے۔اور جینی نہیں چاہتی تھی کہ ولید کے بارے میں کسی منفی سوچ کو گھر میں پنپنے کو موقع ملے۔ولید کو یوں جینی کا اپنے گھر نہ آنا اچھا لگتا تھا۔!

کچھ فیصلے ایک کھوج کی طرح ہوتے ہیں۔ہاں اور ناں کے بیچ کی کھوج۔اپنی خوشی اور

خوشی حاصل کرنے کے بعد والی تکلیف کا اندازہ لگاتی ہوئی کھوج۔ایک کنارے کو دوسرے کنارے پر فوقیت حاصل ہوتے دیکھ کر تیسرے کنارے کی کھوج۔ سچ اور حقیقی سچ کے بیچ آئے پُل کو پار کرتے ہوئے کنارے لگنے یا ڈوب جانے کے اندیشے میں کھوئی کھوج۔دوسرے شخص کی نسبت میں طاقت۔اور اپنی ذہنی طاقت میں سما جانے والی نسبت کے درمیان دل کی آنکھوں کو لگی کھوج۔!

ولید بہت سارا پیسہ بنانے کے بعد اُسکا استعمال کیسے کرنا ہے۔سوچ چکا تھا۔ اِس راستے میں اب اُسے کوئی قابل ذکر رکاوٹ نظر نہیں آ رہی تھی۔لیکن شادی کر کے۔بقول عارف کے۔" کم از کم اپنا جنازہ جائز کرنے کے لئے ہی آدمی کو شادی کر لینی چاہیئے"۔ولید شادی کرنا چاہتا تھا۔اور گھر بسا کر۔دو ایک بچے بھی پیدا کرنا چاہتا تھا۔مگر شادی کرنی ہے تو کس سے۔؟اِس کھوج میں وہ بالکل اکیلا تھا۔اپنے بارے میں۔اپنی زندگی کے ہر فیصلے کے بارے میں سوچتے ہوئے۔وہ ھمیشہ اکیلا تھا۔اُسے خبر تھی کہ انسان ازل سے اکیلا ہے۔عورت اور مرد۔ایک ساتھ بستر پر سوئیں تو بھی اُنکے خواب الگ الگ ہوتے ہیں۔اُسے خبر تھی کہ معاشرتی بندھن۔دوستیاں۔نسبتیں۔رشتے۔محبتیں۔ناطے۔اِس اکیلے پن کو بھٹکنے کے لئے سہولت کا ایک ذریعہ تھیں۔دماغ اور دل کے بیچ۔ہر موقع پر ابھر آنے والی کھوج۔اُسکے مشاق دماغ میں ایک خاص شکل سے ابھرتی تھی۔اور اُسکے مخلص دل میں یہ شکل۔ہر بار ایک نیا روپ دھار لیتی تھی۔

پھر سوالوں کا ایک جہان تھا۔جو اِس کھوج میں۔اُسکی سوچوں کو تار تار کر دیتا تھا۔بے یقینی حد سے گذرنے لگتی تھی۔ولید کئی طرح کے گمانوں میں گھِر جاتا تھا۔!

کیا شادی کے بعد میَں شرف الدین صدیقی اور میری بیوی مریم علی راجپوت بن جائے گی۔؟ بچوں میں ایک جیسا سلوک روا رکھا جا سکے گا؟ بیوی کے تمام حقوق ادا کئے جا سکتے ہیں؟ وہ میری ضروریات کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ۔میری خامیوں کو۔مجھے بتائے جتائے بغیر۔ھمیشہ ھمیشہ کے لئے قبول کر لے گی؟۔بچے امریکہ پلیں گے کہ پاکستان میں۔؟ میری بیٹی امریکہ رہ کر جینی بنے گی۔یا میرا بیٹا ولید بن کر پاکستان جائے گا۔؟ امریکہ میں رہ کر۔ایک بچہ۔شرف الدین صدیقی کی اولاد جیسا فرماں بردار۔تابعدار۔صوم وصلاۃ کا پابند۔نیچے نظریں کئے۔امتحان میں ھمیشہ اول آنے والا۔سچ اور دیانت داری کی تلوار پر۔ھمیشہ ھمیشہ ننگے پاؤں چل سکے گا؟ بیوی۔مریم علی راجپوت جیسی ہوتی ہے تو نیناں جیسی بھی بیویاں ہوتی ہیں۔ماموں حیدر کی

CS CamScanner

شادی۔؟ آنٹی تبسم کاان تھک انتظار۔سلواڈور دالی کی دیوار پر سکھائی جانے والی گھڑیوں کا انتظار۔ کیا سچ ہے؟ کیا سچ نہیں ہے؟اور جھوٹ کی اپنی بھی کوئی اہمیت تو ہوگی۔!انسان نے اپنے سارے رویّوں کوابھی سائنس اور منطق کے ترازوؤں میں تولا اور نہ کسی بڑے سچ پر اتفاق ممکن ہوا ہے۔

ولید شادی کا فیصلہ نہ کر پاتا۔!

یہی۔یا اسی طرح کی کوئی کھوج۔تسکین کو بھی لاحق تھی۔ولید دل سے چاہتا تھا کہ وہ رشید سے شادی کر کے گھر بسا لے۔دوسری طرف۔ایک عجیب سے خیال نے اُسے جکڑ رکھا تھا۔

اگر تسکین کو مَیں نے بتا دیا کہ میری شادی ہو چکی ہے۔ایک بیٹا بھی ہے۔تو اُسکا دل ٹوٹ جائیگا۔اور ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ۔اُس نے رشید سے شادی کر بھی لی تو کیا کمال ہوا۔؟ یہی سوچ کر۔تسکین کے بار بار سوال کرنے پر بھی۔ولید نے اپنی شادی کے بارے میں کبھی کچھ نہ بتایا تھا۔وہ کسی اور طریقے سے۔رشید اور تسکین کی شادی کروا دینا چاہتا تھا۔" آخر میری ذات اتنی کیوں اہم ہوگئی۔اور پھر مجھ سے کیوں پوچھا جائے کہ مَیں کون ہوں۔کیا ہوں۔میری شادی ہوئی ہے کہ نہیں۔میری ذات اتنی اہم نہیں ہے۔مَیں بے نام اچھا ہوں۔گم نام اچھا ہوں۔اتنے بڑے بڑے ناموں والوں نے اپنے کارناموں کی دھاک ساری دنیا پر بٹھانے کے بعد۔کیا کرلیا؟

صفحات پلٹ دیئے جاتے ہیں۔وقت آگے نکل جاتا ہے۔تاریخ کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا۔آنکھیں البتہ بدلتی رہتی ہیں۔بے بھروسہ تاریخ۔!

رات کے دو بج چکے تھے۔اور ولید کی آنکھوں میں نیند کا شائبہ تک نہیں تھا۔ابھی اُسے بچوں کے ٹسٹ چیک کرنے تھے۔سدرہ کو ای میل دے کر بتاتا تھا کہ وہ ٹھیک ہے۔اور امریکہ میں ہی۔کسی جگہ۔کسی بے نام سی جگہ پر۔کسی غیر معینہ مدت کے لئے۔ٹھہرا ہوا ہے۔لیکن وہ ٹھیک ہے۔" جھوٹ۔لیکن۔میرے اِس جھوٹ سے سدرہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔اِسکے بر عکس۔اُسکو خوشی ہوگی کہ اُسکا چھوٹا بھائی خیریت سے ہے"۔ولید نے سوچا اور سامنے پڑے کاغذوں کے بنڈل میں گم ہوگیا۔بالکل اُسی طرح۔جیسے بھری پُری دنیا میں۔اپنوں کے ہوتے ہوئے۔ولید اجنبی جگہ میں۔بہت سے اجنبی دوستوں میں گم ہوگیا تھا۔کسی خواب کی آبیاری کے لئے۔کسی قرض کو چکانے کے لئے۔کسی کھوج کے دریا کو پار کرنے کے لئے۔یا پھر اپنی ذات میں چھپے ازلی سوالات کا کوئی ممکنہ جواب ڈھونڈنے کے لئے۔!!

ꙮꙮꙮ

CamScanner

◎

رات جتنی گہری ہو۔ طویل ہو۔ اس نے ختم ہونا ہوتا ہے۔ کچھ راتیں لمبی مدت کے لئے بسیرا کر جاتی ہیں۔ انتظار طویل ہو جاتا ہے۔ سورج نکالنے اور اجالنے کے لئے دگنی چوگنی کوششیں کرنی پڑتی ہیں۔ مگر یہ طے ہے کہ دن نکل آتا ہے۔ کچھ لوگ رات کی طوالت کا گلہ ہی کرتے رہتے ہیں۔ کچھ سورج جلد نکل آنے کی دعائیں مانگنے لگتے ہیں۔ کچھ پورے دن کا انتظار کرنے کی بجائے اِدھر اُدھر سے چھوٹے چھوٹے دن اکھٹے کرنے لگتے ہیں۔ کچھ دن کے کبھی نہ نکلنے کا یقین کر کے رات کے تاریک دامن میں مایوسیاں لپیٹ کر دبکے رہتے ہیں۔ کچھ انوکھے لوگ رات کو رات سمجھنے اور رات ماننے سے ہی انکار کر دیتے ہیں۔ اور رفتہ رفتہ رات کے عادی ہو جانے کے بعد اسی کو اپنی قسمت کا دن گرداننے لگتے ہیں۔ کچھ کی خصلت میں حقیقت پسندی ‘جرأت اور اخلاص کی تکون ھمیشہ ایک ہلچل مچائے رکھتی ہے۔ یہ بے چین لوگ دن کی شکل دیکھے بغیر چین کا سانس لینا نہیں چاہتے۔ کشتیاں بناتے ہیں۔ پُل بناتے ہیں۔ پہاڑ کاٹتے ہیں۔ خاردار راستوں میں زخمی ہوتے ہیں۔ مگر رات کے آگے ماتھا نہیں ٹیکتے۔ کوئی ساتھ میں آئے کہ نہ آئے۔ اکیلے ہی کارواں بن جاتے ہیں۔ ایک لگن انہیں سونے نہیں دیتی۔ ایک جتن انہیں ہر حال میں لاحق ہوتا ہے۔ اردگرد کے ماحول سے بے پروا۔ یہ اپنے آپ میں مگن۔ رات سے جنگ جاری رکھتے ہیں۔ جونہی اس طرح کے لوگ ایک سے دو اور دو سے چار ہوتے ہیں۔ رات کا دامن سمٹنا شروع ہو جاتا ہے۔ اسے اپنے بچاؤ کی تدابیر سوچنی پڑ جاتی ہیں۔ دوسری طرف سورج کے زرد چہرے پر ایک پر امید مسکراہٹ ابھرتی ہے۔ اور یہ لوگ اپنے کاندھوں پر دن کی پالکی اٹھا کر غاروں سے نکلتے ہیں۔ زوروں کی بارش ہوتی ہے۔ سب کچھ جل تھل ہو جاتا ہے۔ اور بادلوں کی اوٹ سے سورج کی پہلی کرن رات کی موت کا اعلان کرتی ہے۔ یہ لوگ۔ اپنی طرح کے۔ دو پیروں پر چلنے والے دوسرے لوگوں کو دن نکل آنے کا یقین دلاتے ہیں۔ سوئے ہوؤں کو جگاتے

ہیں۔ جاگتے ہوؤں کو مبارک باد دیتے ہیں۔ اور اپنے تھکے۔ ٹوٹے۔ زخمی جسموں اور پر اعتماد روحوں کو ساتھ لے کر کسی اور رات سے نبرد آزما ہونے نکل پڑتے ہیں۔ دریں اثنا۔ بے شمار لوگ دن کا تاج اپنے سروں پر سجانے کے دعوے دار بن جاتے ہیں۔ کچھ کو تاج مل بھی جاتا ہے۔ اور تخریب کا ایک نیا سلسلہ چل نکلتا ہے۔ سیدھے راستوں کو بھول کر۔ اپنی "مرضی کے سیدھے راستوں" پر سب کو لے کر چلنا چاہتے ہیں۔ غرور آنکھوں پر پٹیاں باندھ دیتا ہے۔ طاقت مشکیں کس دیتی ہے۔ دولت پہلے بیڑیوں اور بعد میں سانپوں کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ انصاف کا قد آور گلاس چند لمحوں میں خالی ہو جاتا ہے۔ ظلم کو امن کی کتابوں سے حوالے نکال کر توجیہات گھڑی جاتی ہیں۔ انسان طاقت اور دولت کے نشے میں چور۔ حق غصب کرتا ہے۔ دوسروں کو کیڑے مکوڑے سمجھتا ہے۔ ہر کسی کو روندتا چلا جاتا ہے۔ اور پھر ناانصافی کے کسی نازک موڑ پر رات کا کنڈلی مارے سانپ اپنی پھنکار سے سارے میں زہر گھولنا شروع کر دیتا ہے۔ ساتھیوں پر الزام تراشی ہوتی ہے۔ وقت کا گلہ کیا جاتا ہے۔ نقصانات کے تخمینے نکالنے والے مصروف ہو جاتے ہیں۔ کل کے دوست آج کے دشمن بن جاتے ہیں۔ جہاں راج تھا۔ وہاں تاراج ہوتا ہے۔ محلات کی سازشیں۔ رات کی سانسیں اپنے وجود پر محسوس کرتے ہی سانپ گٹر کے کیڑوں کی طرح باہر آنا شروع کر دیتے ہیں۔ سورج کی گرمی' تپش' حدت' لو' سب کچھ چوس کر۔ رات اپنی حکمرانی کا اعلان کرتی ہے اور تاریخ اپنے آپ کو دہرانے کا وعدہ پورا کرتی ہے۔ کاغذوں پر نام بدل جاتے ہیں۔ ناموں کے کاغذ سنبھال کر رکھ لئے جاتے ہیں۔ موم بتیاں' چراغ اور دیئے بنانے والوں کا کاروبار چمکنا شروع ہو جاتا ہے۔ اور یوں رفتہ رفتہ سورج کی روشنی ماضی کے کسی گم گشتہ طاق پر دھری اُس شخص کی آمد کا انتظار شروع کرتی ہے۔ جو اپنی روح کے بے چین پن سے مجبور۔ ایک لگن۔ ایک جتن۔ میں مگن ہوگا۔ کشتیاں بنائے گا۔ پُل بنائے گا۔ اور پہاڑ کاٹ کر نئے راستوں کو کشید کرے گا۔ حقیقت پسندی۔ جرأت اور اخلاص کی تکون حرکت میں آئے گی۔ اور پھر رات اپنے بچاؤ کی تدابیر کیا کرے گی۔

***

◎
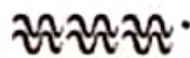
ستمبر 2001 کے بعد دنیا بھر کے ملکوں میں رہنے والوں کی سوچ اور اندازِ فکر پر اثر پڑا۔ خارجہ اور داخلہ پالیسیاں تبدیل ہوئیں۔ معاشیات میں اتھل پتھل ہوئی۔ ملکوں کے آپس کے تعلقات میں اتار چڑھاؤ تیزی کا شکار ہو گیا۔ انفرادی اور اجتماعی زندگیوں میں ایک ان دیکھا انقلاب آ گیا۔ ایک عجیب سی بے چینی۔ اور پھر اخباروں اور ٹی وی پر دکھائی جانے والی رپورٹیں۔! دنیا میں کہیں بھی رہنے والا کوئی بھی شخص "دہشت گردی" کے تصور سے آزاد نہیں تھا۔ لیکن اِس گاؤں میں رہنے والے لوگ امریکہ اور یورپ کی پالیسیوں اور خطے میں امن کی صورت حال کیسے پیدا ہوگی وغیرہ سے دُور۔ روزمرّہ کی زندگی سے نبرد آزما تھے۔ کبھی کبھی سیاست پر بات ہوتی۔ فلاں صدر اچھا تھا۔ اُس کے زمانے میں مہنگائی کم تھی۔ موجودہ حکومت نجانے کب گاؤں کی سڑک پکی کرائے گی۔ گاؤں کے کلینک میں دوائیاں نہیں ملتیں۔ بجلی کا بل زیادہ آتا ہے۔ سبزیوں کے دام شہر میں زیادہ نہیں لگ رہے۔ دہاڑیاں کم ہو گئی ہیں۔ یہی گاؤں کی "سیاست" تھی۔ اور یہی گاؤں کی "معیشت"۔ اِسی طرح کے مسائل گاؤں والوں کو لاحق تھے۔ بچے پیدا ہوتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی خوشیاں۔ شادیاں۔ اور پھر موت پر سب کا اکھٹے ہونا۔ ایک دوسرے کی زندگیوں میں دلچسپی لینا۔ آپس کی رنجشوں کو بھول کر مصیبت اور امتحان کے وقت ایک دوسرے کا ساتھ دینا۔ اور اچھے دنوں کے خواب دیکھنا۔ یہی گاؤں والوں کا رہن سہن تھا۔ یہی زندگی تھی۔

گاؤں میں سیلاب پہلے بھی آئے تھے۔ لیکن اِس مرتبہ سیلاب کی تباہ کاریاں گاؤں والوں کے لئے کسی آسمانی عذاب سے کم نہ تھیں۔ گندے پانی کے ایک بہت بڑے ریلے نے گاؤں کے کچے پکے مکانوں کی بنیادیں ہلا دیں۔ اٹھائیس کچے گھر توریلا اپنے ساتھ بہا کر لے گیا۔ جو مل گئیں وہ لاشیں ایک ساتھ دفنائی گئیں۔ چھ لوگ جن میں دو بچے بھی تھے۔ لاپتہ تھے۔ گاؤں والوں کے لئے یہ ستمبر 2001 تھا۔ جس وقت تک صوبائی حکومت کے ایک متعلقہ ادارے کے دو

اشخاص سرکاری کاروائی پوری کرنے گاؤں میں پہنچے اور نقصان کا تخمینہ لگانے کو "کوششیں" شروع کیں۔گاؤں والوں کا نقصان "پورا" ہو چکا تھا۔بھلا ہواُن تیس نو جوان لڑکے لڑکیوں کا۔ جو ایک گروپ کی شکل میں کہیں سے آگئے۔ اُنکے پاس سے کپڑے۔ پانی کو بوتلیں۔ دوائیاں۔کھانے پینے کی اشیاء اور زندگی کی دوسری ضروریات کی چیزیں۔اُنکے بکسوں سے نکلنی شروع ہوئیں۔ پندرہ دن یہ گروپ دن رات مدد میں لگا رہا۔اور سرکاری تخمینہ لگانے والوں کے آنے سے بہت پہلے اپنا کام کر کے چلا بھی گیا۔اِن نو جوانوں نے کوئی تقریر کی اور نہ کسی قسم کے شکریئے کی توقع رکھی۔مرہم پٹیوں سے فارغ ہوتے تو گپ شپ لگا کر مصیبت زدہ لوگوں کی ہمت بڑھاتے۔ ولید نے اِن نو جوانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے سب کو تعریفی خطوط دیئے۔ اُسے سیلاب کی اذیتوں میں مبتلا لوگوں کے دکھ سے جو ذہنی اور دلی صدمہ پہنچا تھا۔ اِن نو جوانوں کے بےلوث جذبہ کو دیکھ کر مستقبل کی ایک روشن امید میں بدلتا نظر آیا۔ابھی سب کچھ ختم نہیں ہوا۔ ابھی میرے ملک میں زندگی باقی ہے۔ابھی انسان زندہ ہے۔

گاؤں کا سکول۔سب کی پناہ گاہ بن گیا۔ولید نے ایک بس کا انتظام کیا جو شہر سے کھانا اور دوائیاں بھر کر لاتی۔اور وہ سارے لوگ جو اپنے گھروں کو اپنے سامنے بہتے دیکھ کر گم سم ہو گئے تھے۔شہر سے آئے لحافوں میں دبکے۔سکول کے اندر۔گرم کھانا کھاتے۔جس کی جتنی استطاعت تھی۔وہ مدد کر رہا تھا۔آنسو پونچھ رہا تھا۔ گلے لگا رہا تھا۔پورا گاؤں۔ایک بہت بڑا خاندان بن گیا تھا۔جس میں ہر کوئی۔اپنی بجائے۔دوسروں کی فکر میں لگا تھا۔لوگ آپس کی سب رنجشوں کو بھول گئے۔مصیبت میں سطحی باتیں مزید بے معنی ہو جاتی ہیں۔ جب زندگیاں خطرے میں پڑ جاتی ہیں تو انسان بڑے بڑے سچ بولتا ہے۔موت سامنے نظر آئے تو آنکھوں میں پاکیزگی اتر آتی ہے۔من صاف ہو جاتا ہے۔اور اُس وقت تک صاف رہتا ہے جب تک مصیبت پوری طرح سے غائب نہیں ہو جاتی۔!

دو مہینے لگ گئے۔زندگی رفتہ رفتہ معمول پر آنی شروع ہو گئی۔سوائے اُن لوگوں کی زندگی کے۔جن سے اُن کے پیارے اِس سیلاب میں چھن گئے تھے۔دیوار تو کھڑی کر لی۔چھت تو دوبارہ بنالی۔مگر چھ سال کی بیٹی کا سیلاب میں بہہ جانا۔کوئی کیسے سہہ سکتا ہے۔بھول سکتا ہے۔ اُسے اگر سفید لٹھے میں لپیٹ کر۔اپنے ہاتھوں قبر میں اتارتے تو شائد کوئی تسلی رہتی۔کہ یہیں

ہے۔قریب ہی اُسکی قبر ہے۔ اِس طرح اپنی آنکھوں کے سامنے۔ پانی۔اور پھر چھ سال کی بچی۔ آہستہ آہستہ اُس گلابی رنگ کی شرٹ میں بدل گئی۔ جو اُس نے پہنی ہوئی تھی۔ یہ منظر بھولنے کے لئے کیسی دیوار اٹھانی پڑتی ہے۔ کیسی چھت بنانی پڑتی ہے۔ ابھی انسان کی سمجھ میں نہیں آ سکا۔!

شرفو اور اُسکی بیوی سکول میں ولید اور ماسٹر پیراں وسائے کے پاس بیٹھے تھے۔ شرفو رو رہا تھا۔ اور اُسکی بیوی اپنے ہاتھوں میں اپنی بہہ جانے والی بیٹی کی شرٹ پکڑے گم سم تھی۔

"ہونی کو کون ٹال سکا ہے۔ صبر کریں۔ اللہ کو یہی منظور تھا"۔ ماسٹر نے تسلی دی

"ہماری بچی ہی کیوں۔؟ بتاؤ نہ باؤ۔ ہماری بچی نے کیا قصور کیا تھا" شرفو مسلسل رو رہا تھا۔

" آپ سے زیادہ پیار۔ اُس کے ساتھ اللہ نے کیا۔ اور واپس لے لیا۔ بیٹا تو بچ گیا۔ اِس کا شکر ادا کریں۔ بچے تو میرے نبیؐ کے بھی نہ رہے۔ کوشش کریں گے تو تسلی ہوگی۔ خود بخود تسلی اور حوصلہ نہیں آ جاتے۔ اور بیٹے کے سامنے اپنے دکھ کو چھپائیں۔ اُسکے پانچ سالہ دماغ میں تصویریں جم جائیں گی۔ چند دنوں میں سکول دوبارہ شروع ہوگا۔ اُسے ناغہ نہ کرائیں۔ روزانہ سکول بھیجیں"۔ ولید کے لہجے اور آواز میں بے پناہ اعتماد تھا۔

" تمہاری اپنی اولاد ہوتی تو میں پوچھتی۔ کیسی مشکل باتیں کر رہے ہو"۔ گم سم ماں نے اچانک آنکھیں جھپکیں اور زمین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

بچے سب کے سانجھے ہوتے ہیں بہن۔ سب کو دکھ ہے۔ اور آپ کا دکھ بہت بڑا ہے۔ کوئی کچھ بھی کر لے۔ آپکی بیٹی واپس نہیں لا سکتا۔ یہ دکھ آپ کو سہنا پڑے گا۔ روئیں۔ خوب روئیں۔ لیکن اتنا بھی نہیں کہ ناشکری ہو جائے۔ آپ نے اُسے جنم دیا تھا۔ مگر پیدا تو اُسے اوپر والے نے کیا تھا۔ اُسی نے۔ جس نے آپ کے بیٹے کو بچا لیا ہے۔ آپ کو اور شرفو کو زندہ رکھا ہے۔ ساجھے کسان کا سوچیں۔ اُسکے بیٹے کے ساتھ اُسکی بیوی بھی نہ رہی۔ اب وہ اِس دنیا میں بالکل اکیلا ہے۔ خوشی اور غم ساتھ ساتھ ہیں۔ ناشکری نہیں۔ بالکل نہیں"۔ ولید بات کرتے کرتے کہیں کھو سا گیا تھا۔

سولہ سترہ سال کے ایک لڑکے نے آ کر شرفو کو دو کمبل اور کھانے کے دو پیکٹ تھما دیئے۔ ماسٹر صاحب نے "بس آخری آخری چیزیں ہیں" کہہ کر شرفو کی طرف دیکھا۔ جس نے

چیزیں لیتے ہوئے ولید کی طرف دیکھا۔

"باؤ جی۔ کیا آپ انسان ہیں۔ آپ کون ہیں صاب جی" شرفو کو شکریہ ادا کرنا نہیں آ رہا تھا۔

"میں انسان ہوں۔ اور آپ جیسا ہی ہوں۔ زیادہ نہ سوچیں۔ کسی اور چیز کو ضرورت ہوئی تو بتائیے گا۔ میرے لئے دعا بھی کیجئے گا"۔ ولید نے کہا اور اجازت لیتے ہوئے وہاں سے اٹھ گیا۔ اُسکی آنکھوں میں آنسو تھے۔ جو سیلاب میں بہہ جانے والی بچی کو سوچتے ہوئے کہیں سے امڈ آئے تھے"۔ بعضے گمان گناہ ہوتے ہیں"" میری بچی ہی کیوں" وہ شرفو کو کیسے بتاتا کہ زندگی ابھی پوری طرح کسی کی سمجھ میں بھی نہیں آئی۔ سوالات کا ایک ہجوم ہے۔ انبوہ ہے۔ انبار ہے۔ اور ٹھیک طرح سے جواب ہی نہیں رہے۔ وہ اپنے آنسو اِن غمزدہ ماں باپ کو دکھا کر انہیں مزید دکھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اِسی لئے وہاں سے اُٹھ آیا۔

" کیوں" کا جواب ولید کو کبھی نہ ملا تھا۔ میرا باپ جہاز میں کیوں نہ بیٹھ سکا۔ ماں نے ساری زندگی کوئی شکائت کیوں نہ کی۔ بیٹوں نے ماں کو اپنے ساتھ کیوں نہ رکھا۔ صبا نے ہاں یا ناں کی رٹ کیوں لگا رکھی تھی۔ جینی کو یہ جان لیوا مرض کیوں لاحق ہوا۔ دل کو تسلی آخر کیوں نہیں ہوتی۔ لوگ صرف اپنے بارے میں ہی کیوں سوچتے ہیں۔ اپنے اپنوں کو دھوکہ کیوں دیتے ہیں۔ سامنے نظر آتی ذمہ داری لوگ کیوں پوری نہیں کرتے۔ اتنی زیادہ ترقی ہونے کے باوجود بھی اندر کی تنہائی کیوں گہری ہوتی جاتی ہے۔ سب کچھ ہوتے ہوئے اور کچھ بھی پاس نہ ہوتے ہوئے۔ دونوں صورتوں میں کیوں چین نہیں آتا۔" کیوں" کا جواب ولید کے پاس نہیں تھا۔ اپنے گھر کی طرف جاتے ہوئے وہ ایک فیصلہ بہر حال کر چکا تھا۔" ظہیر پڑھنے کے لئے امریکہ جائے گا"۔ اور ایک مسکراہٹ۔ ولید کے تھکے ہارے چہرے پر آئی۔ جسے اُس گہری ہوتی شام کے علاوہ۔ شائد اُسکی ماں کی روح نے دیکھا ہو۔ جس نے ولید کو" کیوں" کا جواب تو نہ سکھایا۔ لیکن " کیا" اور " کیسے" سے نمٹنے کی تربیت ضرور دی تھی۔!

ﷲﷲﷲﷲ

Mir Zaheer Abass Rustmani

CamScanner

◎

گاؤں میں ٹیلی فون کی سہولت میسر تھی۔ کال بک کرا کے دوسرے شہر یا دوسرے ملک بات کی جا سکتی تھی۔ مگر لائینوں میں کوئی نقص ایسا تھا کہ بات ہوتے ہوتے اچانک غیر مانوس سی آوازیں آنی شروع ہو جاتی تھیں۔ ولید نے سیل فون لے رکھا تھا۔ جسے وہ خاص خاص وقتوں میں آن کرتا تھا۔ ورنہ باقی چیزوں کی طرح اُسکے صندوق میں بند پڑا رہتا تھا۔ جینی سے انٹرنیٹ پر بات ہوتی تھی۔ یا پھر ای میل کے ذریعے۔ !ولید نے جینی کو سمجھا رکھا تھا کہ chat کرتے وقت کوئی ٹیلی فون نمبر نہیں دینا۔ اصلی نام نہیں بتانے۔ کوئی اتہ پتہ نہیں دینا۔ دونوں نے مختلف کوڈ بنا رکھے تھے۔ یوں اگر اُن دونوں کی باتیں کوئی اور "پڑھ" رہا ہو تو اُسے سمجھنے میں مشکل پیش آئے۔

"دوائی بدلنے سے کوئی فرق پڑا"۔ ولید نے ٹائپ کیا

"کوئی خاص نہیں۔ تم سناؤ۔ ظہیر کا پاسپورٹ بن گیا؟ میں نے اپنی ایک دوست کے ذریعے ویزے وغیرہ کا بندوبست کرا دیا ہے۔ سپانسر شپ خط امریکی ایمبسی کو بھجوا دیا جائے گا۔ باقی تم دیکھ لینا"۔ جینی کا جواب آیا

"ظہیر کے ماں باپ مان گئے ہیں۔ ہمارا بیٹا اور ظہیر اکھٹے پڑھیں گے۔ اور یاد رکھنا۔ بیٹے کو پاکستان کے بارے میں ہمیشہ بتاتی رہنا۔ اپنی جڑوں کو ھمیشہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کیسا ہے وہ۔؟"

"بہت خوش ہے۔ خاص طور پر جب سے اُسے پتہ چلا ہے کہ اِس fall میں وہ پاکستان جائے گا۔ اُس نے اپنا بیگ ابھی سے بنانا شروع کر دیا ہے۔ کہتا ہے ڈیڈی کو واپس امریکہ لے کر آؤں گا۔ دیکھ لو۔ تمہارا بیٹا ہے۔ ضدی تو ہوگا"۔

"وہ تمہارا بھی بیٹا ہے۔ اِس لئے جلدی سمجھ جائے گا۔ کہ ڈیڈی کے ایک دو کام باقی ہیں۔ جو اُس نے خود کرنے ہیں۔ اور پھر یہ کام ہوتے ہی تم دونوں کے پاس آؤں گا۔ وہاں رہیں

CamScanner

گے یا واپس یہاں آ جائیں گے۔ یہ وقت آنے پر مل کر سوچیں گے "

" کون سا وقت۔؟ تم اور تمہارا بیٹا۔ تم دونوں سوچنا۔ میرے تو یہ آخری دن ہیں۔ اور پلیز۔ مجھے تسلیاں نہ دینا۔ کہ جینی۔ تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔ میں جانتی ہوں میں نے اپنے حصے کا جی لیا ہے"۔

" ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ نہیں دیتا تسلیاں۔ لیکن تم ایک بہادر لڑکی ہو۔ یہ تو کہہ سکتا ہوں ناں۔! تم دل سے اجازت نہ دیتی۔ تو میں یہاں کیسے رہ سکتا تھا۔؟ یہ بہادری ہی تو ہے۔!"

"او کے۔ او کے۔ مسکے نہ لگا ناں اب۔ وہیل چیئر سے اٹھ کے چل سکتی تو کب کی تمہارے پاس آ چکی ہوتی۔ تم سے خوب خدمت کراتی۔ اور تمہارے سکول میں پڑھاتی۔ تمہارے خواب پورے کرنے میں۔ اس سارے عمل میں تمہارے ساتھ رہتی۔ لیکن۔ اب تو بستر سے بھی نرس کی مدد کے بغیر اٹھ نہیں سکتی۔ تم کبھی کبھی بہت یاد آتے ہو۔ بس نہیں چلتا۔ جی چاہتا ہے اڑ کر تمہارے پاس آ جاؤں۔ ذرا رکنا۔ یہ میرے بستر....."

" تم ٹھیک تو ہو ناں۔؟ ولید نے جلدی جلدی ٹائپ کیا۔ اور اگلے دو منٹ کی خاموشی۔ اور دوسری طرف سے کسی جواب کے نہ آنے سے اُس کی بے چینی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اُس نے جلدی سے صندوق کھولا۔ سیل فون کو آن کیا۔ اور نمبر ملاتے ہوئے۔ اُس کی نظر اپنے لیپ ٹاپ پر ہی رہی۔

"او کے۔ آئی ایم بیک"۔ جینی کا جواب آ گیا

" کیا ہو گیا تھا۔؟ تم ٹھیک تو ہو ناں؟"

سب ٹھیک ہے۔ نرس کو بلا لیا تھا"۔

"میرا خیال ہے تم اب آرام کرو۔ پھر بات کریں گے۔ ابھی ایک ای میل دوں گا۔ اُسے پڑھ کے عارف سے بات کر لینا۔ میرا خیال ہے ظہیر کے سکول وغیرہ کا بندوبست عارف کو کرنے دیتے ہیں۔ اُسے بھی یہ میل جائے گی۔ لیکن تم اُسے فون پر سب کچھ سمجھا دینا۔ دوسروں کا بیٹا ہے۔ اس لئے اپنے بیٹے سے زیادہ عزیز رکھنا پڑے گا۔ بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ دعا کرو۔ سب ٹھیک رہے۔ اپنا خیال رکھنا۔ خدا حافظ"۔

"خدا حافظ"

CamScanner

لیپ ٹاپ گود سے نکل کر میز پر آ گیا۔ اور ایک طویل ای میل کچھ دیر بعد جینی اور عارف کو چلی گئی۔ ظہیر کے ائیر پورٹ سے گھر۔ سکول۔ بورڈنگ۔ اخراجات۔ بنک اکاؤنٹ۔ عارف کی نگہداشت۔ سکول کی بس سے لیکر لنچ بکس اور یونیفارم سے لیکر سوئمنگ سوٹ تک۔ چھ صفحوں کی اُس ای میل میں ولید نے عارف اور جینی کے ذمے۔ ظہیر کے اگلے پانچ سال لگاتے ہوئے شائد ہی کوئی تفصیل چھوڑی ہو۔ اُسے یاد آیا کہ کیسے برسوں کی محنت اور تگ و دو کے بعد وہ امریکہ جا سکا تھا۔ کیسے کیسے جتن کرنے پڑے تھے۔ پاپڑ بیلنے پڑے تھے۔ ساتھ ہی اُسے خوشی ہو رہی تھی کہ ظہیر۔ اِن تمام مصیبتوں سے دور رہے گا۔ امریکہ جائے گا۔ لائق تو وہ ہے ہی۔ لہٰذا اچھے ریزلٹ لائے گا۔ اور پھر ایک دن باہر کی تعلیم سے آراستہ واپس گھر آئے گا۔ اور شائد۔ شائد۔ کسی ایک ولید۔ یا کسی ایک ظہیر۔ کو اِس قابل کر سکے۔ کہ وہ دوسروں کے کام آ سکے۔ ظہیر اور اُسکے والدین سے وہ ایک وعدہ لے چکا تھا۔ ظہیر۔ امریکہ سے پڑھ کے پاکستان آئے گا۔ اور کم از کم دس سال تک اپنے گاؤں میں رہے گا۔ گاؤں کے بچوں کی تعلیم و تربیت میں مدد دے گا۔ اور اپنے ماں باپ کی خدمت۔ اپنے ہاتھوں سے کرے گا۔

غریب والدین نے۔ جن کے پاس بیٹے کو شہر میں پڑھانے کے پیسے نہ تھے۔ امریکہ کی تعلیم اور اگلے کئی برسوں کے خرچے کا سودا۔ صرف ایک وعدے سے کرنا تھا۔ جو انہوں نے پوری ایمانداری سے کیا۔ ولید کو یقین تھا کہ ظہیر اور اُسکے ماں باپ۔ اِس وعدے کو ضرور نبھائیں گے۔!

....

بچپن صرف ایک مرتبہ آتا ہے۔ جیسے جوانی اور بڑھاپا۔ صرف ایک ایک مرتبہ ہی نصیب ہوتے ہیں۔ بچپن میں وہ سب کچھ کرنا چاہئیے جو بچے کرتے ہیں۔ یا جو بچوں کو کرنا چاہئیے۔ بچپن میں کسی قسم کی کمزوری رہ جائے۔ تو وہ جوانی اور بڑھاپے میں تنگ کرتی ہے۔ کبھی کبھی یہ کمزوری ایک نفسیاتی عفریت کا روپ دھار لیتی ہے۔ سوچ کے انداز بدل دیتی ہے۔ ہم سے زیادتیاں سرزد کراتی ہے۔ اور کچھ دیر بعد ہماری فطرت کا حصہ بن جاتی ہے"۔ ولید اپنے سکول کے تمام اساتذہ اور ہیڈ ماسٹر پیراں دسائے کے ساتھ چھ ماہ کے بعد آنے والی "سٹاف میٹنگ"

میں مصروف تھا۔ سب بڑے انہماک سے سُن رہے تھے۔ چائے اور بسکٹوں کے ساتھ سموسے بھی تھے۔ "سٹاف میٹنگ" والے دن بچوں کی چھٹی ہوتی تھی۔ یہ دن خاص تھا۔ سکول کی ہدائت کے مطابق سال میں دو مرتبہ۔ اِس دن۔ اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں اور ہمسائیوں کی خدمت میں گزارتے۔ کوئی بھی گھر چُن لیتے۔ اپنا یا کسی اور کا۔ اور پورا دن کسی بزرگ کی خدمت کرتے۔ بیمار کو دوائی کھلاتے۔ سودا سلف لا کے دیتے۔ گاؤں کے تمام بوڑھے۔ اِس دن کے لئے۔ بچوں کی راہ دیکھتے۔ کئی کام اکھٹے کر لیتے۔ خاص طور پر وہ جن کی اولاد اُن کے پاس نہ تھی۔ اِس دن کا خاص انتظار کرتے۔ ایک دن کے لئے ہی سہی۔ اُن کو ایک بیٹا۔ یا ایک بیٹی مل جاتی۔ جو قمیض میں بٹن ٹانک دیتی۔ چائے بنا دیتی۔ پاؤں کے ناخن تراش دیتی۔ سلیقے سے بستر بنا دیتی۔ اور کبھی کبھی۔ کھانا بھی بنا دیتی۔!

دوسری طرف۔ سب سے اچھا کام کرنے پر پہلا۔ دوسرا اور تیسرا انعام بچوں کو ملتا۔ کبھی کپڑے۔ کبھی کتابیں۔ اور کبھی نقد انعام۔ بچے۔ اِس دن خوب دل لگا کر خدمت میں مصروف رہتے۔ ایک طرف استاد کی شاباش۔ دوسری طرف کسی بزرگ کی گرمجوش مسکراہٹ۔ اور سب سے بڑھ کے انعام ملنے کی خواہش اور امید۔!

"ماضی سے دوستی کر لینا۔ بڑا مشکل کام ہے۔ لیکن ھماری کوشش ہونی چاہیے کہ ماضی سے دوستی کر لیں۔ یوں ہمارا حال۔ ہمارے لئے نئے دروازے جنم دیتا ہے۔ جو سیدھے مستقبل کی طرف کُھلتے ہیں۔ بچوں کی تعلیم و تربیت کرتے وقت ہمیں ذہنی اور جسمانی طور پر۔ مکمل صحت مند رہنا چاہیے۔ ہماری کہی ہوئی۔ یا کی ہوئی۔ کوئی ایک حرکت۔ بات۔ بچوں کے ذہن میں بیٹھ سکتی ہے۔ اُن کی زندگی بدل سکتی ہے۔ for better or worse! ۔ احتیاط بہت ضروری ہے۔!

دیکھیں۔ محسوس کریں۔ جو ذرا کمزور ہے۔ اُسے مضبوط کریں۔ یوں کہ خود اُسے بھی خبر نہ ہو۔ جو مضبوط ہے۔ اُسے سیدھے راستے پر رکھیں۔ یوں کہ اُسے معلوم نہ ہو۔ جو خوفزدہ ہے اُس کا خوف دور کریں۔ اُس کے خوف میں سے خود گذریں۔ محسوس کریں۔ اور پھر محبت سے علاج کریں۔ محبت میں طاقت ہے۔ جیسے نیکی میں طاقت ہے۔

ماسٹر عدیل۔ آپ چائے بنائیں۔ اور دیکھیں سموسے ٹھنڈے ہو رہے ہیں"۔ ولید نے اچانک محسوس کیا کہ اُن سموسوں کی طرح اُسکے ہاتھ بھی ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔

اُسکے دونوں بازوؤں میں اچانک ایک عجیب سادرد اٹھا۔ دو تین گہری پسینے کی لکیریں اُسکے ماتھے اور کنپٹی پر ابھریں۔ چھاتی پر داہنا ہاتھ رکھتے ہوئے وہ پاس پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"سر آپ ٹھیک تو ہیں ناں"۔ ماسٹر عدیل نے چائے کا کپ ولید کو تھماتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔ بس ذرا طبیعت گھبرا رہی ہے۔ میرا خیال ہے۔ مجھے کچھ آرام کرنا چاہیے۔ گھر چلتا ہوں۔ آپ سے کل ملاقات ہوگی"۔ ولید نے سب کو خدا حافظ کہا اور سٹاف روم سے نکل آیا۔ دروازے سے نکلتے ہوئے اُسکا پاؤں ذرا سا رپٹا۔ چار اساتذہ اُسکو تھامنے کے لئے لپکے۔

"مَیں ساتھ چلتا ہوں۔ سر"۔ ماسٹر کامران نے ولید کا بازو تھامتے ہوئے کہا

"نہیں۔ مَیں چلا جاؤں گا۔ شکریہ"۔ ولید نے پتلون کی جیب سے رومال نکال کر ماتھے پر آئے پسینے کو پونچھا۔ ہلکی سی لڑکھڑاہٹ قدموں میں۔ اور ولید کے لئے یہ سب کچھ نیا تھا۔ اُس نے سوچا شائد ناشتے میں کوئی چیز ایسی تھی۔ جو کھالی ہے اور اب اپنا اثر دکھا رہی ہے۔ سکول سے اُسکے گھر کا راستہ تقریباً بیس منٹ کی واک تھی۔ یہ بیس منٹ آج ختم ہونے کو نہیں آرہے تھے۔ اچانک ایک بڑی سی ابکائی آنے پر ولید زمین پر بیٹھ گیا۔ چلو۔ اُلٹی آجائے گی۔ جو کچھ ہے نکل جائے گا۔ لیکن کافی دیر بعد بھی اُسے اُلٹی نہ آئی۔ چھاتی میں درد بڑھنا شروع ہوگیا۔ بائیں بازو میں ایک زور کی سنسناہٹ ہوئی۔ اور ولید کے دماغ میں سینکڑوں گھنٹیاں بجنے لگیں۔ "ہارٹ اٹیک"۔ اور آس پاس کسی ذی روح کے نہ ہونے۔ اکیلا ہونے۔ اور ہارٹ اٹیک کے تصور سے۔ ولید کی نبض ڈوبنے لگی۔ نائٹروگلسرین۔ اُسے یاد آیا کہ اُسکے فرسٹ ایڈ بکس میں ایک دوائی ہے۔ جو شائد مدد کرے۔ لیکن گھر پہنچا کیسے جائے۔؟

اپنی پوری توتیں مجتمع کرنے کے بعد۔ وہ تقریباً کھڑا ہوا۔ کمر میں کچھ جھکاؤ تھا۔ اِس لئے سامنے دیکھنے کے لئے اُسے اپنی آنکھوں کو اوپر کی طرف کر کے دیکھنا پڑا۔

چند قدم اور۔ اور پھر دور سے اُسے اپنے گھر کا ہیولہ سا نظر آیا۔ دروازے کے باہر کھڑی مریم راجپوت مسکرا رہی تھی۔ ایک طرف جینی اور دوسری طرف صبا کھڑی تھیں۔ اُن تینوں کے سامنے کرسیوں پر بیٹھے لوگوں کو اُس نے پہچاننے کی کوشش کی۔ عارف۔ والد صاحب۔ ظہیر۔ "ماں"۔ ولید کے حلق سے ایک چیخ نکلی۔ اور اپنے گھر سے چند قدموں کے فاصلے

CS CamScanner

پر علم و ہنر کا وہ پہاڑ آہستہ آہستہ زمین بوس ہونے لگا۔

"او۔ کھلو جا باؤ۔ مَیں آیا"۔ یہ آواز بڈھے فقیر کی تھی۔ جس نے دُور سے ولید کو زمین پر گرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ برق رفتاری۔ جس سے بڈھا فقیر۔ ولید تک پہنچا۔ خود اُسکے لئے بھی نئی تھی۔ وہ زور زور سے چلّا رہا تھا۔ "اوئے مر جانیو۔ کتھے او۔ او۔ ایہہ دیکھو تے سہی۔ نا ردو۔ پنڈ والیو۔ کتھے مر گئے او"۔ اور ساتھ ہی ولید کے بدن کو چاروں طرف سے محسوس کرتے ہوئے کبھی اُسکے دل پر ہاتھ رکھتا۔ کبھی نبض دیکھتا۔ اور کبھی انگلیوں سے ولید کی ناک سے نکلتی سانس کو محسوس کرنے کی کوشش کرتا۔ زندگی کی کوئی ایک رمق بھی نظر نہ آنے پر اُس نے آہستگی سے ولید کو دونوں ہاتھوں میں اٹھایا۔ اور اُسکے گھر کی دہلیز پر لٹا دیا۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ اور آہستہ آہستہ سکول کی طرف چلنے لگا۔ اُسکی بڑبڑاہٹ صرف اُس کو سنائی دے رہی تھی۔

"مار دیا۔ تمہیں مار دیا۔ جانوں مار دیا۔ تمہیں کہا تھا یہاں سے چلے جاؤ۔ تمہیں کہا تھا....."

ٹھیک آٹھ سال پہلے۔ جب ولید گاؤں میں آیا تھا تو کسی نے اُسکی آنکھیں کھولنے کے لئے اُس کے چہرے پر پانی چھڑکا تھا۔ ٹھیک آٹھ سال بعد۔ گاؤں والے اُسکے بدن کے پاس جمع تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اِس مرتبہ پانی چھڑکنے سے ولید نے آنکھیں نہیں کھولنی تھیں۔ ایک عجیب چیخ و پکار۔ ایک عجیب پُراسرار ماحول۔ گاؤں کے لوگ سب کچھ بھول بھال کر ولید کے چاروں طرف کھڑے تھے۔ لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ حد تو یہ تھی کہ مسجد میں اذان دینے والے دونوں موذن۔ بھول گئے کہ مغرب کی اذان اور نماز کا وقت کب کا گذر چکا تھا۔ سارے کا سارا گاؤں سکتے میں آ چکا تھا۔ جیسے روح ولید کا بدن چھوڑ کر نہیں نکلی۔ گاؤں کے جسم سے نکل گئی ہے۔

ꝏꝏꝏ

Mir Zaheer Abass Rustmani

CamScanner

◎

"ماں کہا کرتی تھی کہ شیشہ ٹوٹنا اچھا شگون نہیں ہوتا۔ اللہ خیر کرے"۔ سدرہ نے دیوار سے گرے شیشے کے ٹکڑے جھاڑو سے اکھٹے کرتے ہوئے سوچا۔ "پتہ نہیں یہ توہمات ہیں کہ سچ ہے۔ کوئی سائنسی وجہ تو نہیں لگتی۔ بھلا کسی چیز کے ٹوٹنے کا ہمارے نصیبوں سے کیا تعلق۔؟"۔ سدرہ بڑے بڑے ٹکڑے ٹوکری میں ڈال کر اب چھوٹی چھوٹی کرچیوں کو اکھٹا کر رہی تھی۔ دروازے پر زور سے دستک نے اُس کے خیالات کو دیو مالائی قصوں کی دنیا سے واپس لانے کا کام کیا۔

" کون ہے" سدرہ نے اپنا دوپٹہ سنبھالتے ہوئے دروازے کا رخ کیا۔ دروازے کا پٹ ذرا سا کھول کر اُس نے اُن اجنبی چہروں کو غور سے دیکھا اور پہچان کے آئینے میں کسی مانوس عکس کے نہ ابھرنے سے اُس کے ماتھے پر سوالیہ شکنیں ابھرنے لگیں۔

"جی۔ فرمائیے۔ کس سے ملنا ہے"۔ سدرہ نے اب دروازہ پورا کھول دیا تھا۔

"میرا نام سلمان ہے اور یہ تسکین ہے۔ آپ سدرہ ہیں ناں؟"

"مئیں تو سدرہ ہوں مگر آپ۔؟"

"اجازت دیں تو اندر آ جائیں۔ ٹرین کا لمبا سفر۔ پورے چوبیس گھنٹے۔ ہم آپ سے باؤ ولید کے بارے بات کرنے آئے ہیں"۔ سلمان اور تسکین کے چہروں سے تھکاوٹ اور افسوس۔ دونوں کی ملی جلی کیفیت عیاں تھی۔

"اندر آئیے۔ آپ ولید کو کیسے جانتے ہیں"۔ سدرہ نے راستہ چھوڑتے ہوئے مہمانوں کو ڈرائینگ روم میں لاتے ہوئے پوچھا۔

"سیالکوٹ کے پاس ایک گاؤں ہے۔ ہم وہاں سے آئے ہیں"۔ سلمان نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے چاروں طرف کمرے پر ایک گہری نظر ڈالتے ہوئے کہا

CamScanner

" آپ تو میرے شہر سے آئے ہیں۔کیسا ہے سیالکوٹ؟اور کس گاؤں سے آئے ہیں آپ"

" کچھ دنوں تک تو اُس گاؤں کا کوئی نام نہیں تھا۔لیکن اب ہے۔ہم "باؤ ولید گاؤں" سے آئے ہیں"

"باؤ ولید گاؤں"۔میرے بھائی کے نام پر کسی گاؤں کا نام۔؟"سدرہ حیران ہو رہی تھی۔

" آپ نے آخری مرتبہ باؤ ولید سے کب بات کی۔؟" تسکین نے سوال کیا

"دو ہفتے قبل اُسکی ای میل آئی تھی۔اور میری ای میل کا جواب اُس نے نہیں دیا۔بہت مصروف رہتا ہے۔لیکن آپ مجھے۔ولید خیر سے تو ہے ناں۔؟"

"باؤ ولید کی ڈائری سے ہم سیالکوٹ میں آپ کے پرانے گھر گئے۔وہاں سے آپ کا پتہ ملا۔ٹیلی فون نمبر نہ مل سکا۔اس لئے آپ کو اطلاع دیئے بغیر آ گئے"۔سلمان نے کہا

" آپ ولید کو کیسے جانتے ہیں۔اُسکی ڈائری آپکو کہاں ملی۔؟وہ تو امریکہ میں ہے۔کیسا ہے میرا بھائی۔؟"سدرہ کی آواز میں اچانک ایک عجیب سی کپکپاہٹ در آئی تھی۔

"باؤ ولید پچھلے آٹھ سال ہمارے گاؤں میں رہے۔اُنہوں نے اِس مختصر عرصہ میں ایسے ایسے کام کئے جو لوگ ساری زندگیاں بتا کر بھی نہیں کر سکتے۔"باؤ ہائی سکول" کے بارے میں آپ نے سُنا ہوگا۔؟"

"ہاں۔ٹی وی پر ایک رپورٹ دیکھی تھی۔کہ کسی گاؤں میں یہ سکول ہے۔اور اِسکے بچے ٹاپ کرتے ہیں"۔

"جی۔یہ "باؤ ہائی سکول" اب "باؤ ولید ہائی سکول" ہے۔ہمیں باؤ کا اصل نام اُن کے جانے کے بعد معلوم ہوا"

"جانے کے بعد۔؟کہاں جانے کے بعد۔؟کہاں گیا ہے ولید"

"وہ اب ہمارے ساتھ نہیں رہے۔دو ہفتے قبل اچانک طبیعت خراب ہوئی۔ڈاکٹر نے کنفرم کیا ہے کہ یہ ہارٹ اٹیک......

" کیا بکواس کر رہے ہیں آپ۔؟آپ کو معلوم ہے آپ کیا کہہ رہے ہیں۔آپ میرے بھائی کی بات کر رہے ہیں۔مَیں بہن ہوں اُسکی۔آپ کو یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔آپ

CamScanner

جا سکتے ہیں"۔ سدرہ نے صوفے سے اٹھتے ہوئے نہائت غصے سے کہا۔ اُس کا پورا وجود کانپ رہا تھا۔!

"مجھے بہت افسوس ہے۔ بلکہ یہ لفظ "افسوس" صحیح طور پر ہم سب گاؤں والوں کا دُکھ بیان نہیں کر سکتا۔ ہم نے بہت سوچا کہ آپ کو بتائیں کہ نہ بتائیں۔ لیکن۔ گاؤں کے سب بڑوں کا یہ متفقہ فیصلہ تھا کہ باؤ ولید کے گھر والوں کی تلاش کر کے اُن کو بتانا چاہیئے۔ باؤ کے بھائی طلحہ۔ اور حمزہ....."

"چپ ہو جاؤ۔ آگے کچھ مت کہنا۔ مَیں تمہاری جان نکال دوں گی۔ نکل جاؤ میرے گھر..... "اور سدرہ فقرہ پورا کرنے سے پہلے ہی دھڑام سے قالین پر گر گئی۔ اُسکا پورا بدن کپکپا رہا تھا۔ تسکین نے سدرہ کا سر اپنے زانو پر رکھا اور سلمان کو پانی لانے کا کہا۔ اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے تر بتر تھیں۔ سدرہ کے ردِعمل نے اُسے اچھی طرح سے بتا دیا کہ یہ کیسا بھائی تھا جو مر گیا۔ اور یہ کیسی بہن ہے جو اب بے ہوش ہو گئی ہے۔ "تم نے جیتے جی بھی مجھے رلایا۔ اور اب مرنے کے بعد بھی رُلا رہے ہو"۔ تسکین نے سوچا اور پانی کا گلاس سلمان سے لے کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد بھی سدرہ کو ہوش نہ آیا۔ اِس عرصہ میں تسکین نے کچن سے اپنے اور سلمان کے لئے چائے بنائی۔ اور دونوں اِس نہائت اجنبی ماحول میں سدرہ کے آنکھیں کھولنے کا انتظار کرنے لگے۔ تقریباً دو گھنٹے بعد سدرہ کو ہوش آیا۔ دو ایک فقرے بول کر وہ پھر بے ہوش ہو گئی۔ لگ بھگ چار بجے سہ پہر سدرہ کا بیٹا کالج سے واپس آیا تو دو اجنبیوں کو اپنی ماں کے گرد بیٹھا دیکھ کر خاصا گھبرایا۔ سلمان نے اُسے پوری کہانی سنائی۔ اور کہا کہ ماں کو ہوش آنے پر پریشان نہیں ہونے دینا۔ ایسے وقتوں میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔!

رات گئے سدرہ کو مکمل ہوش آیا۔ اور اب ڈرائنگ روم میں بے شمار کیلنڈروں کے درمیان۔ سدرہ۔ سلمان اور تسکین کو ولید کے بچپن۔ لڑکپن اور جوانی کے قصے سنا رہی تھی۔

"آپ کو شائد معلوم نہیں۔ باؤ ولید نے شادی کی۔ اور اُن کا ایک بیٹا بھی ہے۔ تقریباً تیرہ سال کا۔ خالد۔ "سلمان نے اچانک سدرہ کی کسی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"کیا۔؟ شادی۔؟ بیٹا۔؟ کہاں ہے اُس کا بیٹا۔؟" سدرہ کی آنکھوں میں حیرانی کے ساتھ ساتھ ایک خوشی کی لہر بھی ابھری۔

CamScanner

"امریکہ میں ہے۔ جینی۔ ولید کی بیگم۔ سینی ٹوریم میں۔ اور بیٹا۔ عارف صاحب کے ساتھ پاکستان آرہا ہے۔ سب گاؤں میں اکٹھے ہوں گے۔ آپ کو ہم لینے آئے ہیں۔ کل ہی چلنا ہوگا"

اور پھر سلمان اور تسکین نے سدرہ کو گذشتہ آٹھ برسوں کی کہانی تفصیل سے سنائی۔ اُس رات کوئی نہ سویا۔ اپنے بھائی کے کارنامے سُن کر سدرہ کو بہت خوشی ہوئی۔ جتنا بھی جیا۔ اُسکا بھائی زندگی جیا۔ صرف زندہ نہ رہا۔ زندگی کے ساتھ زندہ رہا۔ اُسے اپنے والدین یاد آئے۔ جو زندہ ہوتے تو کتنے فخر سے یہ ساری باتیں سنتے۔

"ایک دو باتوں کی سمجھ نہیں آئی۔ ویسے تو باؤ ولید کے بارے میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو انہونی ہیں۔ لیکن یہ بات۔ کہ وہ اپنے بیٹے کو امریکہ چھوڑ آئے۔ بیوی کو ہسپتال میں۔ اور آٹھ سال تک امریکہ نہ گئے۔ اور دوسری طرف۔ غیروں کے بچوں۔ بیویوں اور بزرگوں کی زندگیاں سنوارتے اور بناتے رہے۔ آپ تو اپنے بھائی کو جانتی ہیں۔ انہوں نے اپنی بیوی اور اپنے بچے کو اپنے ساتھ کیوں نہ رکھا۔؟"

سوال کے اندر چھپے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے۔ سدرہ ایک جست لگا کر ولید کے بچپن میں پہنچی۔ وہ تو شروع سے ہی ایسا تھا۔ بلا کا ذہین لیکن اپنی مرضی کرنے والا۔ کوئی بات دماغ میں سما گئی۔ تو پوری کئے بغیر چین نہ آیا۔ وہ سلمان کو کیسے سمجھاتی کہ اُس کا یہ بھائی۔ کون تھا۔؟ اُس نے کبھی کسی چیز کو اپنا نا نہ چاہا۔ ہمیشہ دوسروں کو ترجیح دی۔ وہ دوسروں میں زندہ رہتا تھا۔ اُسکی کوئی چیز اپنی نہیں تھی۔ کوئی بھی نہیں۔ خود وہ بھی نہیں۔!

"ہو سکتا ہے کچھ دیر بعد وہ واپس چلا جاتا۔ گاؤں میں تو اُسکا کام پورا ہو چکا تھا"۔ سدرہ نے گول مول جواب دیا۔ اور کھڑکی کے ذریعے سورج کی روشنی اندر آتے دیکھ کو سب کو ناشتہ بنانے کا کہہ کر کچن کی طرف چلی گئی۔ چار گھنٹوں کے بعد کراچی سے سیالکوٹ جانے والی ٹرین نے سفر کا آغاز کرنا تھا۔ اور "باؤ ولید گاؤں" کا ہر شخص منتظر تھا۔ وہ کون معتبر لوگ ہیں جو باؤ ولید کے بھائی بہن ہیں۔ چھو کر دیکھیں گے۔ کہ یہ انسان ہیں یا فرشتے۔ اور سوالوں کا ایک انبار تھا جو گاؤں والوں کے دلوں میں موجود تھا۔ اور اِن تمام سوالوں سے بے نیاز۔ دل و دماغ میں اپنے سب سے عزیز بھائی کی موت کا دکھ لئے۔ سدرہ مہمانوں کے لئے ناشتہ بنانے میں مصروف تھی۔!

ꕥꕥꕥ

◎

جولائی میں گرمی کی شدت گاؤں والوں کے لئے نئی نہیں تھی۔ ایسی کتنی ہی گرمیاں آئیں اور چلی گئیں۔ لیکن اِس مرتبہ یکم جولائی سے تین جولائی تک۔ گاؤں والوں کو گرمی کی ہوش تھی نہ پسینے کی فکر۔ ہر کوئی کسی نہ کسی تیاری میں مصروف تھا۔ قناطیں۔ کرسیاں۔ میزیں۔ کھانے کا انتظام۔ آس پاس کے گاؤں سے آئے ہوئے مہمانوں اور اپنے گاؤں کے لوگوں کو ملا کر تقریباً دو ہزار لوگوں کے لئے بندوبست کیا جا رہا تھا۔ عورتیں۔ مرد۔ بچے۔ بوڑھے۔ سب نے بڑھ چڑھ کے حصہ لیا۔ خوشی خوشی ذمہ داریاں قبول کیں۔ ٹھنڈے شربت اور پانی کا انتظام۔ سموسوں اور پکوڑوں کے سٹالز۔ باؤ ولید کی پسند کے مٹر والے چاولوں کی دیگیں۔ قیمہ دھنیا کی دیگ۔ شامی کباب۔ آلو گوشت۔ تیز پتی والی چائے کا انتظام۔ دعوتِ عام تھی۔ جی بھر کے کھانے کی۔ دو ہزار لوگوں کے ایک دن گذارنے۔ کھانے پینے اور دوسری ضروریات کا بندوبست۔ اِس خوبصورتی سے سارا انتظام ہوا کہ کسی نے اپنے اوپر کسی قسم کا بوجھ محسوس نہ کیا۔ اور تو اور۔ خرچے کو کوئی بات کسی نے سُنی نہ کی۔ اپنے آپ۔ کہیں سے پیسے آجاتے۔ اور کام ہو جاتا۔ شہر سے آئے ہوئے طالبعلموں اور اخباری نمائیندوں کے لئے علیحدہ انتظام کیا گیا تھا۔ شہری ضروریات کو مدنظر رکھ کے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لوگ 3 جولائی کو سویرے ہی پہنچ گئے تھے۔ گاؤں کی فٹ بال گراؤنڈ میں سینکڑوں کرسیوں۔ سینٹر سٹیج۔ اور لوگوں کے اُس جمِ غفیر نے ایک سماں باندھ دیا تھا۔ آج اس کی پہلی برسی تھی۔!

"ایک دن باتیں کرتے ہوئے باؤ ولید نے کہا۔ مجھے ڈالر اور گلاب میں سے چننا پڑے تو مَیں گلاب کو چُنوں گا۔ لیکن۔ ڈالر حاصل کرنے کے بعد۔ مجھے اُن کی یہ بات اب سمجھ میں آئی ہے۔ زندگی کی خوبصورتی کو برتنے کے لئے مناسب مقدار میں پیسے کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ چند برسوں کے ساتھ رہنے اور ہمارے ساتھ دن رات گذارنے کے بعد۔ باؤ ولید نے ہم

CS CamScanner

سب کو بہت کچھ سکھایا۔ آسمان گرا ہے نہ زمین پھٹی ہے۔کوئی بڑی تبدیلی نہیں آئی۔مگر اُن کی وفات کے ایک سال بعد آپ سب کا اتنی بڑی تعداد میں یہاں جمع ہونا۔ولید ہائی سکول کے ساٹھ ہونہار بچے۔اِن میں سے سولہ بچوں کا ملک بھر میں سب سے زیادہ نمبر لیکر پاس ہونا۔ساتھ والے گاؤں کے ایک غریب کسان کے بیٹے ظہیر کا امریکہ میں جا کر پڑھنا۔ ہمارے گاؤں کی معاشرتی زندگی میں ایک انوکھا انقلاب برپا ہونا۔لوگوں کا ایک دوسرے کا خیال کرنا۔ مستقبل کی طرف۔ ایک روشن مستقبل کی طرف۔ایک واضح اشارہ ضرور ہے۔

جہاں تک میرا تعلق ہے۔مَیں نے دو فیصلے کئے ہیں۔ پہلا تو یہ کہ مَیں باؤ ولید کی زندگی پر ایک کتاب لکھوں گا۔ میرے خیال میں اُن کی زندگی کے بے شمار پہلو ایسے ہیں جو ہمارے سامنے ابھی نہیں آئے۔ دعا کیجئے گا کہ مَیں اِس مقصد میں کامیاب ہو جاؤں۔ ایم۔اے کر لیا ہے مَیں نے۔اور۔ دوسرا فیصلہ یہ ہے کہ سکول کے بچوں کی تعداد ساٹھ سے سو ہونے تک۔ مَیں گاؤں میں ہی رہوں گا۔اور بچوں کو ریاضی پڑھاؤں گا۔ میرے ریاضی کا علم اِن بچوں کے کام آ جائے۔ میرے لئے اِس سے زیادہ خوشی کی بات اور کوئی نہیں ہوگی"۔ سلمان نے اپنی بات ختم کی۔اور ماسٹر پیراں وسائے کو اظہارِ خیال کرنے کی دعوت دی۔ دو ٹیلی ویژن کیمرے۔ ریڈیو کے دو مائیک۔ اور اخباری نمائندوں کے قلم اور کاغذ مصروفِ عمل تھے۔ پورے پنڈال کی نظریں ماسٹر پیراں وسائے پر تھیں جو چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے مائیک کی طرف آ رہے تھے۔ ایک متین خاموشی چاروں طرف پھیلی تھی۔یہی متین خاموشی ماسٹر صاحب کے چہرے پر بھی دیکھی جا سکتی تھی۔

"باؤ ولید کی بہن اور دونوں بھائیوں کا شکریہ۔آپ سب لوگوں کا شکریہ۔جو آپ ہماری دعوت پر۔اِس فنکشن میں تشریف لائے۔جو ہمارے محسن۔ہمارے بزرگ۔ ہمارے بیٹے۔ہمارے دوست۔ ہمارے مہربان۔ باؤ ولید صدیقی کے لئے ترتیب دیا گیا ہے۔

بزرگ اِس لئے کہا کہ اُسکی باتیں ہی ایسی تھیں۔کہنہ مشق لہجے میں کہی گئی۔تجربے کی چھانی سے نکلی ہوئی۔ بیٹا اسلئے کہا کہ وہ عمر میں مجھ سے پورے پچیس سال چھوٹا تھا۔ اُسکی داڑھی اور بڑی بڑی باتیں کرنے سے وہ عمر میں بڑا نظر آتا تھا۔اُن کی بہن سے پتہ چلا ہے کہ وہ 12 مئی 1967 میں پیدا ہوئے۔آج زندہ ہوتے تو پورے پینتالیس سال کے ہوتے۔عمر کا ذکر ضروری

CS CamScanner

ہے۔ اِس لئے کہ جس عمر میں باؤ ولید یہاں آئے۔ اُس عمر میں لوگ اپنے جوانی کے خواب پورے کرنے میں لگے ہوتے ہیں"۔ ماسٹر صاحب تھوڑی دیر کے لئے رکے اور اپنے سامنے رکھے پانی کے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولے۔

"مجھے خوشی ہے کہ باؤ ولید نے ہمارا گاؤں چُنا۔ یہ گاؤں اب پہلے جیسا نہیں ہے۔ اس کے لوگ۔ یہاں رہنے والوں کی سوچ۔ ایک بڑی تبدیلی آ چکی ہے۔ اُس کے یہاں رہنے سے لوگوں کی آپس میں نفرت کم ہوئی۔ محبت میں اضافہ ہوا۔ معاف کر دینے کی روائت پیدا ہوئی۔ اور لفظ "بے لوث" کا صحیح معنوں میں پتہ چلا۔ کہ اصل میں اِس کے معنی اور مفہوم کیا ہیں۔ وہ ایک خاص آدمی تھا۔ اُس کا ایک خاص مشن تھا۔ اُسکی ایک خاص سوچ تھی۔ معتبر ہیں وہ ماں باپ جنہوں نے اُسکو جنم دیا۔ پالا۔ اور ہمارے پاس تحفتاً بھیج دیا۔ مَیں پورے گاؤں والوں کی طرف سے باؤ ولید کے گھر والوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ہمارا گاؤں ہماری آئیندہ آنے والی نسلیں ہمیشہ ممنون رہیں گی۔ مریم راجپوت ٹرسٹ سے سکول کو فنڈز ملتے رہیں گے۔ اور۔ بقول باؤ ولید کے۔ خیر کا سلسلہ چلتا رہے گا"۔

ماسٹر صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے سلمان نے حاضرین کو بتایا کہ آج کے فنکشن کے آخری سپیکر عارف صاحب ہیں۔ جو باؤ ولید کے بچپن کے دوست ہیں۔ اور امریکہ کو ھمیشہ ھمیشہ خیر باد کہہ کے اب گاؤں میں رہنے آ گئے ہیں۔

عارف نے مائیک پر جانے سے پہلے مڑ کر اپنی بیوی مِیری کو دیکھا۔ جو اپنے پانچ سالہ بیٹے جنید کو گود میں بٹھائے مسکرا رہی تھی۔ پنڈال میں آخری کرسیوں پر بیٹھی تسکین کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اُس کے دماغ میں طرح طرح کے خیالات آ اور جا رہے تھے۔ ایک ہلچل سی دماغ میں تھی۔ باؤ مر گیا۔ یا باؤ زندہ ہے؟ باؤ کے رہنے سے گاؤں والوں کو روشن مستقبل ملا ہے یا کہ اُسکے مرنے سے سارا گاؤں مر گیا ہے۔ مائیک سے عارف کی آواز آ رہی تھی۔ جو نہائت شستہ اردو میں کسی ماموں حیدر کا ذکر کر رہا تھا۔ اور تسکین نے دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے تھامی۔ شیشے میں حنوط۔ اُس تتلی کی طرف نظریں جما دیں۔ جس کے سارے رنگ۔ برس ہا برس۔ گذرنے کے بعد بھی۔ نہایت شوخ اور گہرے تھے۔!
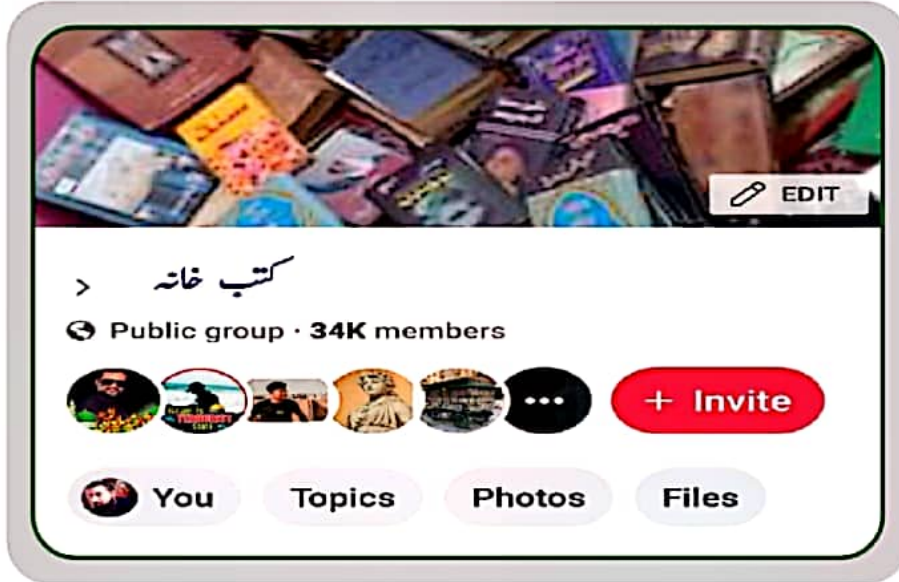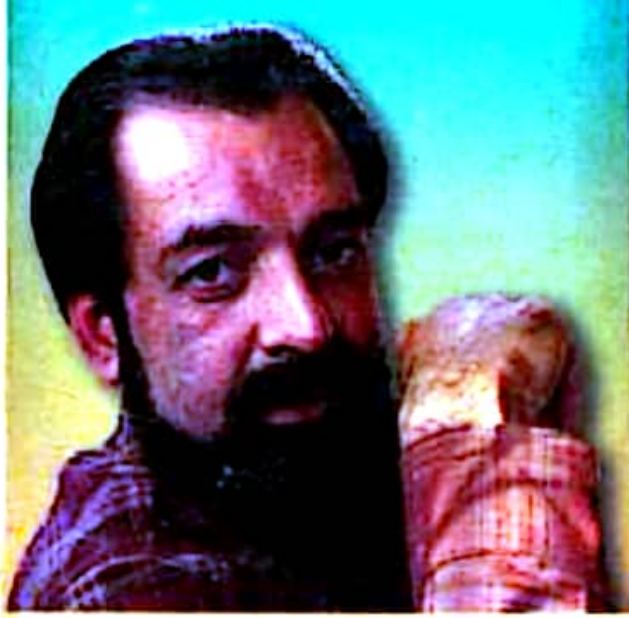
ناول کے میدان میں نجم الثاقب کا یہ پہلا قدم ہے۔ ان کی اس میدان میں آمد کے ساتھ اس کردار کی واپسی ہوتی نظر آ رہی ہے جسے مثالی انسان کہنا چاہیے۔ اس کردار کی نمود ہمارے فکشن کے رومانی دور میں ہوئی تھی۔ مگر اس کردار کا یہ رنگ پوری طرح اُجاگر نہیں ہو پایا تھا۔ رومانی دھند نے اس کے خدوخال کو پوری طرح اُجاگر نہیں ہونے دیا تھا۔ پھر جلد ہی معاشرتی حقیقت نگاری کا دور شروع ہو گیا۔ ترقی پسند افسانے میں تو پھر بھی اس کردار کی تھوڑی جھلک نظر آتی ہے۔ اس افسانے میں آدمی بنیادی طور پر بھلی مخلوق ہے۔ غلط نظام نے اس کے کردار میں برائیوں کو جنم دیا ہے۔ نظام بدل دو پھر آدمی سر سے پیر تک بھلا نظر آئے گا۔ مگر جس حقیقت نگاری نے منٹو کے افسانے کے واسطے سے اپنا رنگ دکھایا اس میں کسی قسم کی رومانیت' کسی رنگ کے آئیڈیلزم کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔

نجم الثاقب کے ناول کے مرکزی کردار میں مثالی انسان پوری طرح جلوہ گر نظر آتا ہے۔ مگر اچھے بُرے لوگوں کے معاشرے میں صرف ایک فرد کا مثالی انسان کا روپ دھار لینا بھی اس کے بارے میں سو طرح کے شکوک کو جنم دیتا ہے اور اسے ایک پُراسرار مخلوق بنا دیتا ہے' کون ہے' کہاں سے آیا ہے' کیا چاہتا ہے' غیب سے نمودار ہوا ہے یا آسمان سے کوئی فرشتہ گنہگار بندوں کے بیچ اُتر آیا ہے۔ مگر ہر ایک کے ساتھ نیکی' ہر ایک کی بہی خواہی اس کی مقبولیت میں اضافہ کرتی چلی جاتی ہے۔ دوسری طرف بدخواہوں سے چھٹکارا بھی نہیں۔ ان کی شیطنت اس فرشتہ صفت انسان کو زیادہ دن تک پنپنے نہیں دے گی۔ مگر اس کی موت بھی پُراسراریت کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ مرنے کے بعد بھی اس کی پُراسراریت برقرار رہتی ہے۔ یہی پُراسراریت اس ناول کی کامیابی کی ضامن ہے۔ سارا بیان اس طرح کا ہے کہ یہ کردار اپنی طرف لوگوں کو کھینچتا بھی ہے مگر اس کا بھید کسی پر نہیں کھلتا۔ آئیڈیلزم کا رنگ اور بھید کی فضا اس ناول میں دلچسپی کا سامان پیدا کرتی ہے۔

"یہاں سے آگے" ناول کے تمام لوازمات کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ۔ یہاں سے آگے کی طرف ایک واضح اشارہ بھی کرتا ہے۔ "کیا ہے" اور "کیا ہونا چاہیے" کی اُلجھی گتھیوں کو سلجھانے کی منزلیں سہولت سے طے کرتا ہوا یہ ناول اُردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔

انتظار حسین

مصنف کی دیگر تصنیفات

- رسیلے خوابوں کی رُت (شاعری) ۱۹۹۲ء
- ہزار خواب ہیں (شاعری) ۲۰۰۶ء
- درد کے جزیرے تک (شاعری) ۲۰۰۰ء
- Tal Vez la Vida (شاعری) ۲۰۱۰ء

Rs. 400.00

www.sang-e-meel.com

ISBN-10 969-35-2402-0
ISBN-13 978-969-35-2402-4
9789693524024
www.sang-e-meel.net